لسانی تناظر

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

مسعود حسین خاں:

''مجی [مرزا خلیل احمد بیگ]، کل اتوار کی فرصت میں آپ کا تازہ تحفہ 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی' پڑھ ڈالا۔ آپ نے یہ مونوگراف حسبِ معمول بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ لکھا ہے، بلکہ ایک طرح سے اسے ریسرچ مونوگراف بنادیا ہے— حوالہ جات اور کتابیات سے بھرپور... آپ نے کیفی مرحوم کی زندگی یا ادبی و علمی خدمات کا کوئی گوشہ تاریک نہیں چھوڑا، خاص طور پر ان کی لسانی اور اردو زبان کے متعلق تحریرات کا بہت متوازن اور جامع جائزہ لیا ہے۔ بعض مقامات پر خود میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ آپ کا طرزِ انشا بہت سے انشا پردازوں سے بہتر پایا۔ مجھے امید ہے آپ کے اس مونوگراف کی علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔''

('لسانی تناظر' ص 210 [ترقیمہ])

شمس الرحمٰن فاروقی:

''امرت رائے کا نظریہ تضادات سے پُر ہے، اور اس کی بنیاد متعصبانہ ظن وتخمین پر ہے، نہ کہ ٹھوس حقائق پر۔ لیکن اردو والوں نے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب تا حال نہیں دیا ہے۔ اس دوران اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا... اہلِ اردو میں صرف مرزا خلیل احمد بیگ نے امرت رائے کا رَد لکھا۔''

('لسانی تناظر' ص 281 [ترقیمہ])

لسانی تناظر

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

(سابق صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

بہ طورِ تحفہ
ریختہ فاؤنڈیشن کی نذر
مرزا خلیل احمد بیگ
۲؍ اپریل ۲۰۲۳ء
(لکھنؤ)

لسانی تناظر

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
(سابق صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

Lisani Tanazur
[Linguistic Perspectives]
by: Professor Mirza Khalil Ahmad Beg

Year of Second Edition 2022
ISBN: 978-93-95400-18-3
Price : ₹ 550/-

نام کتاب : لسانی تناظر
مصنف : پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ (Mb. +91 6387415501)
دوسری اشاعت : ۲۰۲۲ء
قیمت : ۵۵۰ روپے
کمپوزنگ : مہتاب عالم ندوی
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔ ۶

ملنے کے پتے

☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔ Ph.040-66822350
☆ سٹی بک ایجنسی ممبئی۔ M.9820480292
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739
☆ پارکھ بک ڈپو، لکھنؤ۔ M.9389456786
☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔ M.09325203227
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔ M.09419761773
☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر۔ M.09419003490
☆ نعیم بک سیلرز، مئو ناتھ بھنجن۔ M.09450755820
☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔ Ph.040-24521777
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی۔ Ph.09869321477
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔ M.09433050634
☆ راعی بک ڈپو، الٰہ آباد۔ M.07905454042
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر۔ M.094419407522
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں۔ M.09797352280

پاکستان میں ملنے کا پتہ: ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph.0092-42-37247480 37231388

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678286, 23216162, 45678203, 41418204
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

فہرست

زبان اور بولی

رسم الخط اور املا

نقد و نظر

ضمیمہ

دیباچہ

میرے لسانی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ 'لسانی تناظر' پہلی بار 1997ء میں شائع ہوا تھا۔ اب 25 سال بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے جا رہا ہے۔ اس ایڈیشن میں کچھ ترمیمات اور اضافے کیے گئے ہیں۔ بعض مضامین کو ازسرِ نو لکھا گیا ہے، اور بعض نئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کا سیر حاصل 'مقدمہ' از راہِ کرم اردو کے معروف محقق اور ماہرِ لسانیات پروفیسر گیان چند جین نے لکھا تھا اور راقم السطور کو اس علمی کاوش کے لیے بھرپور داد و تحسین سے نوازا تھا۔ طوالت کے خیال سے ان کے پورے 'مقدمہ' کو زیرِ نظر کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ صرف چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ گیان چند جین نے لکھا:

''لسانی تناظر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے لسانیاتی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ علمی دنیا میں بیگ صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ بیگ صاحب کی شخصیت جتنی خوشگوار ہے، وہی کیفیت ان مضامین کی ہے۔ یہ معلومات افروز ہیں، لیکن ان میں تکنیکی تحریر کی یبوست نہیں۔ انھیں کوئی بھی اردو قاری دلچسپی سے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔

''ڈاکٹر خلیل بیگ کا اصرار ہے کہ میں اس مجموعۂ مضامین کا 'مقدمہ' لکھوں۔

قاعدہ ہے کہ مقدمہ یا تعارف اس موضوع کا ماہر لکھتا ہے، ایسا ماہر جس کی
اس موضوعِ خاص میں صاحبِ کتاب سے زیادہ گہری نظر ہو۔ میں لسانیات
کی مبادیات ہی سے واقف ہوں، جب کہ بیگ صاحب اس موضوع کے
استاد ہیں۔ میں نے ہزار معذرت کی، لیکن میرا عذر قبول نہ ہوا۔ ناچار امتثال
امر میں یہ سطور رقم کر رہا ہوں۔

''لسانی تناظر ایک قابلِ قدر مجموعۂ مضامین ہے۔ اس مجموعے کے بھی
مضامین عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ادبیانہ دلچسپی کے بھی امین ہیں۔ کہا جاتا
ہے کہ اسلوب قلم کار کی ذات ہے۔ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ جس طرح
خندہ رو اور خوش گوار بشرے کے مالک ہیں وہی رنگ ان کی نگارشات کا
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہر قاری 'لسانی تناظر' کی سیر کر کے خوش وقت بھی ہوگا
اور مستفید بھی۔''

'لسانی تناظر' کے مضامین جو ہند و پاک کے موقر رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، اپنے اندر تنوع اور ندرت رکھتے ہیں اور اردو زبان کے بعض مسائل کو نئے لسانی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ اردو میں بہت دنوں تک لسانی تحقیق 'فائلالوجی' کے زیرِ اثر رہی جو زبانوں کے مطالعے کا قدیم اور روایتی انداز ہے۔ پھر زبانوں کے ہیئتی اور توضیحی پہلوؤں پر توجہ دی جانے لگی جس سے 'لسانیاتِ جدید' کا آغاز ہوا، اور یہ خالص بیسویں صدی کی دین ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین میں میرا اندازِ فکر جدید لسانیاتی اور توضیحی رہا ہے، نیز ان میں میرا اپنا لسانی نقطۂ نظر بھی واضح ہے۔

مرزا خلیل احمد بیگ
E-mail: mirzakhalil2012@gmail.com

لکھنؤ
18 جون 2022ء

زبان کے سائنسی مطالعے کی ابتدا

'لسانیات' (Linguistics) زبان کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ زبان سے ارباب علم و ادب کی دلچسپی قدیم زمانے سے رہی ہے۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک زبان فلسفیانہ غور وفکر کا ایک اہم جزو تھی۔ یونانی فلسفی افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) زبان کی قواعد کو فلسفے سے مربوط کر کے دیکھتے تھے۔ افلاطون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے 'اسم' (Noun) اور 'فعل' (Verb) میں تمیز پیدا کی۔ اسی طرح ارسطو نے جملے کے جزوِ ثانی یعنی 'خبر' (Predication) کی درجہ بندی کی۔ یونان کے علاوہ قدیم روم کے فلسفیوں نے بھی زبان کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یورپ میں زبان کے مطالعے کی ابتدا گویا انہی فلسفیوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ 'روایتی قواعد' (Traditional Grammar) بھی انہی فلسفیوں کی دین ہے جس نے دنیا بھر کی زبانوں کے لیے ایک 'نمونہ' (Model) فراہم کیا۔

(2)

امریکہ میں زبانوں کے مطالعے کا آغاز 'ماہرین بشریات' (Anthropologists) کی اولین کوششوں کا نتیجہ ہے۔ امریکہ میں 'ریڈ انڈین قوموں' (Red Indians) کے بارے

میں تحقیق اور ان کی تہذیب کے مطالعے کے دوران میں ماہرینِ بشریات کو ریڈ انڈین زبانوں سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ امریکہ میں ریڈ انڈین زبانوں کا کثیر ذخیرہ موجود تھا۔ یہ زندہ زبانیں تھیں جن میں تحریری مواد کا فقدان تھا۔ ساخت اور ہیئت (Structure) کے اعتبار سے بھی یہ زبانیں یورپ کی کلاسیکی زبانوں سے مختلف تھیں، لہٰذا ان کے مطالعے میں کلاسیکی طریق کار اور لسانی مصطلحات کا اطلاق ناممکن تھا، چنانچہ اولین امریکی ماہرینِ لسانیات نے، جن میں بعض ماہرینِ بشریات بھی شامل تھے، اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے زندہ زبانوں کی ہیئت و ساخت کو اپنے مطالعے اور تجزیے کا موضوع بنایا جس سے زبان کے مطالعے کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس مطالعے نے رفتہ رفتہ ایک منضبط شعبۂ علم کی صورت اختیار کر لی جسے 'ہیئتی لسانیات' (Structural Linguistics) کا نام دیا گیا۔ امریکہ میں ہیئتی لسانیات کے آغاز و ارتقا میں فرینز بواز (Franz Boas)، ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir) اور لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یورپ میں بیسویں صدی کے اوائل میں فرڈی نینڈ ڈی سسیور (Ferdinand de Saussure) کے انقلاب آفریں لسانی افکار و تصورات سے لسانیات کی نئی جہتوں کا پتا چلا۔

فرڈی نینڈ ڈی سسیور کے نظریے کی رو سے کسی زبان کے مطالعے کے دو پہلو ہیں: 'یک زمانی' (Synchronic)، اور 'دو زمانی' (Diachronic)۔ زبان کے یک زمانی مطالعے میں 'توضیحی' (Descriptive) انداز اختیار کیا جاتا ہے، یعنی زبان کے کسی ایک عہد (وہ عہدِ ماضی بھی ہو سکتا ہے) کی حالت (جیسی کہ وہ ہے) بیان کر دی جاتی ہے۔ زبانوں کے یک زمانی مطالعے سے توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کا ارتقا عمل میں آیا۔ اس کے علی الرغم کسی زبان کے دو لسانی مطالعے میں اس زبان کے عہد بعہد ارتقا سے بحث کی جاتی ہے اور اس میں رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں (صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی تبدیلیوں) کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ زبانوں کے دو لسانی مطالعے کی بنیاد پر 'تاریخی لسانیات' (Historical Linguistics) کا ارتقا عمل میں آیا۔

(3)

توضیحی لسانیات کو 'ہیئتی لسانیات' (Structural Linguistics) بھی کہتے ہیں۔ یہ بیسویں صدی کے نصفِ اول کی پیداوار ہے۔ توضیحی لسانیات کی پانچ سطحیں (Levels) ہیں: صوتیات، تجز صوتیات، تشکیلیات، نحو اور معنیات۔ بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں 'تخلیقی لسانیات' (Generative Linguistics) کا ارتقا عمل میں آیا جو نوام چومسکی (Noam Chomsky) کی اختراع ہے۔ بیسویں صدی عیسوی سے قبل کی صدی (انیسویں صدی) کلیۃً زبانوں کے تاریخی وتقابلی مطالعات کے لیے وقف تھی۔ تاریخی لسانیات، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، زبانوں کے عہد بہ عہد ارتقا اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بحث کرتی ہے، جب کہ 'تقابلی لسانیات' (Comparative Linguistics) دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے تقابل (Comparison) سے ان کے درمیان پائی جانے والی لسانی مشابہتوں (Linguistic similarities) کا پتا لگاتی ہے اور 'ہم رشتہ زبانوں' (Related languages) کو ایک 'لسانی خاندان' (Language Family) میں رکھتی ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی درجہ بندی (Classification) اسی اصول کے تحت کی گئی ہے۔ دو یا دو سے زیادہ ملتی جلتی زبانوں کے تقابل سے اس امر کا بھی پتا لگایا گیا ہے کہ قدیم الایام میں ان زبانوں کا ارتقا کس زبان سے ہوا جس کے تحریری نمونے دستیاب نہیں ہیں۔ ایسی زبان کو 'پروٹو' (-Proto) کہا گیا جس سے وہ زبان مراد لی گئی جو قدیم زمانے میں رائج رہی ہوگی، لیکن جس کے تحریری نمونے آج دستیاب نہیں ہیں۔ ماہرینِ لسانیات نے 'داخلی باز تعمیر کے طریقِ کار' (Method of Internal Reconstruction) کو بروئے عمل لاتے ہوئے 'پروٹو ہند یورپی زبان' (Proto-Indo-European Language) 'باز تعمیر' (Reconstruct) کر لی ہے۔ اس سے وہ مفروضہ زبان مراد ہے جو یورپ کے بہت بڑے حصے اور ایشیا کے بعض علاقوں کی سیکڑوں ہم رشتہ زبانوں کا ماخذ ہے، مثلاً یونانی، لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، جرمن،

انگریزی، سنسکرت، فارسی، پشتو، اردو، ہندی، پنجابی، وغیرہ۔

(4)

ہر چند کہ لسانیات کو 'سماجی سائنس' (Social Science) تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس کے سائنسی (Scientific) ہونے کا جواز بھی ہے۔ لسانیات کو سائنسی علم کیوں کر کہا جاتا ہے؟ اس لیے کہ یہ 'زبان کی سائنس' (Science of Language) ہے، اور ایک ماہرِ لسانیات (Linguist)، وہ سائنس داں (Scientist) ہے جو زبان کی نوعیت (Nature) اور اس کی کار پردازیوں (Functions) کے ادراک کے لیے سائنسی طریقِ کار کو بروئے عمل لاتا ہے۔ سائنسی طریقِ کار کی چند نمایاں خصوصیات ہیں جن میں سے پانچ کا ذکر یہاں اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے:

(1) سائنسی طریقِ کار کی سب سے اہم خصوصیت اس کی 'معروضیت' (Objectivity) ہے جو 'داخلیت' (Subjectivity) کے بالکل برعکس رویہ ہے۔ داخلی نقطۂ نظر سے چیزوں کو جانچنے اور پرکھنے میں ذاتی پسند و ناپسند اور جانب داری کو بڑا دخل ہوتا ہے جو سائنسی مزاج کے منافی ہے۔ معروضی طریقِ کار اختیار کر کے ہی سچائی اور حقائق کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔

(2) سائنسی طریقِ کار کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مشاہدے (Observation) اور تجربے (Experience) پر مبنی ہے، نہ کہ تخیل (Imagination) اور سنی سنائی باتوں پر۔ سائنسی طریقِ کار کی اس خوبی کو 'تجرباتی' (Empirical) کہا جاتا ہے۔ اس میں محض تھیوری (Theory) سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ 'مواد' (Data) کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

(3) سائنسی طریقِ کار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ 'نقل پذیر' (Replicable) ہوتا ہے، یعنی اگر ایک ہی نوعیت کا تحقیقی کام دو تحقیق کار (Researchers) الگ الگ انجام دیتے ہیں تو دونوں کے نتائج بالکل یکساں ہوں گے۔ اسی طرح اگر ایک کام کو کرنے کے بعد وہی تحقیق کار اسی کام کو بعد میں کچھ عرصے کے بعد پھر سے انجام دیتا ہے تو دونوں بار

کے نتائج یکساں ہوں گے۔ چنانچہ 'نقل پذیری' (Replicability) سائنسی طریقِ کار (Scientific Method) کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

(4) سائنسی طریقِ کار 'تجزیاتی' (Analytical) ہوتا ہے۔ تحقیق کار پہلے مواد اکٹھا کرتا ہے، پھر اسے تجزیہ و تحلیل کے عمل سے گزارتا ہے، اس کے بعد ہی وہ نتائج تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ کسی مواد کا تجزیہ (Analysis) کیے بغیر حقائق تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

(5) سائنسی طریقِ کار کی ایک اور خوبی اس کا منظم اور با قاعدہ (Systematic) ہونا ہے۔ تحقیق کار مواد کی جانچ پرکھ اور تجزیے کے دوران میں ایک نوع کی با قاعدگی اور نظم و ترتیب کو ہر لحظہ ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنسی مطالعے کی طرح لسانیاتی مطالعے کی بنیاد بھی معروضیت، قطعیت، نقل پذیری اور نظم و با قاعدگی کے اصولوں پر مبنی ہے، اور سائنس کی طرح یہ مطالعہ بھی مشاہداتی، تجرباتی، اور تجزیاتی طریقِ کار کا حامل ہے۔ انھی خصوصیات نے لسانیات کو سائنسی نقطۂ نظر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ علم آج 'زبان کی سائنس' (Science of Language) اور 'لسانیاتی سائنس' (Linguistic Science) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

(5)

یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ہر شعبۂ علم یا پیشہ ورانہ مضمون کا اپنا 'جارگن' (Jargon)، یعنی مخصوص فرہنگیں اور علمی اصطلاحات (Terminologies) ہوتی ہیں جن کا سمجھنا دوسرے علوم کے ماہرین کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اردو کے حوالے سے زبان کے لسانیاتی مطالعے کے لیے اردو میں وضع کردہ لسانیاتی اصطلاحات سے کام لیا جاتا ہے۔ علمی اعتبار سے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اردو میں لسانیاتی اصطلاحات سازی کا کام بڑے پیمانے پر 1985ء کے آس پاس حکومتِ ہند کے زیرِ انتظام ادارے ترقیِ اردو بیورو (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، نئی دہلی کے تحت شروع ہوا تھا جس کے لیے ایک مجلس

(کمیٹی) کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس کمیٹی کے صدر معروف لسانی محقق اور ماہرِ لسانیات مسعود حسین خاں تھے۔ اس کے اراکین میں گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، عبدالستار دلوی، عبدالغفار شکیل، عبدالعظیم اور خلیق انجم وغیرہ شامل تھے۔ راقم السطور بھی اس کمیٹی کا ایک رکن تھا اور اسی نے مجوزہ اصطلاحات کو حتمی شکل دی تھی اور پریس کاپی تیار کی تھی۔ اس کمیٹی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے انگریزی زبان میں موجود تقریباً 5,000 (پانچ ہزار) لسانیاتی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالا یا منتقل کیا تھا۔ 'فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات (انگریزی-اردو)' کتابی شکل میں ترقیِ اردو بیورو (محکمہ تعلیم، حکومتِ ہند)، نئی دہلی کی جانب سے 1987ء میں شائع ہوئی۔ مسعود حسین خاں (صدر مجلسِ فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات) نے کتاب کے ''تعارف'' میں لکھا:

> ''موجودہ 'فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات' ان قدیم و جدید اہم اصطلاحات پر محیط ہے جن کی لسانیاتی ادب کے مطالعے کے وقت ضرورت پڑتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ قدیم اصطلاحات کے ذخیرے سے بہت زیادہ استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس لیے اراکینِ 'فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات' کو بڑی دیدہ ریزی اور دقتِ نظر کے ساتھ نئے تصورات کے لیے نئی مصطلحات وضع کرنا پڑی ہیں۔ ایسا کرتے وقت روایت کا دامن چھوڑے بغیر جدت اور ندرت سے کام لیا گیا ہے۔ مجلس نے اپنی وضع کردہ اصطلاحات پر بار بار نظر ڈالی ہے اور وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ کے ان تمام آداب کو ملحوظ رکھا ہے جو اردو کو ورثہ میں ملے ہیں۔''

●●●

زبان اور قواعد

ہر زندہ زبان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے بارے میں غور و خوض بھی ہوتا رہے جس کی ایک واضح شکل قواعد (Grammar) ہے اور قواعد، کسی زبان کا ایک اتنا اہم پہلو ہے کہ اس سے کسی بھی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اردو قواعد نویسی کا طرز اب تک 'روایتی' (Traditional) رہا ہے جس میں کئی خامیاں موجود ہیں، مثلاً یہ قواعد صرف معیاری زبان ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہے۔ بول چال کی زبان روایتی قواعد نویسی کے دائرے میں نہیں آتی۔ روایتی قواعد نویسی میں، معیاری زبان کے مطالعے کی بنیاد پر جو اصول وضع کیے جاتے ہیں، ان پر اصرار بھی کیا جاتا ہے۔ روایتی قواعد نویس اس بات پر زور دیتا ہے کہ لوگوں کو کیسے بولنا چاہیے (How people ought to speak)، نہ کہ لوگ کیسے بولتے ہیں (How people speak)۔ روایتی قواعد نویس یہ حکم لگاتا ہے کہ زبان کا فلاں استعمال قواعد کے خلاف ہے، اور فلاں استعمال نہیں۔ روایتی قواعد کا مقصد معیارِ صحت قائم کرنا ہوتا ہے، 'بیانِ واقعہ' نہیں۔ زبان کے بولنے اور لکھنے کے قوانین کو 'ہدایتی' (Prescriptive) اور 'امتناعی' (Proscriptive) قواعد بھی کہا جاتا ہے۔ روایتی قواعد اصل اور مروج زبان کے مزاج سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یونانی (Greek) اور لاطینی (Latin) جیسی قدیم کلاسیکی زبانوں کی قواعد کے نمونوں کی بنیاد پر اپنے اصول وضع کرتی ہے۔

روایتی قواعد میں اجزائے کلام (Parts of Speech) کی تعریف معنی کی

بنیادوں پر کی جاتی ہے اور ان کے ہیئتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف توضیحی قواعد (Descriptive Grammar) میں زبان کی ساخت اور اس کی ہیئت (Structure) کے تجزیے سے قواعد کے اصول وضع یا مرتب کیے جاتے ہیں، اور چوں کہ ہر زبان کی ساخت و ہیئت، نیز مزاج جداگانہ ہوتا ہے، لہٰذا زبان کی قواعد کے اصول بھی مختلف ہوتے ہیں۔ توضیحی قواعد میں کسی زبان کو قدیم کلاسیکی زبانوں کے نمونوں پر نہیں ڈھالا جاتا۔ توضیحی قواعد میں چوں کہ سارا زور زبان کی ہیئت کی توضیح (Description) پر صرف ہوتا ہے، اس لیے اجزائے کلام کی معنوی تعریفوں سے احتراز کیا جاتا ہے۔

توضیحی قواعد معیاری زبان کی بھی ترتیب دی جاسکتی ہے اور بول چال کی زبان یا کسی مخصوص 'بولی' (Dialect) کی بھی۔ قواعد کے نقطۂ نظر سے ایک غیر معیاری زبان یا بولی بھی اتنی ہی پیچیدہ ہوسکتی ہے جتنی کہ معیاری زبان۔ توضیحی قواعد نہ تو ہدایتی ہوتی ہے اور نہ امتناعی، بلکہ اس کا بنیادی مقصد زبان کی توضیح بیان کرنا ہوتا ہے، یعنی زبان جیسی ہے ویسی ہی بیان کر دینا۔ توضیح کے ذریعے سے ہی اس کے قواعد کے اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ توضیحی قواعد کا کام صرف 'بیانِ واقعہ' ہوتا ہے، یعنی یہ قواعد صرف یہ دیکھتی ہے کہ لوگ کیسے بولتے ہیں، نہ کہ لوگوں کو کیسے بولنا چاہیے۔ توضیحی قواعد کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اجزائے کلام کی ہیئتی تقسیم پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے معنوی امتیازات اور معنوی تقسیم سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ توضیحی قواعد زبان کے اصول دریافت کرتی ہے، روایتی قواعد کی طرح قوانین نہیں بناتی۔ توضیحی قواعد جدید اور سائنٹفک ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مکتوبی زبان کو نظر انداز کر کے تکلمی یا تقریری زبان کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہے کہ اصل زبان بول چال ہی کی زبان ہوتی ہے۔ تحریر تو تکلمی زبان کی محض ترجمان ہوتی ہے۔

بیسویں صدی میں توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کے آغاز کے بعد سے بیشمار توضیحی قواعدیں لکھی گئیں۔ لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) نے جب ہیئتی لسانیات پر اپنی شہرۂ آفاق کتاب *Language* نیویارک سے 1933ء میں شائع کی تو اس کے بعد سے ہیئتی قواعد (Structural Grammar) لکھنے کا رواج عام

ہوگیا جو توضیحی قواعد ہی کا دوسرا نام ہے۔ سنہ 1957ء میں امریکی ماہرِ لسانیات نوام چومسکی (Noam Chomsky) نے ہیئتی قواعد کے ردِّ عمل کے طور پر 'تبادلی قواعد' (Transformational Grammar) ایجاد کی جس کی دوسری شکل 'تبادلی تخلیقی قواعد' (Transformational Generative Grammar) ہے۔ جیسے جیسے زبان کے مطالعے کے مختلف دبستان قائم ہوتے گئے، مختلف نوع کی قواعدیں بھی معرضِ وجود میں آتی گئیں۔ مثلاً چارلز فلمور (Charles Filmore) کی 'حالتی قواعد' (Case Grammar)، ایم۔اے۔کے ہیلیڈے (M.A.K. Halliday) کی تفاعلی قواعد (Interactional Grammar)، سڈنی لیمب (Sydney Lamb) کی 'پرت بند قواعد' (Stratificational Grammar) اور کے۔ایل۔ پائک (K.L.Pike) کی Tagmemics چند ایسی قواعدیں ہیں جو بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں یورپ اور امریکہ میں لکھی گئیں۔

(2)

لسانیاتی ادب میں کسی جزوِ کلام (Part of Speech) کی دو طرح سے تعریف بیان کی جاسکتی ہے:

1- معنوی تعریف (Semantic Definition)
2- ہیئتی تعریف (Structural Definition)

معنوی تعریف کا تعلق 'روایتی قواعد' (Traditional Grammar) سے ہے، جب کہ ہیئتی تعریف توضیحی قواعد (Descriptive Grammar) کے ذیل میں آتی ہے۔ معنوی تعریف کا تعلق الفاظ کے معنیاتی پہلوؤں سے ہوتا ہے، اور ہیئتی تعریف جزوِ کلام کی ہیئت کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ ان دونوں تعریفوں کے درمیان فرق کو ذیل کی مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے:

اگر ہم اسم کی معنوی تعریف کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ اسم کسی شخص، جگہ یا چیز کا نام

ہے۔ روایتی قواعد میں اسم کی تعریف اسی طرح بیان کی جاتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں تعمیمات (Generalization) سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً اسم کی مذکورہ تعریف کسی بھی زبان کے اسم کی تعریف ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اس قواعد میں جو زمرات (Categories) قائم کیے جاتے ہیں ان کا اطلاق دنیا کی دیگر زبانوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اسے کلیاتی قواعد (Universal Grammar) بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے علی الرغم توضیحی قواعد صرف اُس زبان کی ساخت، ہیئت اور مزاج کو مقدم رکھتی ہے جس کے لیے یہ لکھی گئی ہے، مثلاً اجزائے کلام میں اسم کی تعریف اردو میں یہ ہو سکتی ہے: اسم وہ لفظ ہے جس کی جمع ''ے'' (مثلاً لڑکے)، ''وں'' (مثلاً عورتوں)، ''یں'' (مثلاً کتابیں) کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسم کی اس ہیئتی تعریف کا اطلاق صرف اردو زبان کے اسما ہی پر ہو سکتا ہے، انگریزی اسم کی تعریف اس تعریف سے کلیتہً مختلف ہوگی۔

یہاں اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ عام طور پر زبان اور قواعد کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر دیا جاتا ہے اور غلطی سے قواعد کو زبان اور زبان کو قواعد سمجھ لیا جاتا ہے۔ زبان کا جاننا (Knowing a language)، اور زبان کے بارے میں جاننا (Knowing about a language) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زبان کا جاننا لسانی مہارتوں (Language skills) کی مشق و مہارت کا دوسرا نام ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ فلاں زبان جانتا ہے تو اس سے ہم یہ مراد لے سکتے ہیں کہ وہ اس زبان کی لسانی مہارتوں پر قدرت رکھتا ہے، یعنی اس نے اس زبان میں سننے (سمجھنے)، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مشق بہم پہنچائی ہے۔ اس کے برخلاف 'زبان کے بارے میں جاننا' سے مراد زبان کی قواعد سے شعوری واقفیت ہے جو کسی زبان کو جانے یا سیکھے بغیر بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص کوئی زبان جانتا ہے تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس زبان کے بارے میں بھی جانتا ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبان جاننے کے لیے زبان کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بھی انسانی معاشرے میں پائی جاتی ہے جو کئی کئی زبانیں جانتے ہیں، لیکن ان زبانوں کے بارے میں کوئی شعوری واقفیت نہیں رکھتے۔ خود اہلِ زبان (Native speakers) جو اپنی زبان کو

شب و روز بولتے اور سمجھتے رہتے ہیں، اس زبان کے اصول و قواعد سے شعوری واقفیت نہیں رکھتے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زبان کا جاننا اور بات ہے، اور زبان کے بارے میں جاننا، یعنی اس زبان کے اصول و قواعد سے شعوری واقفیت رکھنا اور بات۔ ہر اہلِ زبان اپنی مادری زبان پر پوری قدرت رکھتا ہے، لیکن کتنے اہلِ زبان ایسے ہیں جو اپنی مادری زبان کی قواعد سے بھی شعوری واقفیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا مادری زبان یا پہلی زبان کے اکتساب کے لیے اس زبان کی قواعد کا شعوری طور پر سیکھنا اور ان اصولوں کو جاننا جن کے تحت اس زبان کے جملوں کی تعمیر و تشکیل عمل میں آتی ہے، چنداں ضروری نہیں۔ دو سال کا ایک بچہ اپنی مادری زبان فطری طور پر سیکھتا ہے۔ اس عمل کے دوران میں اسے اپنی مادری زبان کی قواعد کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قواعد یں کن لوگوں کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ قواعد یں ان لوگوں کے لیے لکھی جاتی ہیں جو کسی زبان کو ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں، لیکن بعض حالات میں ثانوی زبان بھی بغیر قواعد کے سیکھی جا سکتی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کسی دوسری زبان کے بولنے والوں کے ساتھ ایک خاص مدت تک رہتا ہے تو باہمی میل جول کی وجہ سے اُس زبان میں اسے اہلِ زبان جیسی مہارت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے اُس زبان کے اصول و قواعد کا شعوری علم چنداں ضروری نہیں۔ لیکن ایسے لوگ کم ہیں جو ثانوی زبان کو دوسرے لسانی طبقے کے ساتھ رہ کر اور سماجی میل جول کے نتیجے میں سیکھتے ہیں۔ عام طور پر ثانوی یا غیر ملکی زبان رسمی طور پر (Formally) اور شعوری کوششوں ہی کے نتیجے میں سیکھی جاتی ہے۔

ثانوی زبان کی تحصیل کا مروج طریقہ اس زبان کی رسمی تدریس (Formal teaching) ہوتی ہے جس میں قواعد کا اہم رول ہوتا ہے۔ ایسی قواعد کو 'اسکول گرامر' (School Grammar) کا نام دیا گیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قواعد کی ضرورت و افادیت غیر مادری زبان سیکھنے والوں کے لیے بہت اہم ہے۔ مولوی عبدالحق اپنی 'قواعدِ اردو' (1914ء) کے ''مقدمہ'' میں لکھتے ہیں:

''ابتدا میں گریمر کی ضرورت اس وقت واقع ہوئی جب کہ ایک زبان والوں

نے دوسری زبان کے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اول اول خود اہلِ زبان کو
کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔''

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور میں جب اہلِ یورپ کو اردو زبان سیکھنے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق مختلف یورپی زبانوں میں اردو کی قواعدیں ترتیب دیں، چنانچہ مولوی عبدالحق مزید لکھتے ہیں:

''صرف ونحو کی ابتدایا اس کے متعلق جدوجہد ہمیشہ غیر قوم والوں کی طرف سے ہوئی، کیوں کہ اہلِ زبان اس سے مستغنی ہوتے ہیں۔ یہی حال اردو زبان کا ہوا۔ اس کی صرف ونحو اور لغت کی طرف اوّل اوّل اہلِ یورپ نے بہ ضرورت توجہ کی۔''

اہلِ زبان کے لیے اپنی زبان کی قواعد سے شعوری واقفیت ضروری تو نہیں، لیکن اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قواعد کی واقفیت سے اہلِ زبان کو اپنی زبان کے لسانی مزاج کا شعور پیدا ہوتا ہے، نیز اس کی قدروں، وسعتوں اور پیچیدگیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ زندہ زبانوں میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ صوتی، صرفی، اور نحوی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ زبان کی قواعد ان تمام چیزوں کو آئندہ کے لیے محفوظ کرلیتی ہے جو اس زبان کے مختلف ادوار کے تقابلی مطالعے میں کام آتی ہیں، نیز لسانی تبدیلی کے رخ کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

زندہ زبانوں میں مقامی اختلافات کا پایا جانا لازمی ہے۔ زبان کو انتشار سے بچانے کے لیے اس کی معیار بندی (Standardization) ضروری ہوتی ہے۔ کسی زبان کی قواعد اس زبان کی معیاری شکل کو رائج کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی زبان کے پس منظر میں کام آنے والے اصولوں کا شعوری علم خود اہلِ زبان کے لیے اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے اور اس زبان میں اظہار کی پیچیدگیوں سے بچ کر صراحت اور نفاست پیدا کرنے کی سمت میں ایک بڑا قدم ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اپنی زبان کی قواعد کا شعوری علم دوسری زبان کے اصول وقواعد سے واقفیت میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہل زبان کے لیے کس قسم کی قواعد ہونی چاہیے، اور غیر زبان والوں کے لیے کیسی قواعد ترتیب دی جانی چاہیے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اہل زبان کو اپنی زبان سیکھنے کے لیے کسی قواعد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انھیں قواعد کی ضرورت اپنی زبان کے مزاج سے واقفیت اور اس کی ہیئت و ساخت کا شعوری علم حاصل کرنے کے لیے پیش آ سکتی ہے، لہٰذا اہلِ زبان کے لیے جو قواعد لکھی جائے گی اس کا انداز غیر زبان دانوں کے لیے لکھی جانے والی قواعد سے مختلف ہوگا۔ اہلِ زبان کے لیے لکھی جانے والی سب سے بہترین قواعد توضیحی قواعد ہی ہو سکتی ہے جو روایتی قواعد سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ نہ ہدایتی ہوتی ہے، اور نہ امتناعی بلکہ 'بیانِ واقعہ' پر مبنی ہوتی ہے، اور زبان کی ہیئت کو جیسا کہ وہ دیکھتی ہے، بیان کر دیتی ہے۔ غیر زبانوں والوں کے لیے اور غیر زبان کی تدریس کے نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی قواعدوں میں تقابلی قواعد (Comparative Grammar)، تخالفی قواعد (Contrastive Grammar) اور دو زبانی قواعد (Bilingual Grammar) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان قواعدوں میں مادری اور ثانوی زبانوں کے مشترک اور غیر مشترک عناصر کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے اور ان لسانی عناصر کی نشاندہی کی جاتی ہے جو تحصیلِ زبان میں دشواری پیدا کرتے ہیں اور جن پر زبان سیکھنے والوں کو خصوصی توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

ابتدا میں اہلِ یورپ نے غیر مادری زبان بولنے والوں کے لیے اردو قواعدیں لکھیں جو روایتی طرز کی تھیں، پھر اہلِ زبان نے قواعدیں لکھیں، لیکن یہ بھی روایتی طرز کی تھیں اور درسی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی تھیں جو مکتبی قواعد یا 'اسکول گرامر' کے زمرے میں آتی ہیں۔ اردو میں تقابلی، تخالفی یا دو زبانی قواعد نویسی کا رواج بہت کم ہے۔ توضیحی قواعد بھی اردو میں تقریباً ناپید ہے۔ اسی لیے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اردو قواعد نویسی جتنی پرانی ہے، اتنی ہی پیچھے ہے۔

(3)

جدید لسانیات (Modern Linguistics) نے زبان کے مطالعے کو ایک نئی سمت اور جہت دی ہے۔ جدید لسانیات زبانوں کے تاریخی مطالعے کے علی الرغم، زبانوں کے توضیحی مطالعے سے عبارت ہے، جس میں کسی زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل سے صرفِ نظر کر کے محض اس کی ساخت یا ہیئت کو (جیسی کہ وہ کسی ایک وقت میں پائی جاتی ہے)، مطالعے اور تجزیے کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے اسے ساختی یا ہیئتی لسانیات کہتے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوران میں زبان کی ساخت کے حوالے سے کئی مطالعات پیش کیے گئے اور قواعدیں بھی لکھی گئیں جن میں امریکی ماہرِ لسانیات بلوم فیلڈ کے ساختی مطالعے کو جو اس نے اپنی کتاب *Language* (1933) میں پیش کیا، بنیادی اہمیت حاصل ہوئی۔

کسی زبان کے ساختی مطالعے میں اس زبان کی صرف ساخت یا ہیئت کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور 'معنی' (Meaning) سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے، چنانچہ بلوم فیلڈ نے بھی ایسا ہی کیا کہ اپنے مطالعے میں صرف زبان کی ساخت سے بحث کی اور معنی کو نظر انداز کر دیا۔ بلوم فیلڈ کی کتاب *Language* کی اشاعت کے ٹھیک چوبیس سال بعد جب امریکہ ہی کے ایک دوسرے ماہرِ لسانیات نوام چومسکی نے 1957ء میں *Syntactic Structures* کے نام سے 'تبادلی قواعد' (Transformational Grammar) مرتب کی تو وہ ساخت کے ساتھ ساتھ 'معنی' کو بھی زیرِ بحث لایا۔ اس کی یہ قواعد درحقیقت بلوم فیلڈ کی 'ہیئت پرستی' کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی۔ چومسکی کے مطابق کسی زبان کی دو سطحیں ہوتی ہیں: بالائی سطح (Surface Structure) اور اندرونی سطح (Deep Structure)۔ ساختی قواعد صرف بالائی سطح کی بات کرتی ہے، اور اس لحاظ سے 'بالا سطحی قواعد' کہی جا سکتی ہے۔ چومسکی کی تبادلی قواعد سے تحریک پا کر عصمت جاوید نے 'نئی اردو قواعد' مرتب کی جو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے 1981ء میں شائع ہوئی۔

●●●
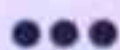
جدید صوتیات اور علمِ تجوید

1- وجہِ اشتراک

علمِ تجوید کا لسانیات کی ایک شاخ صوتیات (Phonetics) سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ صوتیات ایک جدید علم ہے جس میں تکلمی آوازوں کا مطالعہ و تجزیہ سائنسی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ اس علم میں اعضائے تکلم (Organs of Speech) اور ان کے ذریعے سے تشکیل شدہ آوازوں سے بحث کی جاتی ہے، نیز ان کی درجہ بندی بھی کی جاتی ہے۔ تجوید میں قرآنِ کریم کے صوتیاتی نظام کو مطالعے کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے اُسے 'قرآنی صوتیات' (Quranic Phonetics) بھی کہتے ہیں۔

قرآن کے صوتیاتی نظام میں 28 حروف شامل ہیں جنھیں ابجد ھوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ کی ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے۔ ان تمام حروف کو صوتی اعتبار سے اپنے مخرج سے مع جمیع صفات کے ادا کرنا 'تجوید' کہلاتا ہے۔ علماء کے نزدیک تجوید ایک ایسے علم کا نام ہے جس کی رعایت سے قرآنِ کریم موافقِ نزول پڑھا جا سکے کہ قرآنِ کریم تجوید ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ قرآن کو بلا رعایتِ تجوید پڑھنا ایک قسم کی تحریف ہے جو جائز نہیں۔

پڑھنے سے یہاں مراد محض تحریری شکلوں کی شناخت نہیں، بلکہ ان کی تکلمی ادائیگی سے ہے، اور حروف کی تکلمی ادائیگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اعضائے تکلم کو حرکت

نہ دی جائے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو تجوید کا میدان وہی قرار پاتا ہے جو صوتیات کا میدان ہے۔ فرق محض اتنا ہے کہ تجوید میں صرف قرآنی اصوات کی تشکیل، ادائیگی، صفات اور ان کے مخارج و منابع سے بحث کی جاتی ہے اور صوتیات میں دنیا میں کسی بھی زبان کی اصوات کی تشکیل، ادائیگی، درجہ بندی اور امتیاز و خصوصیات کو مطالعے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ تجوید اور صوتیات کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ قواعدِ تجوید کا ماہر تجوید کے رموز سے 'نظری' واقفیت رکھنے کے علاوہ قرآنی اصوات کی اپنے مخرج سے جمیع صفات کے ساتھ 'عملی' ادائیگی پر بھی قدرت رکھتا ہے، جب کہ ایک ماہرِ صوتیات دنیا کی کسی بھی زبان میں کام آنے والی اصوات کا سائنسی بنیادوں پر محض مطالعہ و تجزیہ کرتا ہے۔ ان آوازوں کی تکلمی ادائیگی پر قدرت رکھنا اس کے لیے چنداں ضروری نہیں۔ جس طرح لسانیات سے کسی زبان (یا زبانوں) کا جاننا مراد نہیں، بلکہ زبان (یا زبانوں) کے بارے میں جاننا مراد ہے، اسی طرح صوتیات میں بھی تکلمی اصوات کے بارے میں سائنسی واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے، نہ کہ ان اصوات کی اعضائے تکلم کے ذریعے عملی ادائیگی پر قدرت۔

قرآنِ کریم کا قواعدِ تجوید کے ساتھ پڑھنا نہایت ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اگر تجوید کے ساتھ قرآنِ کریم نہ پڑھا گیا تو پڑھنے والا خطاوار ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا، یعنی قرآن کو ترتیل سے پڑھو۔ یہاں 'ترتیل' سے دو معنیٰ مراد ہیں: ترتیل کے لغوی معنیٰ ہیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور اصطلاحی معنیٰ ہیں تجوید کے ساتھ پڑھنا، یعنی قرآنِ کریم کے تمام حروف کو اپنے مخرج سے جمیع صفات کے ساتھ ادا کرنا۔ علامہ جزریؒ فرماتے ہیں والاخذ بالتجوید حتم اللازم، یعنی تجوید کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ علامہ جزریؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ من لم یجود القرآن اثم یعنی جو شخص قرآنِ کریم کو تجوید سے نہ پڑھے وہ گنہ گار ہے۔

علم تجوید میں خوش آوازی کو بھی بیحد دخل ہے۔ قرانِ کریم کو خوش آوازی سے پڑھنا امرِ مستحسن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے زَیِّنوا القرآن باصواتکم، یعنی اپنی آوازوں سے قرآن کو زینت دو۔ علماء نے قرانِ کریم کو خوش آوازی سے پڑھنا امرِ زائد

میں شمار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوش آوازی تجوید کے قواعد اور حکم سے خارج ہے۔

قرانِ کریم کے پڑھنے میں لوگوں سے غلطیاں بھی سرزد ہو سکتی ہیں جن کی 'فوائدِ مکیہ' میں دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: (1) لحنِ جلی، اور (2) لحنِ خفی۔

لحنِ جلی وہ غلطیاں ہیں جن میں ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدل دیا جاتا ہے یا کوئی حرف گھٹا دیا جاتا ہے یا حرکات میں غلطی کی جاتی ہے مثلاً ساکن کو متحرک یا متحرک کو ساکن کر دیا جاتا ہے، ایسا کرنے والا گنہ گار ہوتا ہے۔

لحنِ خفی وہ غلطیاں ہیں جن میں ہر حرف مع حرکت کے ثابت رہے، لیکن بعض صفات جو تحسینِ حرف سے تعلق رکھتی ہیں اور غیر ممیّزہ ہیں اگر ادا نہ ہوں تو خوفِ عقاب (جھڑکی) اور تہدید (ہدایت) کا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، صوتیات نسبتہً ایک جدید علم ہے۔ جیسے جیسے لسانیاتِ جدید کا ارتقا ہوتا گیا اس کے ایک اہم شعبے کی حیثیت سے صوتیات کا علم ترقی کرتا گیا۔ جدید لسانیات کی روشنی میں زبانوں کے صوتیاتی مطالعے کی داغ بیل بیسویں صدی میں پڑتی ہے۔ اس دوران میں اس علم نے بیحد ترقی کی ہے اور اب یہ علم سائنسی مطالعات کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کی حدیں طبیعیات اور عضویات (Physiology) سے بھی ملنے لگی ہیں۔ اس کے برخلاف علمِ تجوید اصوات و آیاتِ قرانی کی تکلمی ادائیگی کا ایک قدیم علم ہے۔ جس زمانے میں قدما نے تجوید کے قواعد و ضوابط منضبط کیے تھے اس وقت صوتیات (Phonetics) کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ مغرب کی روشنی کے بغیر آج سے کئی سو سال قبل قدماء نے قواعدِ تجوید سے متعلق جو مشاہدات پیش کیے ہیں وہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے نہایت وقیع اور حیرت انگیز ہیں۔ قدماء نے قرآنی اصوات کی ادائیگی، ان کی درجہ بندی اور خصوصیات و صفات، نیز دیگر پہلوؤں سے متعلق جو مشاہدات پیش کیے ہیں ان میں سے بیشتر آج جدید صوتیات کی روشنی میں صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اگر فرق نظر آتا ہے تو صرف اصطلاحات کا، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ قرآنی صوتیات کا یہ علم مغربی علماء کی نظروں سے تقریباً اوجھل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوتیات پر لکھی ہوئی کتابوں میں قدماء کے مشاہدات کا کہیں کوئی باقاعدہ ذکر یا حوالہ نہیں

پایا جاتا ہے۔ صوتیات کی شکل میں جس علم نے بیسویں صدی میں فروغ پایا اس کی ابتدا تجوید کی شکل میں کئی سو سال پہلے عربوں کے ہاتھوں ہو چکی تھی، لیکن قدماء کے قواعدِ تجوید اور مغربی علماء کے علمِ صوتیات میں فصلِ زمانی کے باوصف علمی اشتراک پایا جاتا ہے، کیوں کہ دونوں کا تعلق تکلمی آوازوں کی ادائیگی کے مطالعے سے ہے۔ تکلمی آوازوں کا مطالعہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کے مخارج اور دیگر صفات کا علم ہو۔ صوتیات اور تجوید دونوں علوم آوازوں کے مخارج، آوازوں کی ادائیگی اور درجہ بندی نیز ان کی صفات سے بحث کرتے ہیں۔ لہٰذا تجوید کا جتنا گہرا رشتہ صوتیات سے ہے، کسی اور علم سے نہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صوتیات نے قدماء کے مشاہدات کو سائنسی بنیاد عطا کی ہے اور تجوید سے متعلق قدماء کی بہت سی باتیں جو محض تاثراتی تھیں، انھیں علمی وقار بخشا ہے۔

صوتیات اور تجوید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صوتیاتی مطالعہ 'صوت' کے تصور پر مبنی ہے، جب کہ تجوید میں 'حرف' کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ صوتیات میں سارے مباحث 'صوت' کے تصور سے پیش کیے جاتے ہیں اور تجوید میں 'حرف' کے حوالے سے گفتگو کی جاتی ہے (ہر چند کہ اس سے مراد صوت ہی ہے) جس کی بنیاد 28 حروف ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ 'فوائدِ مکیہ' میں قرآنی اصوات کے مخارج، ان کی صفات اور درجہ بندی کو ہر جگہ حروف کے مخارج، صفات اور درجہ بندی کا نام دیا گیا ہے۔

2- مخارج کا بیان

تجوید میں مخارج کے بیان کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ جدید صوتیات بھی مخارج سے بحث کرتی ہے۔ اس ضمن میں اعضائے تکلم کا پورا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ان اعضاء کی حرکات سے، یعنی انھیں بروئے عمل لانے سے جو تکلمی اصوات برآمد ہوتی ہیں ان کی سائنسی بنیادوں پر درجہ بندی کی جاتی ہے۔ بین الاقوامی صوتیاتی رسم خط (IPA) میں 12 مخارج کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے پیدا ہونے والی تکلمی آوازیں 'مصمتے' کہلاتی ہیں۔ تجوید میں 'حروف' (یعنی قرآنی اصوات) کے 14 مخارج بیان کیے گئے ہیں۔ صوتیات اور تجوید میں ایک فرق یہ بھی

ہے کہ اول الذکر میں آوازوں کے مخارج کا سلسلہ دونوں ہونٹوں سے شروع کیا جاتا ہے اور حلق کو آخری مخرج قرار دیا جاتا ہے۔ تجوید میں حلق کو پہلا مخرج تسلیم کیا جاتا ہے اور مخارج کا بیان منہ کے اندرونی حصے حلق سے شروع ہو کر بیرونی حصے ہونٹ پر ختم ہوتا ہے۔

تجوید کی رؤ سے حروف (یعنی قرآنی اصوات) کے مخارج 14 ہیں، لیکن بعض علماء کے نزدیک ان مخارج کی تعداد 16 اور بعض کے نزدیک 17 تک پہنچتی ہے۔ پہلا مخرج اقصیٰ حلق تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے تین حروف یعنی آوازیں نکلتی ہیں: ا، ء، ہ۔ یہ تینوں حلقیہ آوازیں ہیں۔ صوتیات میں بھی انھیں حلقیہ یا حلقی (Glottal) تسلیم کیا گیا ہے۔ فراء کے نزدیک ا (الف) اور ء (ہمزہ) کا مخرج ایک ہے۔ اسی لیے ہمزہ کے ساتھ الف کو بھی حلقیہ تسلیم کیا گیا ہے، لیکن بعض علمائے تجوید الف کو حلقیہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ جوفیہ اور ہوائیہ مانتے ہیں۔ صوتی نقطۂ نظر سے اَلِف کی دراصل دو حیثیتیں ہیں، یعنی الف بشکلِ ہمزہ اور الف بشکلِ حرفِ علت (مصوتہ)۔ الف بشکلِ ہمزہ ایک حرف صحیح یعنی مصمتہ (Consonant) ہے اور اس صورت میں اس کا مخرج اقصیٰ حلق بالکل صحیح ہے۔ لیکن الف جب مصوتہ (Vowel) کی صورت اختیار کرتا ہے تو پھر حلقیہ آوازوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں اسے جوفیہ یا ہوائیہ کہنا درست ہے، کیوں کہ اس کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا بغیر کسی رکاوٹ کے منہ سے خارج ہوتی ہے۔ علمائے تجوید کے نزدیک دوسرا مخرج وسطِ حلق ہے جس سے ع، ح نکلتے ہیں۔ تیسرا مخرج ادنیٰ حلق ہے۔ اس سے غ، خ نکلتے ہیں۔ ادنیٰ حلق کو صوتیاتی اصطلاح میں غشا (Velum) کہتے ہیں اور ان آوازوں کو غشائی (Velar) کہتے ہیں۔ علمائے تجوید نے حلق (Glottis) سے لے کر کوّا یعنی لہات (Uvula) تک کے حصے کو حلق مانا ہے اور اس کے تین ٹکڑے کیے گئے ہیں یعنی اقصیٰ حلق، وسطِ حلق اور ادنیٰ حلق۔ صوتیات میں ان اعضاء کو الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا ہے، یعنی اقصیٰ حلق کو حلق (Glottis)، وسطِ حلق کو حلقوم (Pharynx) اور ادنیٰ حلق کو غشا (Velum) کہا جاتا ہے اور ان مخارج سے پیدا ہونے والی آوازیں حلقی (ء ہ)، حلقومی (ع ح) اور غشائی (غ خ) کہلاتی ہیں۔

علمائے تجوید کے نزدیک چوتھا مخرج اقصیٰ لسان اور اوپر کا تالو ہے جس سے ق نکلتا ہے اور پانچواں مخرج ق کے مخرج سے ذرا منہ کی طرف ہٹ کر ہے جس سے ک نکلتا ہے۔ تجوید میں ان دونوں حرفوں (یعنی آوازوں) کو لہویہ کہا گیا ہے۔ لہویہ کو صوتیاتی اصطلاح میں لہاتی کہتے ہیں۔ صوتیاتی اعتبار سے ق بلاشبہ ایک لہویہ یا لہاتی آواز ہے، لیکن ق اور ک دونوں کا مخرج ایک نہیں ہے، ق لہاتی آواز ہے اور ک غشائی (Velar)۔ ق کی تشکیل اس وقت عمل میں آتی ہے جب زبان کی جڑ کو ا یعنی لہات سے مس ہوتی ہے اور پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا وہاں رک جاتی ہے جب کہ ک کی تشکیل اس وقت عمل میں آتی ہے جب زبان کا پچھلا حصہ (یعنی زبان کی جڑ کے آگے کا حصہ) نرم تالو یعنی غشا (Velum) سے جا کر مل جاتا ہے اور پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا وہاں رک جاتی ہے۔ نرم تالو یا غشا کوے سے آگے منہ کا اوپری حصہ ہے۔ علمائے تجوید نے ق اور ک کے مخرج میں فرق کیا ہے لیکن دونوں آوازوں کو لہویہ کہا ہے۔ صوتیات میں بھی دونوں آوازوں کے مخارج میں فرق کیا جاتا ہے، لیکن دونوں کو ایک ہی نام سے یاد کرنے کے بجائے الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا ہے، ق کو لہاتی (Uvular) اور ک کو غشائی (Velar) آواز کہتے ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صوتیاتی اعتبار سے ق کا مخرج یا مقام ادائیگی (یعنی جہاں صوت تشکیل پاتی ہے) وہی ہے جو غ خ کا ہے۔ ان میں فرق صرف طرزِ ادائیگی کا ہے یعنی طرزِ ادائیگی (جس طرح صوت تشکیل پاتی ہے) کے لحاظ سے ق ایک بندشی (Stop) آواز ہے اور غ خ صفیری (Fricative) آوازیں ہیں۔ لیکن مخرج یا مقام ادائیگی (Point of articulation) کے لحاظ سے تینوں آوازیں لہاتی ہیں۔

تجوید کی رو سے چھٹا مخرج وسطِ لسان ہے جس سے ج ش ی نکلتے ہیں۔ صوتیاتی اعتبار سے ج ی حنکی یا تالوئی آوزیں ہیں ان کا مخرج حنک (Palate) یعنی تالو (سخت) ہے۔ یہ منہ کی جانب نرم تالو (غشا) سے آگے کا حصہ ہے۔ حنکی آوازیں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب زبان کے آگے کا حصہ (وسطِ لسان) تالو سے جا کر مل جاتا ہے۔ ج ایک بندشی آواز ہے جس کو ادائیگی میں پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا تالو پر بالکل رک جاتی ہے۔ ی کی ادائیگی

میں تالو اور وسطِ لسان کے درمیان ہلکا سا شگاف قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے ہوا اس مخرج پر پورے طور پر نہیں رکتی، اسی لیے صوتیاتی اصطلاح میں ی کی آواز نیم مصوتہ (Semi-vowel) کہلاتی ہے۔ ش کا مخرج ج ی کے مخرج سے قدرے مختلف ہے۔ ش حنک لثوی (-Palato alveolar) آواز ہے یعنی اس کی ادائیگی تالو کے اگلے حصے اور مسوڑھے کے پچھلے حصے سے ہوتی ہے۔ طرزِ ادائیگی کے لحاظ سے ش ایک صفیری (Fricative) آواز ہے۔

از روئے تجوید ساتواں مخرج حافۂ لسان اور داڑھوں کی جڑ ہے جس سے ض نکلتا ہے۔ آٹھواں مخرج طرفِ لسان اور دانتوں کی جڑ ہے اس سے ل، ن، ر نکلتے ہیں۔ صوتیاتی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو تینوں (ل ن ر) لثوی (Alveolar) آوازیں ہیں۔ ان کا مخرج لثہ، یعنی مسوڑھا (Teeth-ridge) ہے جو اوپری دانتوں اور تالو کے بیچ کا حصہ ہے۔ مسوڑھے میں دانتوں کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ نوکِ زبان کے مسوڑھے سے ملنے سے مذکورہ تینوں آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ بہ اعتبارِ مخرج ل، ن، ر لثوی آوازیں ہیں لیکن طرزِ ادائیگی کے اعتبار سے تینوں آوازیں مختلف ہیں۔ ل ایک پہلوئی (Lateral) آواز ہے۔ اس کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا طرفِ زبان یا زبان کے پہلو سے ہو کر نکلتی ہے۔ ن ایک انفی (Nasal) آواز ہے اس کی ادائیگی میں ہوا منہ کے علاوہ ناک کے راستے سے بھی خارج ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں نرم تالو (Velum) نیچے کو جھک جاتا ہے اور ناک کا راستہ کھل جاتا ہے۔ ر ایک ایسی آواز ہے جس کی ادائیگی میں نوکِ زبان مسوڑھے سے مس ہوتی ہوئی ہوا کی جنبش سے لڑھکنے لگتی ہے۔ اسے تکریری (Rolled) آواز کہتے ہیں۔

قواعدِ تجوید کے لحاظ سے نواں مخرج نوکِ زبان اور ثنایا علیا (اوپر کے دو دانت) کی جڑ ہے اس سے ط، د، ت نکلتے ہیں۔ چوں کہ ان کا مخرج دانت ہیں اس لیے صوتیاتی اصطلاح میں انھیں دندانی (Dental) آوازیں کہتے ہیں۔ ان کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا اوپر کے دانتوں پر نوکِ زبان کی مدد سے روک دی جاتی ہے۔ یہ آوازیں طرزِ ادائیگی کے اعتبار سے بندشی (Stops) کہلاتی ہیں۔

تجوید میں دسواں مخرج نوکِ زبان اور ثنایا علیا (اوپر کے دو دانت) کا کنارہ ہے

جس سے ظ، ذ، ث نکلتے ہیں، اور گیارہواں مخرج نوکِ زبان اور ثنایا سفلی (نیچے کے دو بیچ کے دانت) کا کنارہ مع اتصال ثنایا علیا کے ہے جس سے ص، ز، س نکلتے ہیں۔ صوتیاتی اصطلاح میں بہ اعتبارِ مخرج انھیں دندانی اور لثوی آوازیں کہتے ہیں۔ طرزِ ادائیگی کے لحاظ سے یہ تمام آوازیں صفیری ہیں۔ ث، ذ، ظ کو بین دندانی (Interdental) آوازیں بھی کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ ان کی ادائیگی میں ہوا نوکِ زبان اور اوپری دانتوں کے درمیان سے ہوکر خارج ہوتی ہے۔ ص، ز، س بہ اعتبار طرز ادائیگی لثوی آوازیں ہیں۔

بارہواں مخرج نیچے کا لب اور ثنایا علیا کا کنارہ ہے۔ اس سے ف نکلتا ہے، اسے صوتیاتی اصطلاح میں لب دندانی (Labio-dental) آواز کہتے ہیں کیوں کہ یہ آواز نیچے کے ہونٹ اور اوپر کے دانت سے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ تیرھواں مخرج دونوں لب ہیں اس سے ب م و نکلتے ہیں۔ صوتیاتی اصطلاح میں یہ تینوں آوازیں دولبی (Bi-labial) کہلاتی ہیں کیوں کہ ان کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا دونوں ہونٹوں پر رک جاتی ہے۔ بہ اعتبارِ طرز ادائیگی یہ تینوں الگ الگ آوازیں ہیں۔ ب ایک بندشی (Stop) اور م ایک انفی (Nasal) آواز ہے۔ ب کی ادائیگی میں ہوا منہ کے جوف سے خارج ہوتی ہوئی دونوں ہونٹوں پر مکملاً رک جاتی ہے۔ م کی ادائیگی میں ہوا مُنہ کے علاوہ ناک کے راستے (انفی جوف) سے بھی خارج ہوتی ہوئی دونوں ہونٹوں پر مکملا رک جاتی ہے۔ و ایک نیم مصوتہ (Semi-vowel) ہے۔ اس کی ادائیگی میں ہوا بغیر رگڑ کے جاری رہتی ہے، کیونکہ دونوں ہونٹ ایک دوسرے کے بے حد قریب آ جاتے ہیں۔

قواعدِ تجوید کی رُو سے چودھواں مخرج خیشوم ہے۔ اس سے غنہ نکلتا ہے جس سے مراد نونِ مخفی اور نونِ مدغم بادغام ناقص ہے۔ خیشوم ناک کا بانسہ یا ہڈی ہے جس سے ہوکر ہوا نتھنوں سے خارج ہو جاتی ہے۔ صوتیاتی اصطلاح میں اسے انفی جوف (Nasal Cavity) کہتے ہیں۔ جب ہوا انفی جوف (خیشوم) سے ہوکر گذرتی ہے تو نرم تالو (غشا) جھک جاتا ہے جس سے ناک کا راستہ یا انفی جوف کھل جاتا ہے۔ جب نرم تالو اوپر کو اٹھ جاتا ہے تو انفی جوف بند ہو جاتا ہے اور ہوا ناک کے راستے سے خارج ہونے کے بجائے صرف مُنہ کے راستے سے

خارج ہوتی ہے۔ غنہ کی عربی میں کئی قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم نونِ مخفی یعنی اخفا کا نون ہے مثلاً اَنْفُسَکُمْ یا اَنْتُمْ۔ یہی نون مدغم ہو جاتا ہے جب ی و ن م ل ر یہ چھے حروف ن کے مابعد واقع ہوتے ہیں۔ اگر یہ نون چار حرفوں یعنی ی، و، ن، م میں مدغم ہو جاتا ہے تو ادغامِ ناقص کہا جائے گا اور اگر ل، ر میں مدغم ہوتا ہے تو ادغامِ کامل کہا جائے گا۔ مثلاً مَنْ یَّقُوْلُ میں ادغامِ ناقص ہے اور مِــنْ رَّبِّهِـــمْ میں ادغامِ کامل ہے۔ غنہ کو صوتیاتی اصطلاح میں انفیت (Nasalization) کہتے ہیں۔ مصوتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انفیائے جاسکتے ہیں۔ صوتیات میں خیشوم یا انفی جوف کو الگ سے مخرج تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

قدماء میں مخارج کی تعداد کے سلسلے میں اختلاف رہا ہے۔ امام فراء نے 14 مخارج تسلیم کیے ہیں، لیکن امام سیبویہ کے نزدیک مخارج کی تعداد 16 ہے۔ ایک دوسرے عالمِ تجوید خلیل نے مخارج کی تعداد 17 بتائی ہے۔ خلیل نے ل ن ر کا مخرج جدا جدا رکھا ہے، لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ صوتیاتی نقطۂ نظر سے بہ اعتبارِ مخرج یہ تینوں لثوی (Alveolar) آوازیں ہیں، یعنی ان کا مخرج لثہ (مسوڑھا) ہے۔ لیکن بہ اعتبارِ طرزِ ادائیگی یہ جدا جدا آوازیں ہیں یعنی ل پہلوئی (Lateral)، ن انفی (Nasal) اور ر تکریری (Rolled) ہے۔ خلیل نے ان آوازوں میں غالباً یہی فرق دیکھا ہوگا۔ امام فراء نے ل ن ر کو بہ اعتبارِ مخرج ایک کہا ہے، کیوں کہ یہ تینوں آوازیں لثوی ہیں۔

3- قرآنی اصوات کی صفات

مخارج کے بیان کے علاوہ علمِ تجوید میں حروف (یعنی آوازوں) کی صفات سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ صفات کے بیان میں قدما کا مشاہدہ بہت باریک تھا۔ صفات کے تعین میں وہ مغربی ماہرینِ صوتیات سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ ذیل میں قدما کی بیان کردہ چند صفات پر صوتیاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جاتی ہے:

(1) **جهر اور همس**: قدما کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آج سے کئی سو سال قبل جہر اور ہمس کے فرق کو پہچان لیا تھا۔ انھیں صوتیاتی اصطلاح میں مسموع اور

غیر مسموع آوازیں کہتے ہیں۔ مسموع (Voiced) آوازیں وہ ہیں جن کی ادائیگی میں صوتی لب یا صوتی تانت (Vocal cords) ہلنے لگتے ہیں۔ صوتی لب کی لرزش (Vibration) سے ایک طرح کی گونج (Resonance) پیدا ہوتی ہے۔ صوتی لب میں اگر لرزش نہ ہو تو گونج پیدا نہ ہوگی اور اس حالت میں جو آواز پیدا ہوگی وہ غیر مسموع (Voiceless) کہلائے گی۔ بہ اعتبارِ مخرج /پ/ اور /ب/ دونوں اردو کی 'دولبی' آوازیں ہیں، لیکن /پ/ ایک غیر مسموع آواز اور /ب/ ایک مسموع آواز ہے۔ ان میں معنی کا فرق اسی خصوصیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً پانی اور بانی یا آپ اور آب وغیرہ۔ اسی طرح ت اور د میں ت غیر مسموع اور د مسموع ہے اور ک گ میں ک غیر مسموع اور گ مسموع ہے۔ مسموعیت اور غیر مسموعیت کا مصمتوں کی درجہ بندی سے گہرا تعلق ہے۔ جن تین صوتیاتی خصوصیات کی بنیاد پر مصمتوں (Consonants) کی درجہ بندی کی جاتی ہے ان میں سے یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ علمائے تجوید نے مسموعیت کو جہر سے تعبیر کیا ہے۔ جہر کے معنی شدت اور زور سے پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک شدت سے مراد بلندی اور شدتِ نفس ہے۔ تجوید میں مسموع کے لیے 'مجہورہ' کی اصطلاح عام ہے۔ جہر کی ضد 'ہمس' ہے، یعنی نرمی سے پڑھنا۔ ہمس کے ادا کرتے وقت جریانِ نفس کی وجہ سے آواز میں جو پستی آتی ہے اُسے نرمی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہمس والی وآز کو 'مہموسہ' کہتے ہیں۔ صوتیاتی اصطلاح میں اسے غیر مسموع کہتے ہیں۔ علم تجوید میں دس حروف جن کا مجموعہ فحثہ شخص سکت ہے مہموسہ یعنی غیر مسموع قرار دیے گئے ہیں۔ باقی تمام حروف مجہورہ یعنی مسموع ہیں۔ جدید صوتیاتی نقطۂ نظر سے بھی ف ح ث ہ ش خ ص س ک ت غیر مسموع (مہموسہ) ہیں۔ تجوید میں مسموع (مجہورہ) اور غیر مسموع (مہموسہ) آوازوں کے فرق کو صوت میں شدت اور نرمی کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے تجوید کا یہ مشاہدہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ بلاشبہ مسموع آوازوں میں شدت پیدا ہوتی ہے یعنی وہ Tense ہوتی ہیں۔ ان کی ادائیگی میں اعضائے تکلم میں اعصابی (Muscular) تناؤ کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف غیر مسموع آوازیں نرم (Lax) ہوتی ہیں ان کی ادائیگی میں اعضا پر زیادہ زور نہیں پڑتا۔

(2) شدت اور رِخو: علمائے تجوید نے شدیدہ کے آٹھ حروف بیان کیے ہیں

جن کا مجموعہ اجد قط بکت ہے۔ ان کے سکون کے وقت آواز رک جاتی ہے صوتیاتی اصطلاح میں اسے غیر اخراجی (Unreleased) کہتے ہیں، کیوں کہ یہ آٹھوں آوازیں (الف یہاں بصورتِ ہمزہ ہے اور مصمتہ ہے نہ کہ مصوتہ) بندشی ہیں۔ ان کی ادائیگی کے وقت زیریں تکلمی اعضا اوپر کے اعضا سے اس طرح جا کر مل جاتے ہیں کہ آواز رک جاتی ہے یعنی ہوا کا مکمل اخراج نہیں ہو پاتا، نیز ان کی ادائیگی میں زیریں تکلمی اعضا اوپر کے اعضا سے الگ نہیں رہتے بلکہ ملے رہتے ہیں مثلاً فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَات میں ت حرفِ شدیدہ یعنی غیر اخراجی ہے۔ ت کی ادائیگی کے وقت آواز رک جاتی ہے اور زبان کی نوک اوپری دانتوں کی جڑ سے جا کر مل جاتی ہے اور الگ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں ہوا کا اخراج نہیں ہو پاتا۔ نتیجتاً ت غیر اخراجی خصوصیت کی حامل قرار پاتی ہے۔ مذکورہ آٹھ حروف کے علاوہ پانچ حروف ایسے ہیں جن میں آواز بالکل بند نہیں ہوتی۔ ان حروف کا مجموعہ لن عمر ہے۔ شدیدہ اور متوسط حروف کے علاوہ باقی تمام حروف (جن کی تعداد 16 ہے) رخوہ ہیں یعنی ان کی آواز جاری رہ سکتی ہے۔ یہ 16 حروف (ف وس زش خ غ ح ع ث ذ ظ ض ص ہ ی) صوتیاتی اعتبار سے صفیری آوازیں ہیں۔ ان میں صرف ی نیم مصوتہ ہے۔ ان تمام آوازوں کی ادائیگی میں زیریں اعضا اپنے بالائی اعضا سے مکمل طور پر نہیں ملتے بلکہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں جس کے نتیجے میں زیریں اور بالائی اعضائے تکلم کے درمیان ایک شگاف سا بن جاتا ہے جس سے ہو کر ہوا مسلسل گذرتی رہتی ہے۔ اسی لیے ان آوازوں میں رخو یعنی جاری رہنے کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ قدماء نے اپنے گہرے مشاہدے کی بنا پر ان آوازوں کی اس خصوصیت کو پہچان لیا تھا، مثلاً اَوْ تُخْفُوْہُ میں خ کی ادائیگی میں آواز جاری رہتی ہے لہٰذا اسے 'رخاوت' کہتے ہیں۔ صوتیاتی مطالعے میں رخو کی صفت کو بیحد اہمیت دی گئی ہے اور اسے باقاعدہ طور پر ایک صفتِ ممیزہ (Distinctive Feature) کا درجہ دیا گیا ہے۔ صوتیاتی اصطلاح میں رخو کو جاریہ (Continuant) کہتے ہیں لیکن جاریہ میں ل اور ر کو بھی شامل کیا گیا ہے جب کہ رخو میں ل اور ر شامل نہیں کیوں کہ یہ متوسط ہیں۔ از روئے تجوید متوسط میں پانچ حروف شامل ہیں جن کا مجموعہ لن عمر ہے۔

(3) **استعلاء اور استفلال**: تجوید کی رو سے استعلاء حروف کی وہ صفت ہے

جس میں آوازوں کو ادا کرتے وقت زبان کا اکثر حصہ مُنہ کی چھت کی طرف بلند (High) ہوجاتا ہے۔ یہ سات حروف ہیں جن میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ ان کے مجموعے کو 'خُصَّ ضَغْطٍ قِظْ' کہتے ہیں۔ مصموں کی اس خصوصیت کو صوتیاتی مطالعے میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اسے صوتیاتی اصطلاح میں 'بلند' (High) اور اس کی ضد کو 'پست' (Low) کہتے ہیں۔ استعلاء کی ضد استفال ہے جس میں زبان بلند نہیں ہوتی بلکہ نیچے ہی پڑی رہتی ہے۔ مذکورہ سات حروف کے علاوہ تمام حروف صفتِ استفال سے متصف ہیں۔

(4) اطباق اور انفتاح: اطباق اس صفت کا نام ہے جس میں صوتی ادائیگی کے وقت زبان کا اکثر حصہ تالو سے مل جاتا ہے۔ یہ چار حروف (ص ط ظ ض) اس صفت سے متصف ہیں۔ صوتیاتی اصطلاح میں اسے حنکیانا (Palatalization) کہتے ہیں۔ مثلاً مِنَ الشَّيْطَانِ میں ط کی ادائیگی کے وقت زبان تالو سے لپٹ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف انفتاح وہ صفت ہے جس میں زبان اکثر تالوے سے نہیں ملتی۔ ص ط ظ ض کے سوا تمام حروف میں صفتِ انفتاح پائی جاتی ہے۔ مثلاً بِسْمِ اللهِ میں س کی ادائیگی کے وقت زبان تالوسے نہیں ملتی کہ س صفتِ انفتاح سے متصف ہے۔

(5) قلقلہ: قواعدِ تجوید میں قلقلہ مخرج میں جنبش دینے کو کہتے ہیں۔ یعنی حروف (= آوازوں) کو ہلا دینا۔ جب آواز میں قلقلہ پیدا کیا جاتا ہے تو آواز ہل جاتی ہے۔ قلقلہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ آواز میں زبر، زیر، پیش کی رمق نہیں آنے پاتی ہے۔ جن آوازوں میں قلقلہ دیا جاتا ہے ان کے مجموعے کو قُطْبُ جد کہتے ہیں۔ یہ پانچوں بندشی آوازیں ہیں، جن کی ادائیگی کے وقت منہ کے زیریں اعضاء اوپری اعضاء سے جاکر مل جاتے ہیں اور پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا ان مخارج پر رُک جاتی ہے۔ پھر فوراً ہی دونوں اعضاء ایک دوسرے سے علاحدہ ہوجاتے ہیں۔ دونوں اعضا کی یہی علاحدگی قواعدِ تجوید میں قلقلہ یعنی صفتِ اخراجی کہلاتی ہے۔ مثلاً مِنْ قَبْلِكُمْ / بِالصَّبْرِ / قِبْلَةَ النَّبِيِّ میں ب کی ادائیگی کے وقت جب اوپر کا ہونٹ نیچے کے ہونٹ سے علاحدہ ہوتا ہے تو قلقلہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح عقاب کی ب میں اور شقاق اور مقراض کے ق میں بھی قلقلہ موجود ہے۔

(6) تکرار: تکرار کی صفت میں ر پائی جاتی ہے اس لیے اسے تکریری یا ارتعاشی

(Trill) آواز بھی کہتے ہیں۔ اس کی ادائیگی کے وقت نوکِ زبان میں ارتعاش یا لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی ارتعاشی حالت میں نوکِ زبان مسوڑھے تک پہنچ کر ہوا کو تیزی کے ساتھ روکتی ہے جس سے رکی آواز پیدا ہوتی ہے۔

(7) تفشّی: آواز کا منہ میں (تالو اور زبان کے درمیان) پھیلنا صفتِ تفشّی کہلاتا ہے۔ یہ صفت ش میں پائی جاتی ہے۔ صوتیاتی اعتبار سے ش ایک صفیری آواز ہے۔ اس کی ادائیگی کے دوران ہوا کے نکلنے کا راستہ تنگ ہو جاتا ہے اور زبان کا اگلا حصہ تالو کے قریب (مسوڑھے کے پیچھے) پہنچ کر نالی دار شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب ہوا رگڑ کے ساتھ اس تنگ اور نالی دار راستے سے ہو کر گزرتی ہے تو سسکار آواز پیدا ہوتی ہے جسے صوتیاتی اصطلاح میں سسکاریہ (Sibilants) کہتے ہیں۔

(8) استطالہ: استطالہ سے مراد 'سیدھا پن' ہے جب آواز میں ایک طرح کا سیدھا پن پایا جاتا ہے تو اسے صفتِ استطالہ کہتے ہیں۔ یہ صفت ض میں پائی جاتی ہے۔

(9) صفیرہ: صفیرہ حروف کی وہ صفت ہے جس میں آواز جاری رہتی ہے۔ یہ صفت ص س میں پائی جاتی ہے۔ صوتیاتی اعتبار سے یہ صفیری (Fricative) آوازیں ہیں جن کی ادائیگی میں زبان کا اگلا حصہ مسوڑھے کے اتنے قریب آ جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان ایک پتلا سا شگاف بن جاتا ہے اور پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا اسی تنگ راستے سے ہو کر گذرتی ہے چوں کہ یہ راستہ تنگ ہوتا ہے اس لیے ہوا رگڑ کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ صوتیاتی اصطلاح میں ص س کی اس صفت کو صفت جاریہ (Continuant) کہتے ہیں۔

(10) صفت غُنّہ: صفت غُنّہ حرف کی وہ صفت ہے جس میں آواز ناک میں جاتی ہے۔ ایسی آوازیں دو ہیں، ن اور م۔ صوتیاتی اصطلاح میں ان آوازوں کو انفی (Nasal) آوازیں کہتے ہیں، کیوں کہ ان کی ادائیگی میں نرم تالو (غشا) نیچے جھک جاتا ہے جس کے نتیجے میں انفی جوف کھل جاتا ہے اور ہوا مُنہ کے علاوہ ناک کے راستے سے بھی خارج ہوتی ہے۔ غنّہ مصوتی آوازوں (Vowel sounds) کی بھی خصوصیت ہے۔ ایسی صورت میں اسے انفیت (Nasalization) کہتے ہیں۔ غنّہ جہاں سے نکلتا ہے اسے قواعدِ تجوید میں 'خیشوم'

کا نام دیا گیا ہے اور اسے باقاعدہ ایک مخرج تسلیم کیا گیا ہے۔

اصوات کی جن چار صفات کا ذکر شروع میں آیا ہے انھیں 'صفات متضادّہ' کہتے ہیں کیوں کہ ان میں جہر کی ضد ہمس، رِخو کی ضد شدت، استعلا کی ضد استفال اور اطباق کی ضد انفتاح ہے۔ علمِ تجوید کی رُو سے ہر حرف چار صفتوں کے ساتھ ضرور متصف ہوگا۔ باقی جو چھ صفات ہیں ان کی ضد نہیں ہے، لہٰذا انھیں 'صفاتِ غیر متضادّہ' کہتے ہیں۔ یہ بعض حروف میں پائی جاتی ہیں اور بعض حروف میں نہیں پائی جاتیں۔ صفات خواہ متضادہ ہوں یا غیر متضادہ، ان کی تمام تر بنیاد اصوات کی تکلمی ادائیگی (Articulation) پر قائم ہے۔ یعنی حروف کو جب تک کہ صوتی اعضاء میں حرکت کے ذریعے اصوات میں تبدیل نہ کیا جائے اُس وقت تک ان صفات کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ از روئے تجوید کوئی بھی حرف جب اپنے مخرج سے ادا کیا جاتا ہے تو یہ صفات بھی اس کے ساتھ ادا ہوتی ہیں، بغیر ان صفات کے حروف ادا نہیں ہوتے۔ ہر حرف کے لیے کوئی نہ کوئی صفت اصل اور لازم ضرور ہے۔ اسی لیے انھیں 'صفاتِ لازمہ' کہتے ہیں۔

اگر حروف صفاتِ لازمہ میں مشترک ہوں تو مخرج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے مثلاً ب اور ج دونوں صفاتِ لازمہ کے اعتبار سے مجہور، شدید، مستفل، منفتح، اور مقلقل ہیں، لیکن بہ اعتبارِ مخرج ب اور ج متحد نہیں ہیں۔ ب کا مخرج دونوں لب (تیرھواں مخرج) اور ج کا مخرج وسطِ لسان (چھٹا مخرج) ہے۔ لیکن اگر حروف متحد المخرج ہوں اور صفاتِ لازمہ متضادّہ میں بھی مشترک ہوں تو صفتِ لازمہ غیر متضادہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے، مثلاً ل اور ر بہ اعتبارِ مخرج ایک ہیں۔ ان کا مخرج طرفِ لسان اور دانتوں کی جڑ (آٹھواں مخرج) ہے۔ یہ صفاتِ لازمہ متضادہ میں بھی مشترک ہیں، یعنی دونوں مجہور، متوسط، مستفل اور منفتح ہیں۔ لیکن صفتِ لازمہ غیر متضادہ کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ یعنی ر میں تکریر ہے اور ل میں تکریر کی صفت ناپید ہے۔ صفتِ لازمہ غیر متضادہ کو صفتِ لازمہ منفردہ بھی کہتے ہیں۔ متحد المخرج حروف میں جن صفاتِ لازمہ کی وجہ سے امتیاز پیدا ہوتا ہے انھیں تجوید میں صفاتِ ممیّزہ کہتے ہیں۔

'صفاتِ ممیّزہ' (Distinctive features) ایک جدید صوتیاتی اصطلاح کے

طور پر بھی مستعمل ہے۔ جدید صوتیاتی نظریے میں صفاتِ ممیّزہ کو بیحد اہمیت حاصل ہے۔ یہ صفات ان اقلی عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں جن سے صوتیے (Phoneme) کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ صفاتِ ممیّزہ کی بنیادوں پر ایک صوتیے کو دوسرے صوتیے سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ اس طرح کسی زبان کے صوتیاتی نظام میں ہر صفتِ ممیّزہ ایک اقلی تخالفی یونٹ (Minimal contrastive unit) کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ صوتیاتی نظریہ بیسویں صدی کے نصفِ اول میں دبستانِ پراگ (Prague School) میں پروان چڑھا جس کے روحِ رواں رومن جیکبسن (Roman Jakobson) تھے۔ بعد میں مورس ہالے (Morris Halle) اور نوام چومسکی (Noam Chomsky) کے ہاتھوں اس نظریے کو فروغ حاصل ہوا۔ اس نظریے کے تحت کسی صوتیے (Phoneme) کو صوتیاتی امتیازی خصوصیات (Distinctive features) کا مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔

4- صوتی تسلسل اور ادغام

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، علمِ تجوید سے مراد حروف (= اصوات) کے مخارج اور اُن کی صفات کا جاننا ہے، لیکن چونکہ یہ حروف اپنی جمیع صفات کے ساتھ کبھی تنہا ادا نہیں کیے جاتے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک خاص صوتی تسلسل میں واقع ہوتے ہیں اس لیے صوتیاتی سطح پر وہ ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قواعدِ تجوید میں صوتی تسلسل یا صوتی سیاق سے پیدا ہونے والی خصوصیات کا ذکر بھی تفصیل سے پایا جاتا ہے جن میں سے بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

(1) ل ایک ممیّز آواز یعنی صوتیہ ہے۔ اس کے دو ذیلی صوتیے (Allophones) پائے جاتے ہیں: 1) پُر ل اور 2) باریک ل- ل سے پہلے والے حرف پر اگر زبر یا پیش ہے تو ل پُر پڑھی جائے گی، مثلاً اَللّٰه، وَاللّٰه، رَسُولُ اللّٰه وغیرہ۔ اور اگر ل سے پہلے والے حرف پر زیر ہے تو یہ باریک پڑھی جائے گی، مثلاً لِلّٰهِ۔ تلفظ کے اس فرق کو صوتیاتی اصطلاح میں ذیلی صوتیاتی تغیر (Allophonic variation) کہتے ہیں۔

(2) دوسری اہم خصوصیت جس کا قواعدِ تجوید میں تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے، ادغام (Assimilation) ہے۔ ادغام کو جدید صوتیات میں بھی بیحد اہمیت حاصل ہے۔ زبانوں کے صوتیاتی تجزیے کے وقت ادغام کے بیشتر مسائل سامنے آتے ہیں۔ صوتیاتی نقطۂ نظر سے ادغام کی صورت میں ایک صوت دوسری صوت میں منتقل یا مدغم ہو جاتی ہے۔ تجوید میں ادغام کے معنی ہیں "پہلے حرفِ ساکن کو دوسرے حرفِ متحرک میں ملا کر مشدد پڑھنا"۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو دونوں تعریفوں سے ایک ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے، مثلاً مِنۡ رَّبِّهِمۡ، مِنۡ لَّدُنَّا، قُلۡ رَّبِّي۔ مذکورہ مثالوں میں مِنۡ کا نون علی الترتیب ر اور ل کے ساتھ اور قُلۡ کا لام ر کے ساتھ مدغم ہو جاتا ہے۔ از روئے تجوید ادغام بلاغنہ بھی ہوتا ہے اور بالغنہ بھی، مثلاً مِنۡ رَّبِّهِمۡ میں ن ر، مِنۡ لَّدُنَّا میں ن ل اور قُلۡ رَّبِّي میں ل ر میں ادغام بلاغنہ ہے، لیکن مَنۡ يَّقُوۡلُ اور مِنۡ وَّالٍ میں ن میں ادغام بالغنہ ہے۔

(3) جدید صوتیات میں ایک صوت کی دوسری صوت کے اثر سے تیسری صوت میں تبدیلی کو بھی ادغام کہتے ہیں، لیکن تجوید میں اسے ادغام کی بجائے 'قلب' کہا گیا ہے، مثلاً مِنۡ بَعۡد۔ یہاں مِنۡ کے ن کی م میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی دراصل بَعۡد کی ب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ب ایک دولبی صوت ہے، لہٰذا اس نے ن پر اثر انداز ہو کر ن کو بھی دولبی صوت م میں منتقل کر دیا ہے۔ اس قسم کے ادغام کو صوتیاتی اصطلاح میں 'رجعی ادغام' (Regressive Assimilation) کہتے ہیں۔

علمائے تجوید نے ادغام کی دو خاص قسمیں بیان کی ہیں: 1) ادغامِ مثلین، 2) ادغامِ متجانسین۔ جب حرف مکرر میں ادغام واقع ہوتا ہے تو اسے 'ادغامِ مثلین' کہتے ہیں مثلاً قَدۡ دَّخَلُوۡا (د+د) یا اِذۡ ذَّهَبَ (ذ+ذ)، اور جب ادغام ایسے دو حرفوں (اصوات) میں واقع ہوتا ہے جن کا مخرج ایک ہے تو اُسے 'ادغامِ متجانسین' کہتے ہیں، مثلاً: قُلۡ رَّبِّي (ل+ر) یا قَدۡ تَّبَيَّنَ (د+ت)۔

(4) حرفِ م کے صوتیاتی تغیر سے متعلق بھی علمائے تجوید نے اپنا گہرا مشاہدہ پیش کیا ہے۔ م جب آخرِ لفظ ساکن واقع ہوتی ہے اور اس کے بعد دوسرا لفظ شروع ہوتا ہے تو اس کے

تین صوتی سیاق (Phonetic contexts) پائے جاتے ہیں جنھیں تجوید کی اصطلاح میں ادغام، اخفاء اور اظہار کہتے ہیں۔ آخرِ لفظ ساکن م کے بعد جب دوسری م واقع ہو تو اسے 'ادغام' کہتے ہیں، مثلاً اَمْ مَّنْ (م+م)۔ اسی کو 'ادغام مثلین' بھی کہا گیا ہے۔ ساکن م کے بعد جب ب واقع ہو تو اس صورتِ حال کو 'اخفاء' کہتے ہیں۔ اخفاء میں م غیر اخراجی (Unreleased) ہوتی ہے۔ م کا مخرج دونوں لب ہیں جو م کی ادائیگی کے بعد ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور فوراً ہی بالکل اسی مخرج سے ب ادا ہوتی ہے جو م کی طرح ایک دولبی آواز ہے، مثلاً وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (م+ب)۔ آخرِ لفظ ساکن م کا تیسرا صوتی سیاق وہ ہے جب اس م کے بعد و یا ف واقع ہو۔ اس صورتِ حال کو 'اظہار' کہتے ہیں جس میں م کی صوتی ادائیگی مکمل طور پر عمل میں آتی ہے اور دونوں ہونٹ اخراجی (Releasing) کیفیت سے بھی دوچار ہوتے ہیں، لیکن حرکت کی بو نہیں آنے پاتی، یعنی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ دو آوازوں کے درمیان مختصر مصوتہ 'شوا' (Schwa) آ گیا ہے، مثلاً وَ كَيْدَهُمْ فِىْ تَضْلِيْلٍ (م+ف)۔

مذکورہ صوتی سیاق کے علاوہ قرآنی اصوات کے اور بھی بہت سے مسائل کا ذکر قواعدِ تجوید میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے جس سے قرآنی صوتیات سے متعلق علمائے تجوید کے گہرے مشاہدے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ذیل میں دو جدولیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی جدول میں قرآنی حروف یعنی اصوات کے ازروئے تجوید 14 مخارج کی نشاندہی کی گئی ہے، پھر انھیں جدید صوتیاتی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا ہے۔ ساتھ میں انگریزی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں۔ دوسرے جدول میں 29 قرآنی حروف (بشمولِ ہمزہ) کی 'صفات لازمہ' کو ظاہر کیا گیا ہے۔ صفاتِ لازمہ کے تحت پہلے صفات ممیّزہ بیان کی گئی ہیں، پھر صفات غیر ممیّزہ۔

قرآنی اصوات[1]

	۱	۲	۳	۴	۵	۶
مخارج ازروئے تجوید	اقصیٰ حلق[2]	وسطِ حلق	ادنیٰ حلق	اقصیٰ لسان اور اوپر کا تالو	ق کے مخرج سے ذرا منہ کی طرف ہٹ کر	وسطِ لسان
اصوات (حروف)	ا ء ہ	ع ح	غ خ	ق	ک	ج ش ی
مخارج جدید صوتیاتی نقطۂ نظر سے	حلق Glottal	حلقومی Pharyngeal	غشائی (صفیری) Velar (Fricative)	لہاتی Uvular	غشائی (بندشی) Velar (Stop)	حنکی Palatal

۱ کتب تجوید میں اصوات کو ”حروف“ کہا گیا ہے۔

۲ سیبویہ کے نزدیک ۱۶ مخارج اور خلیل کے نزدیک ۱۷ مخارج ہیں۔ سیبویہ و خلیل نے ل ن ر کے مخارج جدا جدا رکھے ہیں لیکن فراء نے تینوں کا مخرج ایک ہی مانا ہے۔

۳ تجوید کی رو سے پہلا مخرج اقصیٰ حلق ہے جب کہ جدید صوتیات دونوں لب (جن سے دولبی آوازیں ب م وغیرہ نکلتی ہیں) کو پہلا مخرج مانتی ہے۔ تجوید میں حروف (اصوات) کی درجہ بندی گلے کے اندرونی حصے حلق سے شروع ہو کر دونوں لب اور خیشوم پر ختم ہوتی ہے اور جدید صوتیات میں تکلمی آوازوں کی درجہ بندی دونوں لب سے شروع ہو کر حلق پر ختم ہوتی ہے۔

کے مخارج

۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴ ۴؎
حافۂ لسان اور داڑھوں کی جڑ	طرفِ لسان اور دانتوں کی جڑ	نوکِ زبان اور ثنایا علیا کی جڑ	نوکِ زبان اور ثنایا علیا کا کنارہ	نوکِ زبان اور ثنایا سفلی کا کنارہ مع اتصال ثنایا علیا کے	نیچے کا لب اور ثنایا علیا کا کنارہ	دونوں لب	خیشوم (ناک کا بانسہ یا انفی جوف)
ض	ل ن ر	ط د ت	ظ ذ ث	ص ز س	ف	ب م و	غنّہ ۵؎
حنک لثوی	لثوی	لثوی	دندانی	بین دندانی	لب دندانی	دولبی	ـ
Palato-alveolar	Alveolar	Alveolar	Dental	Interdental	Labio-dental	Bilabial	

۴؎ فرار نے الف اور ہمزہ کا مخرج ایک مانا ہے اسی لیے دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا ہے۔

۵؎ جدید صوتیاتی نقطۂ نظر سے "غنّہ" علاحدہ سے کسی مکمل صوت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک صوتیاتی خصوصیت ہے جسے جدید اصطلاح میں انفیت (Nasalization) کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید صوتیات میں خیشوم (انفی جوف) کو مخرج تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ مصوتوں کی ادائگی کے وقت جب ہوا انفی جوف (Nasal Cavity) سے ہو کر گذرتی ہے تو مصوتوں میں انفیت یا غنائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انفی مصمتے مثلاً م ن کی ادائگی میں بھی ہوا انفی جوف سے ہو کر گذرتی ہے۔

قرآنی اصوات کی

			صفاتِ لازمہ[1]		١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨	٩	١٠	١١
			صفاتِ لازمہ از روئے تجوید	صفاتِ لازمہ از روئے صوتیات	ا	ب	ت	ث	ج	ح	خ	د	ذ	ر	ز
صفاتِ متضادہ	١	الف	مجہورہ	مسموع	✓	✓			✓			✓	✓	✓	✓
		ب	مہموسہ	غیر مسموع			✓	✓		✓	✓				
	٢	الف	شدیدہ	فوراخراجی/بندشی	✓	✓	✓		✓			✓			
			متوسط	–										✓	
		ب	رخوہ	جاریہ/صفیری				✓		✓	✓		✓		✓
	٣	الف	استعلاء	بلند							✓				
		ب	استفال	پست	✓	✓	✓	✓	✓	✓		✓	✓	✓	✓
	٤	الف	اطباق	حنکیت											
		ب	انفتاح	غیر حنکیت	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓
صفاتِ غیر متضادہ	٥		قلقلہ	اخراجی		✓			✓			✓			
	٦		تکرار[2]	تکریر										✓	
	٧		تفشی	سسکاری											
	٨		استطالہ	–											
	٩		صفیرہ	جاریہ/صفیری											
	١٠		غنّہ	انفی											

[1] متحد المخرج حرفوں (اصوات) میں جن 'صفاتِ لازمہ' سے امتیاز ہوتا ہے ان کو 'صفاتِ ممیزہ' اور بقیہ صفاتِ لازمہ کو 'صفاتِ غیر ممیزہ' کہتے ہیں۔

صفاتِ لازمہ

	۲۹	۲۸	۲۷	۲۶	۲۵	۲۴	۲۳	۲۲	۲۱	۲۰	۱۹	۱۸	۱۷	۱۶	۱۵	۱۴	۱۳	۱۲
حروف کے مجموعے	ی	ء	ہ	و	ن	م	ل	ک	ق	ف	غ	ع	ظ	ط	ض	ص	ش	س
	✓	✓		✓	✓	✓	✓		✓		✓	✓	✓	✓	✓			
فحثہ شخص سکت			✓					✓		✓						✓	✓	✓
اجد قط بکت								✓	✓					✓				
لن عمر					✓	✓	✓					✓						
	✓	✓	✓	✓						✓	✓		✓		✓	✓	✓	✓
خص ضغط قظ									✓		✓		✓	✓	✓	✓		
	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓		✓		✓					✓	✓
صطظض													✓	✓	✓	✓		
	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓	✓					✓	✓
قُطبُ جدٍ									✓					✓				
																	✓	
															✓			
																✓		✓
					✓	✓												

ٹ ں (رے) میں 'صفتِ تکرار' ضرور پائی جاتی ہے لیکن علمائے تجوید نے خبردار کیا ہے کہ بجائے ایک رے کے کئی رے نہ ہونے پائے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کو ادا کرتے وقت زبان کو لرزش سے بچایا جائے۔

کتابیات

1- ابوالحسن اعظمی، 'قرآنی املا اور رسم الخط (دیوبند: مکتبہ صوت القرآن)۔

2- اشرف علی تھانوی، 'جمال القرآن مع حاشیہ ایضاح' (لاہور: القراء)۔

3- جمشید علی، 'اصول التجوید' (دیوبند: مکتبہ رشیدیہ)۔

4- سید محمد سلیمان دیوبندی، 'میزان التجوید' (لاہور: قرأت اکیڈمی)۔

5- عبدالرحمٰن مکی، 'فوائد مکیہ مع حواشی مرضیہ'۔

6- محمد اظہر حسن، 'احسن التجوید' (کراچی: میر محمد کتب خانہ آرام باغ)۔

7- Khalid Idris, *Tajweed Made Easy* (Lulu.com, 2019).

8- Naveen Essam-Aldeen, *Tajweed Guide to Read Right*, Part 1, (2014):

9- Bertil Malmberg, *Phonetics* (New York : Dover Publications, 1936).

●●●

اردو کا صوتیاتی نظام

زبان کی تعریف اگر ہم مختصر اور سادہ لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ زبان اظہارِ خیال کا ایک موثر ذریعہ اور ترسیلِ معنی کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔ زبان ہی کے وسیلے سے ہم اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ زبان سے لوگوں کی دلچسپی قدیم الایام سے رہی ہے۔ دورِ جدید میں زبانوں کے سائنسی مطالعے کا فروغ ہوا جسے 'لسانیات' (Linguistics) کہتے ہیں۔ اس کی کئی شاخیں ہیں جن میں سے ایک شاخ کا نام 'صوتیات' (Phonetics) ہے۔

1- صوتیات

لسانیات کی پہلی شاخ 'صوتیات' (Phonetics) ہے جو اس کی پہلی سطح بھی ہے۔ اس میں زبان میں کام آنے والی اصوات (آوازوں) کا سائنسی بنیادوں پر مطالعہ و تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس مطالعے میں اصوات کی تشکیل، ان کی ادائیگی و ترسیل، نیز ان کی درجہ بندی سے تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔ صوتیات میں اعضائے تکلم کی ساخت، ان کی حرکات و سکنات اور دائرۂ کار کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں تقریر یا تکلم (Speech) کو اولیت حاصل ہوتی ہے، یعنی اصل زبان وہ تصور کی جاتی ہے جو تقریری یا تکلمی (Spoken) ہوتی ہے اور جسے ہم

اعضائے تکلم کی حرکات وسکنات کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔ 'تحریر' (Writing) یا تحریری زبان تکلمی زبان کی محض نمائندہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ اس کی ترجمان ہوتی ہے، نہ کہ اصل زبان۔ اصل زبان تو وہ تکلمی یا تقریری زبان ہوتی ہے جس کا پورا دارومدار آوازوں کی تشکیل، ان کی ادائیگی اور ترتیب وتنظیم، یعنی 'صوتیاتی نظام' پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے میں اس زبان کے صوتیاتی نظام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جب ہم کسی سے ہم کلام ہوتے ہیں تو اپنے اعضائے تکلم کی حرکات کے ذریعے سے مختلف قسم کی اصوات پیدا کرتے ہیں، پھر ان اصوات کو مختلف انداز سے ترتیب دیتے ہیں جن سے الفاظ کی تشکیل عمل میں آتی ہے، پھر الفاظ سے فقرے اور جملے بنتے ہیں جو ادائے مطلب اور معنی کی ترسیل میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

2- اعضائے تکلم

کسی زبان کے صوتیاتی مطالعے میں اعضائے تکلم یا تکلمی اعضاء (Vocal Organs) سے واقفیت بہت ضروری ہے، یعنی یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ ان اعضاء کی ساخت کیسی ہے، یہ کہاں کہاں واقع ہیں، یہ کس طرح حرکت کرتے ہیں اور انھیں کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے، وغیرہ۔ آوازوں کی تشکیل، ان کی ادائیگی، نیز پورے نظامِ صوت اور تکلمی میکانکیت (Speech Mechanism) سے مکمل واقفیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ہمیں اعضائے تکلم اور ان کے دائرۂ عمل کا صحیح صحیح علم ہو۔

جن اعضاء کو ہم اعضائے تکلم کہتے ہیں ان کا بنیادی مقصد بولنا یا کلام کرنا نہیں، بلکہ کچھ اور ہے۔ ہمیں یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ پھیپھڑوں کا کام خون کی روانی کو آکسیجن پہنچانا اور نظامِ تنفس (Respiratory System) کو برقرار رکھنا ہے۔ دانتوں اور زبان کا کام کھانے کو چبانا اور نگلنا ہے، اور ناک کا کام سانس لینا اور اندر کی ہوا کو باہر اور باہر کی ہوا کو اندر پہنچانا ہے۔ یہ تمام اعضاء اپنے بنیادی کاموں کے علاوہ ثانوی کام کی انجام دہی میں بھی

مصروف رہتے ہیں، یعنی ان سے بولنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

2.1- حلق کے نیچے کے اعضاء

2.1.1- پھیپھڑے

سب سے پہلے ہم 'حلق' (Glottis) کے نیچے کے اعضاء کو لیتے ہیں۔ یہ پھیپھڑوں (Lungs) پر مشتمل ہیں۔ پھیپھڑے دونوں طرف کو پھیلے ہوتے ہیں، لیکن اوپر جا کر 'سانس کی نالی' (Trachea) میں مل جاتے ہیں۔ اصوات کی تشکیل کا دارومدار کلیتہً پھیپھڑوں سے خارج ہونے والی ہوا پر ہوتا ہے۔ جب ہوا پھیپھڑوں سے خارج ہو کر منہ کے راستے سے باہر نکلتی ہے تو اس سے مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

2.1.2- صوتی لب

سانس کی نالی کے اوپر 'حنجرہ' (Larynx) ہوتا ہے جس میں دو 'صوتی تانت' (Vocal Cords) واقع ہوتے ہیں۔ صوتی تانتوں کو 'صوتی لب' (Vocal lips) بھی کہتے ہیں۔ یہ سب سے اہم صوتی عضو ہے۔ دونوں صوتی لب آگے سے پیچھے کی جانب 'افقی' (Horizontal) حالت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ اگرچہ عضلات (Muscles) سے بنے ہوتے ہیں، لیکن ان کے اوپر ایک قسم کی لعابی جھلی چڑھی ہوتی ہے۔ ان کے درمیان سوراخ ہوتا ہے جسے 'حلق' (Glottis) کہتے ہیں۔ دونوں صوتی لب قریب لا کر ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے جا سکتے ہیں، نیز انھیں آہستہ آہستہ کھولا بھی جا سکتا ہے۔ سانس لیتے وقت دونوں صوتی لب ایک دوسرے سے علاحدہ رہتے ہیں اور ان کے درمیان کا سوراخ بالکل کھلا ہوتا ہے جس سے ہو کر ہوا بغیر کسی رگڑ یا رکاوٹ کے گذرتی ہے۔ سانس کے آنے جانے، یعنی تنفس کے دوران میں صوتی لبوں کی یہ عام حالت (Normal Condition) ہوتی ہے، لیکن جب ہم بولتے ہیں تو دونوں صوتی لب ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں اور حلق کا سوراخ کافی تنگ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا (Air-stream) حلق کے تنگ راستے (سوراخ) سے گذرتے وقت دونوں صوتی لبوں میں لرزش (Vibration) پیدا نہیں کرتی ہے تو اس سے جو صوت برآمد ہوگی وہ صوتیاتی اصطلاح

میں 'غیر مسموع' (Voiceless) کہلائے گی، اور اگر اس عمل سے دونوں صوتی لبوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے تو اس سے جو صوت پیدا ہوگی وہ 'مسموع' (Voiced) کہلائے گی۔ مثلاً اردو کی دو آوازوں پ، ب میں پہلی آواز /پ/ ایک غیر مسموع آواز ہے اور /ب/ ایک مسموع آواز۔ اسی طرح ک، گ میں /ک/ غیر مسموع، اور /گ/ مسموع آواز ہے۔ ان صوتی جوڑوں (Pair of sounds) میں جو تخالفی رشتہ (Contrastive relationship) پایا جاتا ہے وہ ان کی مسموعیت اور غیر مسموعیت ہی کی وجہ سے ہے۔

2.2- حلق کے اوپر کے اعضاء

حلق (Glottis) کے اوپر کے تکلمی اعضاء کا مطالعہ تین جوفوں (Cavities) کے حوالے سے کیا جاسکتا ہے جو یہ ہیں:

گلا یا حلقوم (Pharynx)، ناک یا انفی جوف (Nasal Cavity)، اور منہ یا دہنی جوف (Oral Cavity)

2.2.1- گلا یا حلقوم

'حلقوم' جسے 'گلا' بھی کہتے ہیں، 'حلق' کے اوپر واقع ہے۔ یہ ایک نالی دار راستہ ہے جو 'سانس کی نالی' (Trachea)، اور 'غذا کی نالی' (Esophagus) کے ملنے کی جگہ کے اوپر واقع ہے۔ حلقوم کے اوپری حصے سے ایک راستہ ناک کے جوف کی طرف اور دوسرا راستہ منہ کے جوف کی طرف چلا گیا ہے۔ حلقوم کے نچلے حصے میں ایک کرّی دار عضو واقع ہے جسے 'حلق پوش' یا کنٹھ ڈھکن (Epiglottis) کہتے ہیں۔ یہ سانس کی نالی کی حفاظت اس کے ڈھکن کے طور پر کرتا ہے۔ حلقوم سے کئی قسم کی اصوات پیدا کی جاسکتی ہیں، مثلاً عربی کی ح، ع کی آوازوں کا مخرج حلقوم ہی ہے۔

2.2.2 - ناک یا انفی جوف

انفی جوف ایک ہڈی دار راستہ ہے جس میں لعابی جھلی لگی ہوتی ہے۔ یہ غیر متحرک ہے۔ انفی جوف (ناک) کا کام صرف گونج (Resonance) اور نغمگی پیدا کرنا ہے۔ ناک

کے جوف تک رسائی کوّا یا 'لہات' (Uvula) کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ منہ کی چھت سے نرم گوشت کی مانند لٹکتا ہوا ایک عضو ہے۔ جب کوّا اوپر اٹھ جاتا ہے تو ناک کا راستہ بند ہو جاتا ہے، اور جب یہ نیچے آ جاتا ہے تو ناک کا راستہ کھل جاتا ہے اور ہوا بہ آسانی اس میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ انفی مصمتے (Nasal consonants) اور انفی مصوتے (Nasalized vowels) اسی حالت میں تشکیل پاتے ہیں، مثلاً م، ن انفی مصمتے ہیں جو ہوا کے ناک کے راستے سے ہو کر گذرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ نونِ غنہ یا انفی مصوتوں کی تشکیل کے دوران بھی کوّا نیچے آ جاتا ہے جس سے ناک کا راستہ کھل جاتا ہے اور ہوا ناک اور منہ دونوں راستوں سے ہو کر گذرتی ہے۔

2.2.3- منہ یا دہنی جوف

منہ ایک ایسا جوف (Cavity) ہے جس میں زیادہ تر مصمتے (Consonants) اور مصوتے (Vowels) تشکیل پاتے ہیں۔ اردو اصوات کے زیادہ تر مخارج منہ ہی کے جوف میں واقع ہیں۔ منہ کے عقبی حصے میں حلقوم (گلا) واقع ہے جس کے دونوں جانب گال کی اندرونی دیواریں ہیں اور سامنے کی جانب یہ ہونٹوں سے گھرا ہوا ہے۔ منہ کے اوپری حصے کو جو چھت کی طرح ہے، 'تالو' (Palate) کہتے ہیں۔ تالو کے نیچے 'زبان' (Tongue) واقع ہے۔ دہنی جوف میں زبان کی حرکت کی وجہ سے تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ زبان ایک انتہائی لچک دار عضو ہے جو بے شمار عضلات سے بنا ہے۔ اس کے ہر حصے کو حرکت دی جا سکتی ہے۔ زبان کے تمام حصے اوپر کی جانب اپنے مقابل میں واقع اعضاء کے ساتھ جا کر ملتے ہیں یا ان کی قربت اختیار کرتے ہیں، مثلاً حلقوم کی دیوار کے مقابل آنے والے حصے کو زبان کی جڑ، نرم تالو کے مقابل آنے والے حصے کو عقبِ زبان، سخت تالو (تالو کا اگلا حصہ) اور دانتوں کے مقابل آنے والے حصے کو زبان کا 'تیغہ' (Blade) کہتے ہیں۔ زبان کے اگلے سرے کو 'نوکِ زبان' (Apex) کہتے ہیں۔ نوکِ زبان کو اوپر اٹھایا جا سکتا ہے اور منہ کے پیچھے کی جانب بھی موڑا جا سکتا ہے ایسی صورت میں معکوسی آوازوں

(Retroflex sounds) کی تشکیل عمل میں آتی ہے مثلاً ٹ، ڈ، ڑ، وغیرہ۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ منہ کی چھت کا پچھلا حصہ کوّے یعنی لہات پر ختم ہوتا ہے۔ کوّے کے آگے منہ کی چھت کا جو حصہ بغیر ہڈی کا ہے اسے نرم تالو یا 'غشا' (Velum) کہتے ہیں۔ غشا سے آگے کا حصہ سخت تالو یا صرف تالو یعنی 'حنک' (Palate) کہلاتا ہے۔ حنک سے آگے کے حصے کو مسوڑھا، یعنی 'لثہ' (Alveolar ridge) کہتے ہیں۔ اسے Teeth-ridge بھی کہتے ہیں۔ یہ منہ کی چھت کا آخری حصہ ہے جس میں دانت جڑے ہوتے ہیں۔ منہ کی چھت کے یہ تمام حصے مختلف صوتی مخارج کا کام انجام دیتے ہیں جن سے 'لہاتی' (Uvular)، 'غشائی' (Velar)، 'حنکی' (Palatal)، اور 'لثوی' (Alveolar) آوزیں پیدا ہوتی ہیں، اور جب زبان اوپری دانت کے مقابل آتی ہے تو 'دندانی' (Dental) آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تمام اعضاء تکلمی آوازوں کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے انھیں 'اعضائے تکلم' (Organs of Speech) یا 'تکلمی اعضاء' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ذیل کے نقشے میں تکلمی اعضاء کے نام اور ان کے محلِ وقوع دیے گئے ہیں:
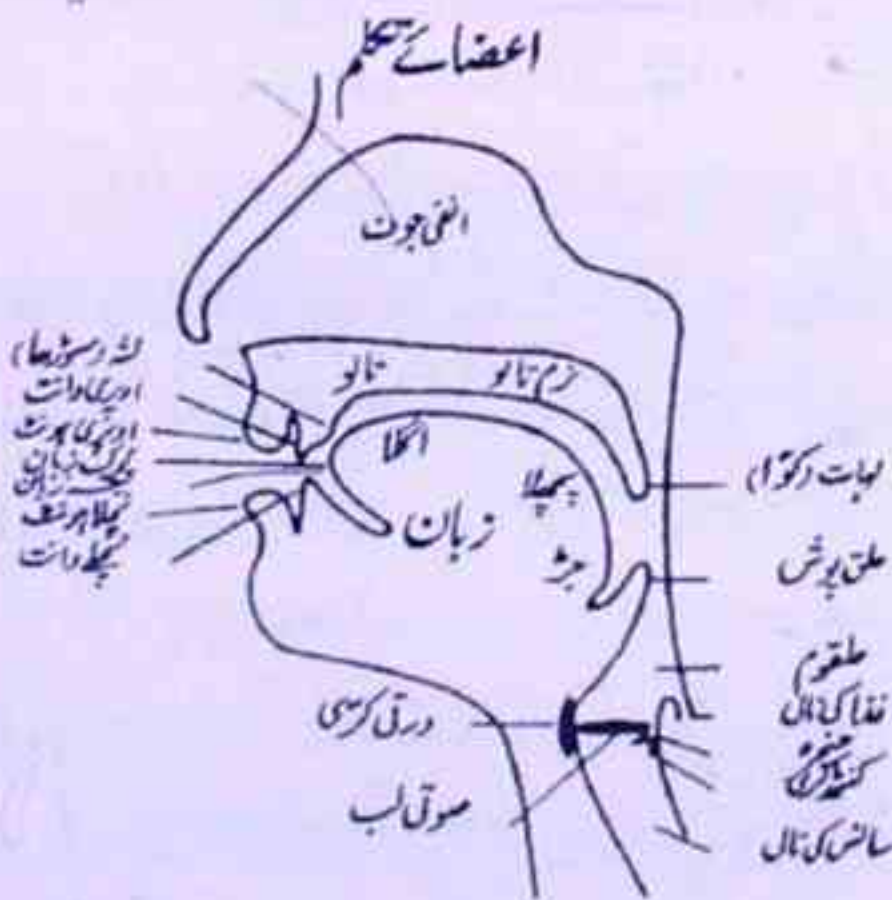
3- صوتیہ

کسی زبان کے نظامِ صوت کی سب سے چھوٹی صوتی اکائی 'صوتیہ' (Phoneme) کہلاتی ہے۔ یہ 'ممیز صوتی اکائی' (Distinctive Sound Unit) ہوتی ہے جس کی وجہ سے ایک لفظ دوسرے لفظ سے ممیز ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم 'پانی' (Water) اور 'بانی' (Founder) کو لیں جو اردو زبان کے دو مختلف الفاظ ہیں، تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں معنی کا فرق /پ/ اور /ب/ کے صوتیاتی فرق سے پیدا ہوا ہے، لہٰذا /پ/ اور /ب/ اردو زبان کی دو ممیز اصوات قرار دی جائیں گی جنھیں صوتیوں (Phonemes) کا درجہ حاصل ہے۔ صوتیاتی اعتبار سے /پ/ اور /ب/ میں تخالفی رشتہ (Contrastive relationship) پایا جاتا ہے، اسی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف اور ممیز آوازیں ہیں۔ /پ/ ایک غیر مسموع (Voiceless) صوت ہے اور /ب/ ایک مسموع (Voiced)۔ جب کسی لفظی جوڑے میں کم از کم ایک صوت کا فرق ہو، تو ایسے لفظی جوڑے کو 'اقلی جوڑا' (Minimal Pair) کہیں گے۔ پانی: بانی ایک اقلی جوڑا ہے۔ اسی طرح حال: جال، قمر: کمر، سادی: شادی، کانا: گانا، بالو: بھالو، شیر: شور، کھانا: کھونا، وغیرہ بھی اقلی جوڑے ہیں۔ اقلی جوڑوں ہی کی مدد سے کسی زبان کی ممیز آوازوں یعنی صوتیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کے صوتیوں کی کل تعداد 47 ہے جن کی دو بڑی قسمیں ہیں: مصوتے (Vowels)، اور مصمتے (Consonants)

مصوتی آوازیں (Vowel sounds) وہ آوازیں ہیں جن کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے خارج ہونے والی ہوا (Air-stream) بغیر کسی رکاوٹ کے منہ کے راستے سے خارج ہوتی ہے، مثلاً /آ/، /ای/، /اؤ/، وغیرہ۔ اردو میں کل 10 مصوتے پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مصمتی آوازیں (Consonantal sounds) وہ آوازیں ہیں جو پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا کی مدد سے منہ کے مختلف مقامات (Points) پر پیدا کی جاتی ہیں، مثلاً پ ب، ت د، چ ج، ک گ، ق، وغیرہ۔ اردو کے غیر ہکاری (Unaspirated)

مصمتوں کی کل تعداد 26 ہے۔ ان کے علاوہ گیارہ ہکاری (Aspirated) مصمتے بھی ہیں جس سے اردو کے کل مصمتوں کی تعداد 37 ہو جاتی ہے۔ اردو کے گیارہ ہکاری مصمتے یہ ہیں: پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، ڑھ۔

3.1- اردو مصمتوں کی درجہ بندی

اردو مصمتوں کی درجہ بندی تین باتوں پر منحصر ہے: 1) مقام ادائیگی یا مخارج (Points of Articulation)، 2) طرزِ ادائیگی (Manner of Articulation)، 3) صوتی لبوں کی لرزش (Vibration of vocal cords)

3.1.1- مقام ادائیگی یا مخارج

جو آواز منہ کے جس مقام سے ادا ہوتی ہے وہی اس کا مخرج کہلاتا ہے۔ مخارج کا سلسلہ ہونٹوں سے لے کر حلق تک پھیلا ہوا ہے۔ مخارج دراصل وہ اعضائے تکلم ہیں جہاں سے اصوات برآمد ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان اصوات کے نام متعلقہ اعضائے تکلم کے نام پر رکھے جاتے ہیں، مثلاً دونوں ہونٹوں کے مخرج سے ادا ہونے والی صوت 'دولبی' (Bilabial) کہلاتی ہے، جیسے /پ/ اور /ب/۔ اسی طرح لثہ (مسوڑھا) سے ادا ہونے والی صوت 'لثوی' (Alveolar) کہلاتی ہے، جیسے /ت/ اور /د/، نیز غشا (نرم تالو) سے ادا ہونے والی صوت 'غشائی' (Velar) کہلاتی ہے، جیسے /ک/ اور /گ/، وغیرہ۔

اردو مصمتوں کی کل تعداد 37 ہے جو درجِ ذیل دس مخارج (Points of Articulation) سے ادا کیے جاتے ہیں۔ ان مصمتوں کے نام انھی مخارج پر رکھے گئے ہیں:

(1) دولبی (Bilabial): پ/پھ/ب/بھ/م۔

(2) لب دندانی (Labio-dental): ف/و۔

(3) دندانی (Dental): ت/تھ/د/دھ/ن۔

(4) لثوی (Alveolar): س/ز/ل/ر۔

(5) معکوسی یا کوز (Retroflex): ٹ/ٹھ/ڈ/ڈھ، ڑھ۔

(6) حنک لثوی (Palato-alveolar): /ش/ژ/۔

(7) حنکی یا تالوئی (Palatal): /چ/چھ/ج/جھ/ی/۔

(8) غشائی (Velar): /ک/کھ/گ/گھ/خ/غ/۔

(9) لہاتی یا کوے کی (Uvular): /ق/۔

(10) حلقی (Glottal): /ہ/۔

3.1.2- طرز ادائیگی

اردو صوتیوں کی درجہ بندی 'طرز ادائیگی' (Manner of Articulation) کے اعتبار سے بھی کی گئی ہے۔ طرز ادائیگی سے مراد اصوات کی ادائیگی کے دوران پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا کے اخراج کے طرز یا طور (Manner) سے ہے۔ اصوات کی ادائیگی کے دوران پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا کبھی مختلف مخارج پر مکمل رک جاتی ہے تو کبھی رگڑ کے ساتھ گزرتی ہے، اور کبھی ناک کے راستے سے خارج ہوتی ہے، اور کبھی زبان کی بغل سے ہوکر نکل جاتی ہے۔ ہوا کے اخراج کے یہی طور طریقے اور مختلف انداز مختلف قسم کے مصمتوں کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں، اور جن کے نام ان کی طرز ادائیگی پر رکھے جاتے ہیں۔ اردو کے 37 مصمتوں کی درجہ بندی طرز ادائیگی کے اعتبار سے یوں کی گئی ہے:

(1) بندشی (Stop یا Plosive): پ، پھ، ب، بھ، ت، تھ، د، دھ، ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، چ، چھ، ج، جھ، ک، کھ، گ، گھ، ق۔

(2) صفیری (Fricative): ف، و، س، ز، ش، ژ، خ، غ، ہ۔

(3) انفی (Nasal): م، ن۔

(4) تکریری (Trill): ر۔

(5) پہلوئی یا بغلی (Lateral): ل۔

(6) تھپک دار (Flapped): ڑ، ڑھ۔

(7) نیم مصوتہ (Semi-vowel): ی۔

3.1.3- صوتی لبوں کی لرزش

مصمتوں کی درجہ بندی صوتی لبوں (Vocal lips) کی حرکت وسکون کے اعتبار سے بھی کی جاتی ہے۔ جب صوتی لب متحرک ہوتے ہیں ، یعنی ان میں لرزش (Vibration) پیدا ہو جاتی ہے تو مسموع (Voiced) اصوات پیدا ہوتی ہیں، مثلاً ب، د، گ، وغیرہ۔ اور جب یہ ساکن یا غیر متحرک ہوتے ہیں تو غیر مسموع (Voiceless) اصوات پیدا ہوتی ہیں، مثلاً پ، ت، ک، وغیرہ۔

صوتی لبوں کی لرزش یا عدم لرزش کو عضویاتی طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ داہنے یا بائیں ہاتھ کی، انگوٹھے کے بعد کی چاروں انگلیاں گلے (Throat) پر رکھی جائیں، پھر سَ (زبر کے ساتھ) کی آواز تواتر کے ساتھ جلدی جلدی منہ سے نکالی جائے، یعنی سَ سَ سَ سَ سَ سَ، اس کے بعد زَ (زبر کے ساتھ) کی آواز تواتر کے ساتھ جلدی جلدی نکالی جائے، یعنی زَ زَ زَ زَ زَ زَ۔ اس عمل کے دوران میں زَ کی ادائیگی کے وقت گلے کے اندر صوتی لبوں میں لرزش کا احساس ہوگا، کیوں کہ زَ ایک مسموع (Voiced) صوت ہے، جب کہ سَ کی ادائیگی کے وقت صوتی لبوں میں لرزش محسوس نہیں ہوگی، کیوں کہ سَ ایک غیر مسموع (Voiceless) آواز ہے۔ یہی تجربہ ب دَ گ (مسموع اصوات) اور پ ت ک (غیر مسموع اصوات) کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اردو کے 37 مصمتوں میں جو مصمتے صوتی جوڑوں (Sound pairs) کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی پہلی صوت غیر مسموع ہوتی ہے، اور دوسری صوت مسموع۔ مثلاً پ ب، ت د، ک گ کے صوتی جوڑوں کی پہلی آوازیں، یعنی پ ت ک غیر مسموع ہیں اور دوسری اصوات ب دگ مسموع۔ اردو کے صوتیاتی نظام میں 16 مصمتے غیر مسموع اور 21 مصمتے مسموع ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

(1) غیر مسموع مصمتے: پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، چ، چھ، ک، کھ، ق، ء، ف، س، ش، خ۔

مصمتوں کی درجہ بندی

	دولبی	لب دندانی	دندانی اور لثوی	معکوسی	خنک لثوی	لث حنکی	حنکی	غشائی	لہاتی	حلقومی	حلقی
بندشی	پ ب		ت د	ٹ ڈ			چ ج	ک گ	ق		
انفی	م		ن								
پہلوئی صفیری											
پہلوئی غیر صفیری			ل								
تکریری			ر								
تھپک دار				ڑ							
صفیری		ف و	س ز		ش ژ			خ غ			ہ
بے رگڑ جاریے اور نیم مصوتے							ی				

(2) مسموع مصمتے: ب، بھ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ج، جھ، گ، گھ، و، ز، ژ، غ، م، ن، ر، ل، ڑ، ڑھ، ی۔

3.2- مصمتوں کی صوتیاتی خصوصیات

جیسا کہ ہم نے دیکھا، مصمتوں کی درجہ بندی تین باتوں کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے: 1) مخارج، 2) طرزِ ادائیگی، 3) صوتی لبوں کی حالت (ان کا متحرک یا غیر متحرک ہونا)۔ یہ تین باتیں کسی مصمتے کی صوتیاتی خصوصیات (Phonetic features) قرار پاتی ہیں۔ مثال کے طور پر /پ/ جو اردو کا ایک مصمتہ ہے، بہ اعتبارِ مخرج دولبی ہے، اور طرزِ ادائیگی کے اعتبار سے بندشی ہے۔ اور جب یہ پیدا ہوتا ہے تو صوتی لبوں میں لرزش نہیں ہوتی، اس لیے یہ غیر مسموع ہے، چنانچہ یہ مصمتہ تین متذکرہ صوتیاتی خصوصیات سے متصف ہے۔ اسی طرح مصمتہ /ب/، دولبی، بندشی اور مسموع ہے۔ ان دونوں مصمتوں میں صوتی لبوں کے لرزش نہ کرنے اور کرنے کی وجہ سے فرق پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ دونوں دولبی اور بندشی مصمتے ہیں۔ صوتی خصوصیت کے اسی فرق کی وجہ سے ایک مصمتہ دوسرے مصمتے سے مختلف یعنی ممیز (Distinctive) ہو جاتا ہے۔

3.2.1- چند مصمتوں کی صوتیاتی خصوصیات

(1) /پ/: غیر مسموع، دولبی، بندشی۔

(2) /ب/: مسموع، دولبی، بندشی۔

(3) /ت/: غیر مسموع، لثوی، بندشی۔

(4) /د/: مسموع، لثوی، بندشی۔

(5) /ٹ/: غیر مسموع، معکوسی، بندشی۔

(6) /ڈ/: مسموع، معکوسی، بندشی۔

(7) /چ/: غیر مسموع، حنکی، بندشی۔

(8)　/ج/: مسموع، حنکی، بندشی۔

(9)　/ک/: غیر مسموع، غشائی، بندشی۔

(10)　/گ/: مسموع، غشائی، بندشی۔

(11)　/ق/: غیر مسموع، لہاتی، بندشی۔

(12)　/ہ/: غیر مسموع، حلقی، صفیری۔

(13)　/ن/: مسموع، انفی، لثوی۔

(14)　/م/: مسموع، دولبی، انفی۔

(15)　/س/: غیر مسموع، لثوی، صفیری۔

(16)　/ز/: مسموع، لثوی، صفیری۔

(17)　/ش/: غیر مسموع، حنک لثوی، صفیری۔

(18)　/ژ/: مسموع، حنک لثوی، صفیری۔

(19)　/خ/: غیر مسموع، غشائی، صفیری۔

(20)　/غ/: مسموع، غشائی، صفیری۔

(اسی طرح بقیہ مصمتوں کا بھی بیان)

3.2.2- اقلی جوڑے

انہی صوتیاتی خصوصیات کی بنا پر ایک صوت دوسری صوت سے ممیز ہو جاتی ہے، اور ان میں تضاد (Contrast) پیدا ہو جاتا ہے۔ دو اصوات میں متضاد یا تخالفی رشتہ اسی وقت قائم ہوگا جب ان کے درمیان کم از کم کسی ایک صوتیاتی صفت میں تضاد پایا جاتا ہو مثلاً /ق/ کی صوت، /ک/ کی صوت سے اس لیے ممیز و مختلف ہے کہ /ق/ ایک لہاتی آواز ہے اور /ک/ ایک غشائی، یعنی دونوں کے مخارج الگ الگ ہیں۔ ورنہ طرز ادائیگی اور صوتی لب کی حالت کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ دونوں بندشی اصوات ہیں اور دونوں غیر مسموع ہیں۔ ان دونوں اصوات میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے، وہ 'مخرج' ہے۔ مخرج کے اعتبار سے دونوں متضاد اصوات ہیں۔ اسی تضاد کی وجہ سے الفاظ کے معنی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً:

(1) کمر (waist): قمر (moon)۔

(2) کالی (black): گالی (abuse)۔

(3) سادی (plain): شادی (marriage)۔

(4) خالی (vacant): جالی (net)۔

(5) لوگ (people): روگ (disease)، وغیرہ۔

3.3- ہکار یا نفسی مصمتے

3.3.1- نفسی مصمتے بہ حیثیت واحد صوتی اکائیاں

اردو کے 37 مصمتوں (Consonants) میں سے 11 مصمتے ھ- مخلوط (Aspirated) ہیں جن کی منہ سے ادائیگی کے لیے فاضل 'ہوا کا جھونکا' (Puff of air) درکار ہوتا ہے۔ ان مصمتوں کو تحریر کا جامہ پہنانے کے لیے دوچشمی 'ہے' (=ھ) کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً بھ، پھ، تھ، جھ، کھ، وغیرہ۔ صوتیاتی اعتبار سے یہ 'واحد صوتی اکائیاں' (Single phonetic units) ہیں، نہ کہ دو اصوات کا جوڑ، اور اس اعتبار سے یہ مفرد صوتیے (Separate Phonemes) ہیں۔ صوتیاتی اصطلاح میں انھیں 'ہکار' یا 'نفسی اصوات' (Aspirates) کہتے ہیں۔

اردو کے نظامِ صوت میں نفسی اصوات کی بیحد اہمیت ہے۔ اردو کے ہندی الاصل الفاظ میں نفسی اصوات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ 'ہکاریت' یا 'نفسیت' (Aspiration) اردو میں 'ممیز' (Distinctive) ہے، یعنی اسے صوتیے (Phoneme) کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً:

(1) /بالو/ (sand): /بھالو/ (bear)

(2) /کانا/ (one-eyed): /کھانا/ (food)

(3) /سات/ (seven): /ساتھ/ (with)، وغیرہ۔

3.3.2- نفسی مصمتوں کی درجہ بندی

اردو کے 11 مصمتے جو صوتیوں (Phonemes) کا درجہ رکھتے ہیں یہ ہیں:

پھ، بھ، تھ، دھ، ٹھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، ڑھ۔

ان میں سے 10 اول الذکر لفسی مصمتے بہ اعتبار طرزِ ادائیگی 'بندشی' ہیں، اور آخرالذکر نفسی مصمتہ /ڑھ/ 'تھپک دار' ہے۔ مخارج کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی حسب ذیل ہے:

(1) دولبی: پھ، بھ۔

(2) دندانی: تھ، دھ۔

(3) معکوسی: ٹھ، ڈھ، ڑھ۔

(4) حنکی: چھ، جھ۔

(5) غشائی: کھ، گھ۔

بعض ماہرینِ لسانیات مھ، نھ، لھ، رھ کو بھی اردو کے لفسی مصمتوں میں شامل کرنا چاہتے ہیں اور مثال میں تمھارا، ننھا، دولھا، اور سرھانا جیسے الفاظ پیش کرتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے اقلی جوڑے (Minimal Pairs) نہیں ملتے، اور ان سے تشکیل پانے والے الفاظ بھی اردو میں شاذ ہیں۔ 'سرھانے' کی مثال کے طور پر اکثر میر تقی میرؔ کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

سرھانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

لیکن 'سرھانے' کا تلفظ اکثر 'سرہانے بھی' کیا جاتا ہے۔

3.4- اردو مصوتوں کی درجہ بندی

مصوتوں (Vowels) کی تشکیل میں زبان (Tongue) اور ہونٹ (Lips) بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے مصوتوں کی درجہ بندی کا طریقہ، مصمتوں کی درجہ بندی سے کافی مختلف ہے۔ مصوتوں کی درجہ بندی حسبِ ذیل تین باتوں پر مبنی ہے: 1) زبان کا حصہ (Part of the Tongue)، 2) زبان کی اونچائی (Height of the

(Tongue)، اور 3) ہونٹوں کی حالت (Position of Lips)

3.4.1- زبان کا حصہ

زبان کے حصے سے مراد زبان کا اگلا، پچھلا اور وسطی حصہ ہے۔ زبان کے یہ تینوں حصے مصوتوں کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ حصۂ زبان کے انھی ناموں سے مصوتوں کو اگلے (Front)، پچھلے (Back)، اور وسطی (Central) مصوتوں سے یاد کیا جاتا ہے:

(1) اگلے مصوتے: /ای/، /اِ/، /اے/۔

(2) پچھلے مصوتے: /اوٗ/، /اُ/، /او/۔

(3) وسطی مصوتے: /اَ/، /آ/۔

3.4.2- زبان کی اونچائی

مصوتوں کی درجہ بندی زبان کی اونچائی کے اعتبار سے بھی کی جاتی ہے۔ زبان ایک لچک دار (Flexible) عضو ہے جو مصوتوں کی ادائیگی کے دوران میں کبھی منہ میں تالو کے بالکل قریب پہنچ جاتی ہے اور کبھی اس سے دور چلی جاتی ہے۔ اگر زبان اپنی اصلی حالت میں رہنے کے بجائے منہ کی چھت یعنی تالو کی جانب اونچی اٹھتی ہے تو منہ کا بیشتر حصہ بند ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بند مصوتوں (Close vowels) کی تشکیل عمل میں آتی ہے، اور اگر زبان تالو سے ہٹ کر نیچے آجاتی ہے تو کھلے مصوتے (Open vowels) تشکیل پاتے ہیں۔ ان کے بیچ کے مصوتے درمیانی مصوتے کہلاتے ہیں:

(1) اونچے (بند) مصوتے: /اوٗ/، /اُ/، /ای/، /اِ/۔

(2) نچلا (کھلا) مصوتہ: /آ/۔

(3) درمیانی مصوتے: /او/، /اَ/، /اے/۔

3.4.3- ہونٹوں کی حالت

ہونٹوں کی حالت کے اعتبار سے مصوتے یا تو گول (مدور) ہوتے ہیں یا پھیلے ہوئے

(کشیدہ)۔ اگلے مصوتوں کی ادائیگی کے وقت دونوں ہونٹ پھیل جاتے ہیں، اس لیے انھیں 'کشیدہ مصوتے' (Spread vowels) کہتے ہیں، لیکن جب پچھلے مصوتے ادا کیے جاتے ہیں تو دونوں ہونٹ گول ہوجاتے ہیں، اسی لیے انھیں 'مدور مصوتے' (Rounded vowels) کہتے ہیں:

(1) کشیدہ مصوتے: /ای/، /اِ/، /اے/، /اَ/، /آ/۔

(2) مدور مصوتے: /اؤ/، /اُ/، /او/۔

اجزائے زبان

3.5- اردو کے خالص اور دوہرے مصوتے

اردو مصوتوں کی کل تعداد دس ہے، جن میں سے آٹھ خالص مصوتے (Pure vowels) اور دو دوہرے مصوتے (Diphthongs) ہیں۔ خالص مصوتوں کی صوتی ادائیگی کے وقت زبان ایک ہی حالت میں رہتی ہے، جب کہ دوہرے مصوتے اس وقت تشکیل پاتے ہیں جب زبان ایک مصوتی حالت سے دوسری مصوتی حالت میں پہنچ جاتی ہے۔

مصوتوں کے مخارج

مصوتوں کی درجہ بندی

	پچھلا	وسطی	اگلا
بند (یا اونچا)	اؤ /u:/		ای /i:/
نیم بند	اُ /u/		اِ /i/
درمیانی	او /o/		اے /e/
نیم کھلا		اَ /ə/	
کھلا (یا نچلا)		آ /a/	

اردو کے سارے مصوتے بشمول دوہرے مصوتے جداگانہ صوتیوں (Separate phonemes) کا درجہ رکھتے ہیں۔ دوہرے مصوتوں کی صوتی تحریری نمائندگی اگرچہ دو مصوتی نشانات (Vowel signs) کے ذریعے کی جاتی ہے، لیکن صوتیاتی اعتبار سے یہ واحد صوتی اکائیاں (Single sound units) ہیں۔

3.5.1- خالص مصوتے

اردو میں آٹھ خالص مصوتے پائے جاتے ہیں جو یہ ہیں:

(1) /اَ/: اَب، اَدب، اَگر۔

(2) /آ/: آپ، آم، آدمی۔

(3) /اِ/: اِرادہ، اِنسان، اِشارہ۔

(4) /ای/: ایجاد، ایمان، ایکھ۔

(5) /اُ/: اُدھر، اُجالا، اُردو۔

(6) /اؤ/: اؤپر، اؤن، اؤنٹ۔

(7) /اے/: ایک۔

(8) /او/: اوس، اوکھلی۔

3.5.2- مختصر اور طویل مصوتے

مختصر مصوتے وہ ہیں جن کی صوتی ادائیگی میں وقت کم صرف ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف طویل مصوتوں کو زیادہ دیر تک طول دیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کے صوتی تانے بانے دونوں طرح کے مصوتوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ اردو کے متذکرہ آٹھ خالص مصوتوں میں سے تین مختصر مصوتے ہیں اور پانچ طویل مصوتے۔

اردو مصوتوں کا طول (Length) ممیز (Distinctive) ہے، یعنی اس کی وجہ سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً:

(1) /ا/:/آ/، مثلاً:

- اَب (now): آب (water)۔
- کل (tomorrow): کال (famine)۔
- گلی (lane): گالی (abuse)۔

(2) /اِ/:/ای/، مثلاً:

- دِن (day): دین (religion)۔
- گِلہ (complaint): گیلا (wet)۔

(3) /اُ/:/اؤ/، مثلاً:

- دُر (pearl): دوٗر (far)۔
- سُنا (heard): سوٗنا (lonely)۔

3.5.3- دوہرے مصوتے

اردو کے نظامِ صوت میں آٹھ خالص مصوتوں کے علاوہ دو دوہرے مصوتے بھی پائے جاتے ہیں جو یہ ہیں:

(1) /اَے/، مثلاً: ایسا، عیب۔

(2) /اَوٗ/، مثلاً: اوزار، عورت۔

متذکرہ دونوں مصوتے اگرچہ دوہرے مصوتے کہے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی

بھی دو مصوتوں کا مجموعہ نہیں۔ صوتیاتی اعتبار سے یہ واحد صوتی اکائیوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً:

(1) دَیر (temple): دَوْر (age)

(2) پَیدا (born): پَودہ (plant)

(3) مَیلا (dirty): مَولا (master)۔

4.5.4 مصوتوں کی انفیت

اردو مصوتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں غنّہ یا انفیت (Nasalization) پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں نرم تالو (Velum) نیچے آجاتا ہے جس کی وجہ سے ناک کا راستہ یا انفی جوف کھل جاتا ہے اور پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا منہ کے علاوہ ناک کے راستے سے بھی ہو کر گذرتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں مصوتوں میں غنّہ یا انفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انفی مصوتے اردو میں 'نونِ غنّہ' کہلاتے ہیں۔ اردو کے سارے مصوتے اور دوہرے مصوتے غنّہ کے ساتھ بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔

صوتیاتی رسمِ خط میں غنّہ کو ظاہر کرنے کے لیے ایک علامت [~] کا استعمال کیا جاتا ہے جسے لسانیاتی اصطلاح میں 'Tilda' (ٹلڈا) کہتے ہیں۔ صوتیاتی رسمِ خط میں اگر 'ماں' لکھنا ہو تو یوں لکھیں گے: [mã]۔

اردو کے سارے دس انفیائے گئے مصوتے (Nasalized Vowels) یہ ہیں:

(1) /اَ/= ہَنسنا۔

(2) /آ/= کھانسی۔

(3) /اِ/= سِنگار (سنگھار)۔

(4) /ای/= سینگ۔

(5) /اُ/= اُنگلی

(6) /اوٗ/= گیہوں

(7) /اے/= گیند

(8) /او/= گوند

(9) /اَے/= بھینس

(10) /اَو/= بھونرا

نونِ غنہ، یعنی انفیت (Nasalization) اردو کے صوتی نظام میں ممیز (Distinctive) ہے، یعنی اس سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے صوتیے کا درجہ حاصل ہے، لیکن ک، گ کی طرح یہ قطعاتی صوتیہ (Segmental phoneme) نہیں، بلکہ فوق قطعاتی صوتیہ (Supra-segmental phoneme) ہے۔ ذیل کی چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے:

- ہے 'is': ہیں 'are'۔
- تھی 'was': تھیں 'were'۔
- کہا 'said': کہاں 'where'۔
- مے 'wine': مَیں 'I'۔
- ساس 'mother-in-law': سانس 'breath'۔
- گود 'lap': گوند 'gum'۔
- آدھی 'half': آندھی 'storm'۔

کتابیات

-1 سید محی الدین قادری زور، *Hindustani Phonetics* (پیرس، 1930ء)۔

-2 عبدالقادر سروری، 'زبان اور علمِ زبان' (حیدر آباد [دکن]: مجلس تحقیقات اردو، 1970ء)۔

-3 مسعود حسین خاں، ''اردو صوتیات کا خاکہ''، مشمولہ 'مقدماتِ شعر و زبان' از مسعود حسین خاں (حیدر آباد: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، 1966ء)۔

4- مسعود حسین خاں، 'اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ'، ترجمہ: مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1986ء)۔

Original title: "A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu."

5- Peter Ladefoged, *A Course in Phonetics*, 6th edition (Noida: Cengage Learning, 2012).

6- Winfred P. Lehmann, *Descriptive Linguistics*: An Introduction, 2nd edition (New York: Random House, Inc., 1976). Chapters 4-5: "The Study of Speech Sounds".

●●●

اردو میں لسانی تحقیق

زبان اظہارِ خیال کا ایک بہترین وسیلہ، اور ترسیل و ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ زبان شعورِ انسانی کا ایک نادر کرشمہ بھی ہے جس نے انسان کو دوسری ذی روح مخلوقات سے ممتاز بنا دیا ہے۔ انسان کی شخصیت کی تعمیر اور انسانی تہذیب کی تشکیل میں زبان جو کردار ادا کرتی ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ زبان ہر سماج، ہر طبقے اور ہر خطے میں پائی جاتی ہے۔ ہر دور میں کچھ ایسے ذی علم بھی گذرے ہیں جو زبان کے بارے میں غور و خوض کرتے رہے ہیں۔ لسانی مطالعہ و تحقیق کے ارتقا کی تاریخ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

قدیم ہندوستان میں پانِنی (چوتھی صدی قبلِ مسیح) نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'اشٹادھیائی' کے ذریعے سے سنسکرت زبان کے مطالعے کو بامِ عروج تک پہنچا دیا تھا جس کا اعتراف مغربی ماہرینِ لسانیات نے بھی کیا ہے۔[1] اُدھر قدیم یونان میں فلسفیانہ مسائل و مباحث کے ساتھ ساتھ لسانی مسائل پر بھی غور و فکر کا سلسلہ جاری تھا جس کی شہادت افلاطون (Plato) کی تصنیف *Cratylus* اور دیگر یونانی تصانیف سے ملتی ہے۔ عہدِ قدیم میں عربوں کے یہاں بھی لسانی شعور کی بیداری اور لسانی مسائل پر غور و فکر کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں تدوینِ قواعدِ لسان سے متعلق ابوالاسود اور سیبویہ کی اولین کوششیں قابلِ قدر ہیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں کے دوران میں یورپ میں زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالعات کو کافی فروغ

حاصل ہوا۔(2) بیسویں صدی کے آغاز سے ہی یورپ میں فرڈی ننیڈ ڈی سسیور (Ferdinand de Saussure) اور امریکہ میں فریز بواز (Franz Boas)، ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir)، اور لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) کے پیش کردہ لسانی افکار ونظریات سے 'لسانیاتِ جدید' (Modern Linguistics) کا ارتقا عمل میں آیا جس نے زبان کے مطالعے کو سائنس کا درجہ دیا۔ اب زبانوں کا مطالعہ بالکل نئے انداز سے کیا جانے لگا۔ اب زبان کی ساخت اور اس کی ہیئت کے توضیح و تجزیے میں معروضی، تجزیاتی اور سائنسی طریقِ کار کو اولیت دی جانے لگی۔ اس طرح روز بروز مطالعۂ لسان کے نت نئے نظریات کے فروغ کے ساتھ زبان کا علم کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اردو زبان اور اس کے لسانیاتی پہلوؤں سے اولین دلچسپی اہلِ یورپ کو پیدا ہوئی جن میں ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریز علماء شامل تھے، جنھوں نے نہایت اشتیاق وانہماک کے ساتھ اردو کی قواعدیں مرتب کیں، لغات ترتیب دیے اور اصولِ زبان سے متعلق کتابچے لکھے۔ اس ضمن میں جوشوا کیٹلر (Joshua Ketlaar)، بنجمن شلز (Benjamin Schultze)، جارج ہیڈلے (George Hadley)، جان گلکرسٹ (John Gilchrist)، جان شیکسپیر (John Shakespear)، گارساں دی تاسی (Garcin de Tassy)، ڈنکن فاربس (Duncan Forbes)، جان ڈاؤسن (John Dowson)، جان ٹی. پلیٹس (John T. Platts)، ہنری پامر (Henry Palmer)، جارج اسمال (George Small)، اور ایس. ڈبلیو. فیلن (S.W. Fellen)، وغیرہ کی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں لیکن ان عالموں نے انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے توسط سے کام لیا تھا۔

جس زمانے میں یہ یورپی علماء اردو قواعد کی ترتیب اور لغات کی تدوین کے کاموں میں مصروف تھے، اسی زمانے میں دو ہندوستانی مصنفین سراج الدین علی خاں آرزو (1688-1756ء) اور سید انشاء اللہ خاں انشا (1752-1817ء) کو بھی اردو کے لسانی مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ خان آرزو نے 'نوادر الالفاظ' (1751/52ء) میں اردو

لغت نویسی (Lexicography) کے بہت سے مسائل کو، اور انشا نے 'دریائے لطافت' (1807ء) [3] میں زبانِ اردو کی صرف ونحو سے بحث کی اور اس کی 'طبقاتی بولیوں' (Social dialects) کے باریک اختلافات کو اپنے دائرۂ بحث میں لیا۔ لیکن جس طرح یورپی علماء نے ادائے مطلب کے لیے انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں سے کام لیا تھا، اسی طرح ان مصنفین نے اپنے اظہارِ خیال کے لیے فارسی کو وسیلہ بنایا۔ اردو زبان کے وسیلے سے، اردو کے لسانی مسائل پر اظہارِ خیال کا سہرا سرسید احمد خاں (1817-1898ء) کے سر ہے جنھوں نے اردو صرف ونحو پر 1840ء میں ایک رسالہ تالیف کیا۔ اس کے بعد مولوی امام بخش صہبائی، مولوی احمد علی اور مولوی کریم الدین نے اردو قواعد نویسی کے کام کو آگے بڑھایا۔

عہدِ حاضر میں اردو کے لسانی پہلوؤں اور لسانی مسائل پر غور وفکر کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے اور لسانی مطالعہ وتحقیق کا کام کافی حد تک پھیل چکا ہے۔ اب لغت نویسی، قواعد کی ترتیب اور اصلاحِ زبان، نیز لسانی معیار بندی کے علاوہ بہت سے دوسرے لسانی مسائل اور پہلو بھی سامنے آئے ہیں جن پر علمی وتحقیقی کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔

اردو میں لسانی تحقیق کے اس جائزے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ اردو میں لسانی مطالعہ وتحقیق کی ابتدا سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک کے علمی کارناموں سے متعلق ہے، اور بعد کے تین حصوں میں بیسویں صدی کے دوران میں اردو کے حوالے سے لسانی کاموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

1- اردو میں لسانی مطالعہ وتحقیق کی ابتدا

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اردو کے لسانی مسائل سے اولین دلچسپی اہلِ یورپ کو پیدا ہوئی، لیکن انھوں نے مختلف یورپی زبانوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ اسکے بعد اہلِ اردو اس طرف متوجہ ہوئے، لیکن انھوں نے اظہارِ خیال کے لیے فارسی کا سہارا لیا۔ اہلِ اردو نے اردو کے لسانی مسائل ومباحث پر اردو میں اس وقت لکھنا شروع کیا جب انیسویں صدی نصفِ اول کے اختتام پر پہنچنے والی تھی، اور سرسید احمد خاں وہ پہلے شخص ہیں جن سے اس کام کی ابتدا ہوتی ہے۔

1.1- قواعد نویسی

سر سید احمد خاں پہلے اردو گو ہیں جنھوں نے اردو قواعد پر اردو میں ایک مختصر کتاب لکھی جو 'صرف ونحوِ زبانِ اردوٗ' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ جو سر سید احمد خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں محفوظ ہے۔[4] اس کتاب میں اردو صرف ونحو کے عام قاعدے درج ہیں اور مصادر وغیرہ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ اردو میں لکھی ہوئی اردو کی پہلی قواعد ہے جس کا مصنف اہلِ زبان ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1840ء ہے۔ جب یہ قواعد لکھی گئی تو اس وقت سر سید کی عمر محض تیئیس (23) برس تھی۔ یہ ان کی اولین تصنیف ہے۔ یہ قواعد ابتدائی نوعیت کی ہے جس کی زبان بھی گنجلک ہے، نیز جملوں میں ناپختگی اور ثقالت پائی جاتی ہے۔ بقولِ مولوی عبدالحق ''اگر چہ یہ کتاب کچھ ایسی قابلِ لحاظ نہیں، لیکن اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ مرحوم کو اردو زبان سے کس قدر دلچسپی تھی''۔[5]

سر سید احمد خاں کے بعد مولوی امام بخش صہبائی (1802-1857ء) نے، جو دہلی کالج میں فارسی کے استاد تھے، 'قواعدِ صرف ونحوِ اردوٗ' کے نام سے اردو میں ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب 1845ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔[6] اس کتاب میں اگر چہ اردو صرف ونحو کے مسائل بیان کیے گئے ہیں، لیکن اردو محاورات وضرب الامثال بھی کافی تعداد میں درج ہیں۔ اسی زمانے میں مولوی احمد علی دہلوی نے بھی اردو صرف ونحو پر ایک کتاب 'فیض کا چشمہ' کے نام سے ترتیب دی۔ یہ کتاب بھی 1845ء ہی میں دہلی سے شائع ہوئی۔[7] دہلی ہی کے مولوی کریم الدین نے بھی اردو قواعد پر 'قواعد المبتدی' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ امام بخش صہبائی اور کریم الدین کی اردو قواعد پر لکھی ہوئی کتابوں سے مشہور برطانوی اردو قواعد نویس اور مستشرق جان ٹی. پلیٹس (John T. Platts) نے بھی استفادہ کیا ہے جس کا ذکر اردو قواعد پر لکھی ہوئی اس کی کتاب *A Grammar of the Hindustani or Urdu Language* کے دیباچے (''Preface'') میں ملتا ہے۔ یہ کتاب 1874ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔

اردو-اردو قواعد نویسی کی ابتدا اگر چہ دہلی سے ہوئی، لیکن رفتہ رفتہ، درسی ضروریات کے

تحت، ہندوستان کے دوسرے مقامات میں بھی اردو قواعد نویسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں لکھی جانے والی بعض اردو قواعدوں کے نام یہ ہیں۔ [8]

1۔ 'رسالہ قواعدِ اردو' (مرزا اشار علی بیگ)، حیدر آباد (دکن)، 1860ء۔

2۔ 'منتخب قواعدِ اردو' (محمد حسین خاں)، مدراس، 1873ء۔

3۔ 'اردو صرف ونحو' (راجا شیو پرساد)، کانپور، 1875ء۔

4۔ 'مختصر قواعدِ اردو' (بالک رام)، امرتسر، 1875ء۔

5۔ 'قواعدِ اردو' (پیارے لال)، 1879ء۔

6۔ 'قواعدِ اردو' (مولوی محمد احسن)، الہ آباد، 1882ء۔

7۔ 'وکیل القواعد' (گوجرمل) جالندھری، لاہور، 1890ء۔

8۔ 'قواعدِ اردو' (کابلی سنگھ)، راولپنڈی، 1891ء۔

9۔ 'منتخب القواعد' (سید ضامن علی جلال لکھنوی) لکھنؤ، 1892/93ء [9]

10۔ 'اردو قواعدِ فیروزی' (مولوی فیروز الدین ڈسکوی)، سیال کوٹ، 1892ء۔

11۔ 'مفید القواعد' (منشی کنھیا لال)، لاہور، 1893ء۔

12۔ 'شمس القواعد' (مکھن سنگھ)، ہوشیار پور، 1898ء۔

1.2- لغت نویسی

اردو قواعد نویسی کے ساتھ ساتھ اہلِ یورپ کی اردو لغات کی ترتیب وتدوین میں بھی دلچسپی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن یہ تمام لغات دولسانی (Bilingual)، یعنی اردو۔ انگریزی لغات تھے۔ اسی زمانے میں ہندوستانی عالموں نے بھی بڑے پیمانے پر لغت نویسی کا کام انجام دیا ہے، لیکن یہ لغات بھی دراصل دولسانی، یعنی اردو۔ فارسی لغات ہیں۔ اردو۔ فارسی لغت نویسی کا سلسلہ سید عبدالواسع ہانسوی کی 'غرائب اللغات' سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو 1751/52ء میں 'نوادر الالفاظ' ترتیب دیتے ہیں جو دراصل 'غرائب اللغات' کی تصحیح ہے۔ خانِ آرزو نے چند اور لغات بھی مرتب کی ہیں جن میں 'سراج اللغۃ' کو خاص

اہمیت حاصل ہے۔ 'نوادرالالفاظ' کو سید عبداللہ نے مدوّن (Edit) کر کے 1951ء میں انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) سے شائع کیا۔ 'سراج اللغۃ' چھپ نہ سکا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری، رام پور (یوپی) میں محفوظ ہے۔ خان آرزو کا ایک دوسرا لغت 'چراغِ ہدایت' ہے جس کے مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں۔ بعد کے دور میں میر اوسط علی رشک [10] کے 'نفس اللغۃ' [11] (سالِ تکمیل: 1256 ہجری، بمطابق 1840/41ء) جلال لکھنوی کے 'گلشنِ فیض (سالِ تکمیل: 1290 ہجری، بمطابق 1873/74ء)، اور اوحدالدین بلگرامی کے 'نفائس اللغات' (سالِ تکمیل: 1837ء) کو بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ [12] جلال لکھنوی کے لغت 'گلشنِ فیض' کا دوسرا نام 'گنجینۂ زبانِ اردو' ہے۔ [13] یہ تمام لغات اگرچہ اردو لغات ہیں، لیکن ان کی زبان فارسی ہے، اور یہ بیسویں صدی سے قبل لکھے گئے ہیں۔ [14]

بیسوی صدی سے قبل اردو کے منظوم لغات کا بھی زبردست سلسلہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے کا سب سے اہم لغت 'خالق باری' (سالِ تکمیل: 1031 ہجری (بمطابق 1621/22ء) ہے۔ اس کے مصنف جہانگیر کے عہد کے ضیاء الدین خسرو ہیں۔ اسے بہت دنوں تک امیر خسرو (1253-1325ء) سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے اسے مدون کر کے 1944ء میں انجمن ترقیِ اردو، دہلی سے شائع کیا ہے، [15] اور اپنے دیباچے میں دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ کتاب 'خالق باری' کے نام سے معروف ہے، لیکن اس کا اصلی نام 'حفظ اللسان' ہے۔ [16] 'خالق باری' کے تتبع میں بے شمار منظوم لغات لکھے گئے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں، مثلاً 'صمد باری'، [17] 'حمد باری'، [18] 'رازق باری'، [19] 'قادر باری'، [20] 'اللہ باری'، [21] وغیرہ۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ 'خالق باری' کے نام سے کئی مصنفین نے منظوم لغات ترتیب دیے، مثلاً محمد اکرم، سید غلام علی شاہ امروہوی اور احمد الدین خاں وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ [22]

اردو-اردو لغات کی ترتیب و تالیف کا سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا جامع لغت سید احمد دہلوی (1844-1918ء) کا مرتب کیا

ہوا 'فرہنگِ آصفیہ' ہے جس کی دو جلدیں (جلدِ اول و دوم) 1888ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں، لیکن 'فرہنگِ آصفیہ' کی تالیف سے بہت پہلے سید احمد دہلوی 'مصطلحاتِ اردو' اور 'ارمغانِ دہلی' ترتیب دے چکے تھے۔ 'ارمغانِ دہلی' کو بنیاد بنا کر انھوں نے 'لغاتِ اردو' کی ترتیب کا کام شروع کیا، پھر اس میں بے شمار اضافے اور ترمیمات کیں اور اسے 'ہندوستانی اردو لغت' کے نام سے از سرِ نو ترتیب دینا شروع کیا۔ یہی لغت 'فرہنگِ آصفیہ' کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوا۔ 'فرہنگِ آصفیہ' کی تالیف سے ذرا پہلے، یعنی 1886ء میں دو اردو۔ اردو لغات طبع ہو کر منظرِ عام پر آئے۔ پہلا نیاز علی بیگ نکہت کا 'مخزنِ فوائد' تھا اور دوسرا منشی چرنجی لال دہلوی کا 'مخزن المحاورات'۔ 'مخزنِ فوائد' میں بقولِ مسعود ہاشمی 'مولف نے کافی تلاش و تحقیق کے بعد اردو محاورات جمع کیے اور ہر محاورے کی سند کسی نہ کسی استاد کے شعر سے پیش کرنے کی کوشش کی'۔ (23) مخزن المحاورات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''اس کے بنیادی اندراجات اردو کے تقریباً دس ہزار محاورات پر مشتمل ہیں''۔ (24) غالباً اسی زمانے میں داغ دہلوی (1831-1905ء) کے شاگرد مولانا احسن مارہروی نے 'فصیح اللغت' کے نام سے ایک اردو۔اردو لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ بقولِ احسن مارہروی داغ کو بھی اس لغت سے دلچسپی تھی، لیکن نہایت افسوس ہے کہ یہ لغت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ کہا جاتا ہے کہ اس لغت کے لیے سند کے اشعار خود داغ کہا کرتے تھے، اور ''اس کا التزام کیا گیا تھا کہ اس لغت میں سند کے شعر صرف داغ کے کہے ہوئے ہوں گے''۔ (25)

اسی زمانے میں جلال لکھنوی (1832-1909ء) نے 'گلشنِ عشق' یا 'گنجینۂ زبانِ اردو' کے نام سے اردو کا جو لغت فارسی میں مرتب کیا تھا، اس کا انھوں نے اردو میں ترجمہ 'سرمایۂ زبانِ اردو' کے نام سے کیا جو 1304 ہجری (بمطابق 1886/87ء) میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ 'سرمایۂ زبانِ اردو' میں الفاظ و محاورات اور ان کی ترتیب بالکل وہی ہے جو 'گنجینۂ زبانِ اردو' میں ہے، البتہ الفاظ و محاورات کی تعداد 'سرمایۂ زبانِ اردو' میں کچھ کم ہوگئی ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کے معنی اور مطلب کے بیان میں بھی بعض ترمیمیں کی گئی ہیں۔ 'گنجینۂ زبانِ اردو' میں میر اوسط علی رشک کے لغت 'نفس اللغۃ' کی گہری چھاپ موجود ہے۔ (26) رشید حسن خاں

(1925-2006ء) لکھتے ہیں: ''جلال، رشک کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے لغت 'گلشنِ فیض' میں 'نفس اللغتہ' کی بہت سی عبارتوں کو بہ لفظہٖ یا معمولی ترمیم کے ساتھ نقل کرلیا ہے، اور کہیں حوالہ نہیں دیا ہے''۔ (27)

مرزا محمد مرتضیٰ عرف مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی (متوفی 1311 ہجری (بمطابق 1893/94ء) نے اردو محاورات پر مشتمل ایک لغت 'بہارِ ہند' کے نام سے ترتیب دیا تھا جس کا پہلا حصہ جو صرف الف کی تختی پر مشتمل تھا 1889ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ باقی حصے طبع نہ ہو سکے۔ اگر باقی حصے بھی چھپ جاتے تو یہ اردو کا ایک جامع لغت ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عاشق لکھنوی، لکھنؤ کے ''اربابِ اعتبار'' میں سے تھے۔ (28) برج نرائن چکبست نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزائے مرحوم کو تھی اس کا اندازہ ان کی مشہور تالیف 'بہارِ ہند' کو دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے''۔ (29) یہ وہی زمانہ ہے جب امیر مینائی (1829-1900ء) نے بھی آٹھ جلدوں پر مشتمل اپنا ایک لغت 'امیر اللغات' کے نام سے ترتیب دیا۔ اس کی پہلی جلد (الفِ ممدودہ) مفیدِ عام پریس، آگرہ سے 1891ء میں شائع ہوئی۔ باقی چھے جلدوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ طبع نہ ہو سکیں۔ (30)

'امیر اللغات' کے بارے میں سید احمد دہلوی مولفِ 'فرہنگِ آصفیہ' کا خیال ہے کہ امیر مینائی نے اس لغت میں ہو بہو 'ارمغانِ دہلی' کا چربہ اتارا ہے۔ (31) لیکن رشید حسن خاں کے خیال میں سید احمد دہلوی کا امیر مینائی پر یہ الزام درست نہیں ہے، معاصرانہ چشمک ایسے خیال پیدا کرہی دیا کرتی ہے۔ (32) امیر مینائی نے 'بہارِ ہند' کے نام سے ایک اور لغت ترتیب دیا تھا جو نامکمل رہ گیا۔ (33)

1.3- اصلاحِ زبان اور زبان کی معیار بندی

بیسویں صدی سے قبل اصلاحِ زبانِ اردو اور اردو زبان کی معیار بندی سے متعلق بھی خاصا مواد ملتا ہے۔ اس کا سلسلہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں دہلی کے شاہ ظہور الدین حاتم

(1699-1791ء) اور مرزا مظہر جانِ جاناں (1699-1781ء) کی تحریکِ اصلاحِ زبان سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد میر تقی میر (1723-1810ء)، اور محمد رفیع سودا (1713-1781ء) بھی زبان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ (1772-1838ء) کے ہاتھوں اصلاحِ زبان کی تحریک کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اصلاحِ زبان کی ان تحریکات کے زیرِ اثر زبان کی معیار بندی عمل میں آئی، اور بہت سے پرانے الفاظ وتراکیب اور املا کی قدیم شکلوں کو متروک قرار دے کر اردو زبان کو صاف ستھرا، معیاری اور فصیح بنایا گیا۔ اس ضمن میں فرزند احمد صفیر بلگرامی (1834-1890ء) کے تذکرے 'جلوۂ خضر' کا ذکر بیجا نہ ہوگا جس میں انھوں نے اردو زبان کی اصلاحی سرگرمیوں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے، اور ان تمام الفاظ وتراکیب کی فہرست دی ہے جنھیں شاہ حاتم اور دیگر مصلحینِ زبان نے متروک قرار دے دیا تھا۔ بیسویں صدی سے قبل اردو زبان کی اصلاح و ترقی سے متعلق قدر بلگرامی (1833-1884ء) کی کتاب 'مصطلحاتِ اردو' کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا۔ اسی طرح امیر مینائی نے 'میعار الالفاظ' کے نام سے ایک رسالہ ترتیب دیا جس میں عربی فارسی کے وہ الفاظ جو غلط بولے جانے لگے تھے، ان کی تصحیح فرمائی ہے۔ یہ رسالہ 'سرمۂ بصیرت' کے نام سے بھی مشہور ہے۔

اصلاحِ زبان اور زبان کی معیار بندی کے سلسلے میں متروکات اور الفاظ کے تلفظ واملا سے قطع نظر، الفاظ کی تذکیروتانیث کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اہلِ زبان کے نزدیک اردو کے بہت سے الفاظ کی تذکیروتانیث کے بارے میں ہمیشہ اختلافِ رائے رہا ہے۔ یہ اختلاف کافی حد تک لکھنؤ اور دہلی کے دبستانی اختلاف کا نتیجہ ہے، لیکن بعض اختلافات محض زمانی ہیں، یعنی ایک لفظ کسی زمانے میں مذکر استعمال کیا گیا اور بعد کے دور میں لوگ اسے بطور مؤنث استعمال کرنے لگے یا کبھی کبھی معاملہ اس کے برعکس بھی ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی دبستان کے بعض لوگ ایک ہی لفظ کو مذکر اور بعض مؤنث بولنے لگے۔ اس موضوع پر بیسویں صدی سے قبل کئی رسالے لکھے گئے، اور بڑی بڑی لسانی بحثیں ہوئیں۔ ان رسائل میں جلال لکھنوی کا 'رسالۂ تذکیروتانیث' معروف بہ 'مفید الشعراء' (1884ء) خاص

مشہور ہوا۔ [34] اسی طرح جلال لکھنوی کے ایک مخالف سید ظہیر احسن شوق نیموی (متوفی 1904ء) کے 'رسالۂ اصلاح' کو بھی اس زمانے میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ صفیر بلگرامی کا ذکر اصلاحِ زبان اور متروکات کے ضمن میں پہلے آچکا ہے۔ انھوں نے تذکیرو تانیث کے مسئلے پر بھی غور کیا اور اس موضوع پر ایک رسالہ 'رشحاتِ صفیر' کے نام سے مرتب کیا۔ تذکیروتانیث کے اختلافات و مسائل پر ان کے علاوہ اور بھی کئی رسائل لکھے گئے، مثلاً آغا ہجو ہندی لکھنوی نے 'رسالۂ بسیط' تحریر کیا۔ شیخ امداد علی بحر لکھنوی نے 'بحرالبیان' کے نام سے ایک رسالہ ترتیب دیا اور اشرف علی اشرف لکھنوی نے 'دستور الشعراء' کے نام سے رسالۂ تذکیروتانیث تصنیف کیا۔ ان رسائل سے قطع نظر تذکیروتانیث کے اختلافات و مسائل سے متعلق بحثیں اس زمانے کی قواعد و لغت پر مشتمل کتابوں اور رسالوں میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

1.4- اردو زبان کا آغاز وارتقاء

بیسویں صدی سے قبل کا ایک اہم لسانی موضوع اردو زبان کا آغاز وارتقا بھی رہا ہے۔ اس موضوع سے متعلق میر امنؔ (1748-1806ء)، سر سید احمد خاں (1817-1898ء)، امام بخش صہبائی (1802-1857ء)، اور محمد حسین آزاد (1830-1910ء) کی تحریروں میں حوالے ملتے ہیں۔ میر امن اردو کے ارتقا کو شہنشاہ اکبر (متوفی 1605ء) کے عہد سے جوڑتے ہیں، جب کہ سر سید احمد خاں شاہجہاں (متوفی 1658ء) کے عہد کو اردو کے آغاز کا زمانہ تصور کرتے ہیں، لیکن دونوں ہی اردو کو مختلف زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

میر امن 'باغ و بہار' (1804ء) میں لکھتے ہیں:

> "جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں کے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی

مقرر ہوئی"۔ (35)

سر سید احمد خاں لکھتے ہیں:

"جب کہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلاء کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دِلّی کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہجہان آباد اس کا نام رکھا، اس وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا۔ ہر ایک کی گفتار جدا تھی۔ ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا۔ جب آپس میں معاملہ کرتے، ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا، دو لفظ اس کی زبان کے، تین لفظ دوسری کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ خود بخود ایک نئی زبان ہوگئی"۔ (36)

سر سید کا تتبع کرتے ہوئے امام بخش صہبائی بھی اردو کو شاہجہاں کے عہد کی پیداوار بتاتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ فارسی اور ہندی کے "خلط ملط" سے وجود میں آئی ہے۔ صہبائی اپنی تصنیف 'قواعدِ صرف ونحوِ اردو' (1845ء) میں لکھتے ہیں:

"شاہجہاں آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہاں نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر الفاظ میں کثرتِ استعمال کے سبب تغیر واقع ہوا، اور اس خلط ملط سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا"۔ (37)

محمد حسین آزاد نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے 'آبِ حیات' (1880ء) کے دیباچے میں یہ عبارت رقم کی:

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان، برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے"۔ (38)

اردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں یہ تمام نظریات بیسویں صدی کی جدید لسانیاتی تحقیقات کی روشنی میں 'باطل' قرار دیے جا چکے ہیں۔ یہ محض قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ ان کا کوئی لسانیاتی جواز نہیں۔

2- بیسویں صدی میں لسانی تحقیق

اردو میں لسانی مطالعہ و تحقیق کے جدید دور کا آغاز بیسویں سے ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب یورپ اور امریکہ میں لسانیاتِ جدید بالخصوص توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کی داغ بیل پڑتی ہے، اور زبانوں کے سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعے کی ابتدا ہوتی ہے۔ سائنسی مطالعے سے مراد زبان کی ساخت و ہیئت (Structure) کا منظم، باقاعدہ اور معروضی مطالعہ ہے۔ زبانوں کا اس قسم کا مطالعہ مشاہداتی و تجرباتی (Empirical)، نیز تجزیاتی (Analytical) بنیادوں پر مبنی ہوتا ہے۔ بیسویں صدی سے قبل مغرب میں زبانوں کے مطالعے کی یہ خصوصیات ناپید تھیں۔ زبانوں کا مطالعہ روایتی اور فرسودہ انداز سے کیا جاتا تھا جو کافی حد تک غیر معروضی اور قیاسی ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں عالموں کی تمام تر توجہ کلاسیکی یا ماضی میں بولی جانے والی زبانوں کی تاریخ اور ان میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں پر صرف ہوتی تھی۔ زبانوں کے اس نوع کے مطالعے کی بنیاد تحریری مواد پر قائم کی جاتی تھی، بلکہ تحریری زبان ہی کو اصل زبان تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے علی الرغم زندہ زبانوں کو یا تو بالکل نظر انداز کیا جاتا تھا یا انھیں ثانوی حیثیت دی جاتی تھی، اور ان کے مطالعے اور توضیح کی جانب عالموں کی توجہ بہت کم مبذول ہوتی تھی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ لسانیات یا لسانیاتِ جدید کا ارتقا یورپ اور امریکہ میں خودمختارانہ طور پر بیک وقت عمل میں آیا، لیکن ان دونوں مقامات پر اس کے ارتقا کا محرک اور پس منظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہا ہے۔ یورپ میں فلسفیانہ غور و فکر کی ایک شاندار روایت موجود تھی، اور لسانی مسائل پر غور و فکر کو فلسفیانہ غور و فکر کا ایک اہم جز و تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یورپ میں کلاسیکی زبانوں اور کسی حد تک جدید یورپی زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالعے کا کام بھی جاری تھا، نیز ان زبانوں کے تحریری نمونے بکثرت دستیاب تھے۔ لیکن امریکہ میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ یہاں کے تمام تر لسانیاتی مطالعات اور تحقیقات کا دار و مدار یہاں بولی جانے والی 'ریڈ انڈین' (Red Indian) زبانوں پر تھا۔ یہ

زبانیں اپنی ساخت، ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے یورپی زبانوں سے بالکل مختلف تھیں۔ ان زبانوں کے نہ تو تحریری نمونے دستیاب تھے اور نہ ہی ان سے قبل ان کا کبھی مطالعہ ہوا تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جارہی تھی، اور یہ زبانیں رفتہ رفتہ کالعدم ہوتی جارہی تھیں۔ یہ زبانیں رسمِ خط سے بھی ناآشنا تھیں۔ امریکی عالموں نے ان زبانوں کا مطالعہ ایک مخصوص نظریے کے تحت کیا جس میں عیسائیت کی تبلیغ کو خاصا دخل تھا۔ ان زبانوں کا مطالعہ تہذیبی اور بشریاتی (Anthropological) نقطۂ نظر سے بھی کیا گیا۔ یہیں سے ریڈ انڈین زبانوں کے لسانیاتی مطالعے کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ امریکہ کے اولین ماہرینِ لسانیات، مثلاً فرینز بواز (Franz Boas)، ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir) وغیرہ بنیادی طور پر ماہرینِ بشریات (Anthropologists) تھے۔

یورپ میں 1916ء میں فرڈی نینڈ ڈی سسیور (Ferdinand de Saussure) کی تصنیف *Cours de linguistique generale* کی پس ازمرگ اشاعت عمل میں آئی جو جدید لسانیات کے ارتقا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب (جو سسیور کے لکچر نوٹس کا مجموعہ ہے) فرانسیسی زبان میں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ *Course in General Linguistics* کے نام سے Wade Baskin نے کیا جو 1959ء میں نیویارک سے شائع ہوا۔ سسیور نے زبان کے مطالعے کے مروج اصول ونظریات سے انحراف کیا اور ایک نئی علمی بصیرت کے ساتھ زبان کے مطالعے کا آغاز کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کی اشاعت نے لسانیات کو ایک نئے افق سے آشنا کرایا۔ اسی لیے سسیور کو 'لسانیاتِ جدید کا باوا آدم' (Father of Modern Linguistics) کہا جاتا ہے۔ اُدھر امریکہ میں لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) نے 1933ء میں نیویارک سے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف *Language* شائع کی جس نے لسانیات کی دنیا میں ایک دھوم مچادی۔ اس کتاب کی اشاعت سے زبانوں کے مطالعے کو سائنسی قطعیت حاصل ہوئی اور لسانیات میں ایک جدید نظریے 'بیوہاریت' (Behaviourism) کو فروغ حاصل ہوا۔ بلوم فیلڈ نے لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا اور پون صدی

گزر جانے کے بعد بھی اس کے پیش کردہ نظریات لسانیات کی دنیا میں ازکاررفتہ نہ ہو سکے۔

اردو میں سائنسی طرز پر لسانیاتی مطالعہ و تحقیق کا آغاز بھی اسی دور سے ہوتا ہے اور سید محی الدین قادری زور (1904-1962ء) جنھوں نے یورپ میں رہ کر لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی دورِ جدید کے اردو کے پہلے لسانی محقق قرار پاتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زور سے پہلے بھی اردو میں زبانوں کے مطالعے کی روایت موجود رہی ہے، لیکن اسے ہم بوجوہ 'لسانیاتِ جدید' (Modern Linguistics) کا نام نہیں دے سکتے۔

2.1- قواعد نویسی

بیسوی صدی کے آغاز میں مولوی عبدالحق (1870-1961ء) کی 'قواعدِ اردو' (1914ء) منظرِ عام پر آئی۔ عبدالحق نے اس قواعد کی ترتیب میں فارسی اور عربی قواعد نویسی کو نمونہ نہیں بنایا، بلکہ اس میں خاصی ترمیم پیدا کی اور اردو زبان کے اپنے مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے انگریزی قواعد نویسی کے جدید اصولوں سے بھی استفادہ کیا۔ عبدالحق کی یہ قواعد آج بھی اردو کی سب سے جامع اور معیاری قواعد سمجھی جاتی ہے، اگرچہ یہ قواعد 'روایتی قواعد' (Traditional Grammar) ہی کے زمرے میں آتی ہے جس میں تدریسی (Pedagogical) نقطۂ نظر حاوی ہے۔ اس قواعد کا اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ اس میں اردو صرف و نحو کے تمام پہلوؤں کا بڑی خوبی کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں اجزائے کلام کی تمام قسموں اور ذیلی قسموں کا بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ملتا ہے۔ یہ قواعد اردو زبان کے عربی و فارسی عناصر کا بھی بڑی تفصیل کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔ جہاں اردو کے ہندی عناصر کا بیان آیا ہے وہاں ان کے تاریخی ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور قدیم ہندی، پراکرت اور سنسکرت میں ان کے مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس دور میں اردو قواعد اور اردو صرف و نحو کے مسائل پر کئی چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے گئے، لیکن انھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو مولوی عبدالحق کی 'قواعدِ اردو' کو حاصل

ہوئی۔ اردو صرف ونحو کے مسائل پر ایسا ہی ایک مختصر رسالہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی (1868-1936ء) نے 'اصولِ اردو' کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ قواعد 1920ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ آرزو لکھنوی (1873-1951ء) اگرچہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور 'سریلی بانسری' کی وجہ سے آج بھی ان کا نام زندہ ہے، لیکن اردو کے لسانی پہلوؤں سے بھی انھیں بیحد دلچسپی تھی۔ اردو زبان کو عربی اور فارسی کی گرفت سے آزاد کرانے کی انھوں نے جو شعوری کوششیں کیں ان سے ہر شخص واقف ہے۔ قواعدِ زبانِ اردو پر مشتمل انھوں نے ایک مختصر رسالہ بھی ترتیب دیا جو 'نظامِ اردو' کے نام سے شائع ہوا۔ اس ضمن میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی (1844-1917ء) کی اردو قواعدوں کا ذکر بھی ضروری ہے، لیکن یہ قواعدیں نہایت مختصر اور ابتدائی درجات کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی تھیں۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ ان قواعدوں کی ترتیب میں اسمٰعیل میرٹھی نے عربی صرف ونحو کا عام تتبع نہیں کیا ہے اور تقلید سے الگ ہٹ کر جدت سے کام لیا ہے۔

ان قواعدوں کے علاوہ بیسویں صدی میں چند اور اردو قواعدیں بھی شائع ہوئیں جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:(39)

1- 'مصباح القواعد' (فتح محمد جالندھری)، لاہور، 1904ء
2- 'اشرف القواعد' (محمد عبدالحی اعجاز)، امرتسر، 1912ء
3- 'خزینۃ القواعد' (سید تبارک حسن)، دہلی، 1917ء
4- 'قواعدِ اردو' (علی احمد خاں اسیر)، بدایوں، 1919ء
5- 'قواعدِ اردو' (جلال الدین حیدر)، الہ آباد، 1928ء
6- 'مرأۃ القواعد' (فتح الدین چوہدری)، لاہور، 1930ء
7- 'اردو قواعد' (سید قاسم رضا نسیم)، لکھنؤ، 1936ء
8- 'تقویم القواعد اردو' (مولوی امام الدین)، لاہور، 1951ء
9- 'نئی اردو قواعد' (خواجہ محمد صدیق)، کراچی، 1952ء
10- 'اساسِ اردو' (سید قدرت نقوی)، ملتان، 1957ء

11- 'اردو قواعد' (ابواللیث صدیقی)، لاہور، 1958ء
12- 'ہماری نئی قواعد اردو' (ابوالحامد)، کراچی، 1969ء
13- 'جامع القواعد' (ابواللیث صدیقی)، لاہور، 1971ء
14- 'اردو قواعد و انشا' (سید وقار عظیم ودیگر)، لاہور، 1977ء
15- 'نئی اردو قواعد' (عصمت جاوید)، نئی دہلی، 1981ء
16- 'اردو قواعد' (شوکت سبزواری)، کراچی، 1982ء
17- 'اردو افعال' (سونیا چرنکووا)، نئی دہلی، 1989ء
18- 'اردو زبان و قواعد' (شفیع احمد صدیقی)، 1991ء

2.2- لغت نویسی

اردو لغت نویسی کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر ہی سے ہو گیا تھا۔ بیسویں صدی میں بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے بلکہ اردو کے بعض اچھے لغات بیسویں صدی ہی میں لکھے گئے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے محسن کاکوروی کے فرزند نورالحسن نیّر کاکوروی (1924-1865ء) کا ذکر آتا ہے جنھوں نے 'نوراللغات' چار جلدوں میں مرتب کیا۔ یہ چاروں جلدیں 1924ء اور 1931ء کے درمیان لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوئیں۔ 'نوراللغات' کے بارے میں عام خیال ہے کہ نیّر کاکوروی نے یہ لغت امیر مینائی کے لغت 'امیر اللغات' سے متاثر ہو کر مرتب کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک کہ لغت نویسی کا تعلق ہے نیّر، امیر مینائی سے بہت زیادہ متاثر تھے، بلکہ انھوں نے 'امیر اللغات' ہی کو بنیاد بنا کر اپنا کام شروع کیا تھا۔ 'نوراللغات' اور 'امیر اللغات' کے تقابلی مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ان دونوں لغات میں ''الفاظ و محاورات کی ترتیب، اسناد و امثال کا انداز اور معانی و مطالب کی تفصیلات ایک جیسی ہیں۔''(40)

'نوراللغات' کے دیباچے میں مؤلف نے تدوینِ لغت سے متعلق بہت سی باتوں کا ذکر کیا ہے اور متروکات کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے، نیز لغت کی تالیف میں جن اصول و

قواعد کو پیشِ نظر رکھا ہے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر مینائی نے اردو لغت کی ترتیب کا جو کام ادھورا چھوڑا تھا اسے نیر کاکوروی نے پورا کر دکھایا۔ اسی زمانے میں عزیز لکھنوی نے 'عزیز اللغات' کے نام سے ایک لغت مرتب کیا، اور عشرت لکھنوی نے 'لغاتِ اردو' چار جلدوں میں ترتیب دیا۔ یہ چاروں جلدیں 1923ء اور 1924ء میں نامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔ لغاتِ اردو کی پہلی جلد کے شروع میں اردو کے قواعد وافعال سے بھی بحث کی گئی ہے۔ خواجہ عبدالمجید لاہوری نے 1932ء اور 1935ء کے دوران میں 'جامع اللغات' کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل اپنا لغت شائع کیا۔

سنہ 1950ء کے بعد سے اردو لغت نویسی کے میدان میں کچھ اور اہم کام ہوئے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے اپنا ایک یک جلدی لغت جو پونے چھے سو صفحات پر مشتمل ہے 'فرہنگِ اثر' کے نام سے 1961ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ دراصل اردو کا کوئی اصلی یا اورجنل لغت نہیں ہے، بلکہ 'سرمایۂ زبانِ اردو' (جلال لکھنوی) اور 'نور اللغات' (نور الحسن نیر کاکوروی) کا ناقدانہ جائزہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اور محاورات کے معاملے میں اثر بیحد راسخ العقیدہ اور سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ اس میں ان کی اپنی انا اور خودسری بھی شامل تھی۔ متذکرہ دونوں لغات میں انھیں بعض الفاظ ومحاورات محلِ نظر ٹھہرے۔ بعض الفاظ جنھیں صاحب 'نور اللغات' نے متروک قرار دے دیا تھا ان پر اثر نے اختلاف کیا۔ ان اختلافات اور مباحث نے ایک کتابی صورت اختیار کر لی جس کا نام انھوں نے 'فرہنگِ اثر' رکھا۔ بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں تدوینِ لغت کے سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ دبستانِ لکھنؤ کے ایک اسکالر سید محمد مرزا مہذب لکھنوی (1906-1985ء) نے انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنے لغت 'مہذب اللغات' کو سولہ جلدوں میں مرتب کرنے کا خاکہ تیار کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد 1958ء میں لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے دو سال بعد دوسری جلد، پھر اس کے دو سال بعد اس کی تیسری جلد شائع ہوئی۔ اس طرح 'مہذب اللغات' کی یکے بعد دیگرے تیرہ جلدیں شائع ہوئیں۔ اس کی چودھویں جلد کی ترتیب کا کام جاری تھا کہ 1985ء میں مہذب لکھنوی کا انتقال ہوگیا۔ 'مہذب اللغات' کی ترتیب کے سلسلے میں مہذب لکھنوی نے

'فرہنگِ آصفیہ'، 'امیر اللغات'، 'نور اللغات'، 'جامع اللغات' جیسے مستند لغات کو سامنے رکھا اور ان سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا۔ اس لغت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف نے الفاظ و محاورات کے معانی بیان کرنے کے بعد جگہ جگہ سند میں اشعار پیش کیے ہیں۔ الفاظ و محاورات کے سلسلے میں کہیں کہیں تو محض اپنی رائے کو اولیت دی ہے، اور خود اپنی زبان کو سند مانا ہے، اور ''قولِ فیصل'' کے عنوان سے اپنے جملے نقل کیے ہیں۔

اردو لغت نویسی کے سلسلے میں پاکستان سے شائع شدہ دو لغات 'لغتِ کبیر' اور 'اردو لغت' کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا۔ 'لغتِ کبیر' کے مرتب مولوی عبدالحق (1961-1870ء) ہیں۔ انھوں نے اس لغت کی ترتیب کا منصوبہ بہت بڑے پیمانے پر تیار کیا تھا، لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ کام صرف چار حروف، یعنی الفِ ممدودہ، الفِ مقصورہ، ب، اور بھ تک ہی پہنچ کر رک گیا۔ اس لغت پر مولوی عبدالحق نے ایک مبسوط مقدمہ بعنوان ''اردو لغات اور لغت نویسی'' بھی سپردِ قلم کیا تھا،(41) جو بقول مسعود حسین خاں ''اردو میں لغت نویسی پر یہ سب سے اہم دستاویز ہے''۔(42) 'لغتِ کبیر' کی جلدِ اول جو الفِ ممدودہ پر مشتمل ہے جمیل الدین عالی کے پیش لفظ (''حرفے چند'') اور شوکت سبزواری کے ''تعارف'' کے ساتھ 1973ء میں انجمن ترقیِ اردو (پاکستان)، کراچی سے شائع ہوئی۔ 'لغتِ کبیر' اردو کی جلد دوم (حصہ اول) جو الفِ مقصورہ پر مشتمل ہے، انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) سے 1977ء میں شائع ہوئی۔ اس جلد میں بھی جمیل الدین عالی کا ''حرفے چند'' اور شوکت سبزواری کا ''تعارف'' شامل ہے۔

پاکستان سے شائع ہونے والا دوسرا اہم اور ضخیم لغت، 'اردو لغت' ہے۔ یہ حکومت کی سرپرستی میں قائم شدہ اردو ڈکشنری بورڈ کے زیرِ اہتمام تاریخی اصولوں پر ترتیب دیا ہوا اب تک کا سب سے ضخیم اردو لغت ہے۔ اس جامع لغت کی ترتیب کا منصوبہ 'اوکسفورڈ انگلش ڈکشنری' (Oxford English Dictionary) کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا۔ اردو ڈکشنری بورڈ کو اردو لغت بورڈ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔(43) اردو لغت بورڈ سے اردو کی ممتاز علمی و ادبی شخصیتیں وابستہ رہی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، ابواللیث صدیقی، شان الحق حقی، فرمان فتح پوری، جمیل الدین عالی،

جمیل جالبی، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، شوکت سبزواری، سہیل بخاری، سید عبداللہ، یونس حسنی، رؤف پاریکھ، فہمیدہ ریاض، وغیرہ۔ مولوی عبدالحق اردو لغت بورڈ کے پہلے مدیرِ اعلیٰ تھے جنھیں اردو لغت کی ترتیب و تدوین کا خاصا تجربہ تھا۔ 'اردو لغت' بائیس (22) جلدوں پر محیط ایک جامع اردو لغت ہے، جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں باون (52) سال لگ گئے۔ اس کی بائیسویں اور آخری جلد فہمیدہ ریاض کی ادارت میں 2010ء میں مکمل ہوئی۔ اردو لغت بورڈ پاکستان کی وزارتِ تعلیم کی ایک قرارداد کے مطابق 1958ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کی پہلی جلد 1977ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد لغت ہے، جس میں دو لاکھ چونسٹھ ہزار (2,64,000) الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔ بائیس جلدوں پر مشتمل یہ عظیم اردو لغت بیس ہزار (20,000) صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ اردو زبان کا دنیا کا سب سے بڑا لغت بن گیا ہے۔ یہ فقید المثال اردو لغت 2017ء سے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔

اِدھر ہندوستان میں بھی حکومت کے قائم کردہ ادارے ترقیِ اردو بورڈ (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان/ National Council for Promotion of Urdu Language) کے زیرِ اہتمام پانچ جلدوں پر مشتمل ایک جامع اردو لغت کی تدوین کا منصوبہ 1972ء میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کام کے لیے پانچ ایڈیٹرز (Editors) کا انتخاب عمل میں آیا تھا[44] اور ہر ایڈیٹر کو ایک ریسرچ آفیسر فراہم کیا گیا تھا جو معاون کی حیثیت سے لغت کی تیاری میں ایڈیٹر کی مدد کرتا تھا۔ تقریباً دس سال تک اس طرح کا کام ہوتا رہا، لیکن خاطر خواہ پیش رفت نہ ہو سکی، چنانچہ سرکاری سطح پر یہ طے پایا کہ ایک چیف ایڈیٹر (مدیرِ اعلیٰ) مقرر کر کے باقی ماندہ سارا کام اس کی نگرانی میں دے دیا جائے۔ چنانچہ جنوری 1983ء سے مجوزہ لغت کی پانچوں جلدوں کی تدوین و تکمیل کا کام مسعود حسین خاں (جو ابتدا میں پانچ ایڈیٹرز میں سے ایک ایڈیٹر تھے) کے سپرد کر دیا گیا۔ مسعود حسین خاں ابھی تیسری جلد (د تا ع) ہی مکمل کر سکے تھے کہ مالی دشواریوں کے سبب حکومت کی جانب سے کام میں تعطل پیدا ہو گیا، اور یہ لغت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

2.3- اردو زبان کی ابتدا کی تحقیق اور تاریخی مطالعہ

بیسویں صدی میں اردو کے تاریخی و تقابلی مطالعے اور اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق نہایت اہم تحقیقی کارنامے سامنے آئے۔ اہلِ علم نے اس مسئلے پر گہری لسانیاتی بصیرت اور دقتِ نظر کے ساتھ غور وخوض کیا۔ بیسویں صدی کے ان لسانی محققین میں جنھوں نے اردو کے آغاز و ارتقا کے مسئلے پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے، سب سے پہلا نام حافظ محمود خاں شیرانی (1946-1880ء) کا ذہن میں آتا ہے۔ وہ اردو کے پہلے محقق ہیں جن کی تحقیقی لگن اور کاوش سے شمالی ہند کے اردو کے بے شمار قدیم نمونے اور متون منظرِ عام پر آئے۔ انھوں نے اردو کے قدیم لسانیاتی مواد کا تجزیہ بھی کیا اور اس کا مقابلہ پنجابی زبان سے کرنے کے بعد اردو کی ابتدا سے متعلق ایک نئے نظریے کی تشکیل کی جو 'پنجاب میں اردو' (1928ء) کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے اپنی اس گراں مایہ تحقیقی تصنیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی، اور پنجاب ہی سے ہجرت کر کے یہ دہلی پہنچی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے، اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔" (45)

شیرانی نے اپنے اس نظریے کی تشکیل بعض تاریخی حالات، اور اردو اور پنجابی زبانوں کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پر کی ہے۔ وہ پنجابی اور اردو کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> "اردو اپنی صرف ونحو سے پنجابی وملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء وافعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے، یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزاء بلکہ ان کے توابعات وملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں

زبانیں تذکیر وتانیث کے قواعد، افعالِ مرکبہ وتوابع میں متحد ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں''۔ (46)

محمود شیرانی کے اس نظریے کی تردید مسعود حسین خاں نے بڑی قطعیت کے ساتھ کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ اردو کے پنجابی زبان سے ماخوذ ہونے کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں۔ شیرانی سے قبل یہ نظریہ شیر علی خاں سرخوش اپنے تذکرے 'اعجازِ سخن' (1923ء) میں پیش کر چکے تھے، (47) لیکن جس تفصیل وتصریح اور لسانی چھان بین کے ساتھ شیرانی نے اس نظریے کو پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ سنہ 1928ء میں 'پنجاب میں اردو' کی اشاعت سے ایک سال قبل سید محی الدین قادری زور (1904-1962ء) جب اردو کے آغاز وارتقا کے موضوع پر لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیقات میں مصروف تھے تو ان کے ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی کہ ''اردو پنجاب میں بنی''۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مضمون ''اردو کی ابتدا'' (48) میں کیا ہے۔

محمود شیرانی کے بعد سید محی الدین قادری زور دوسرے اہم لسانی محقق ہیں جن کے اردو کی ابتدا سے متعلق لسانی نظریے کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ زور کا اہم تحقیقی کارنامہ ان کی گراں قدر تصنیف 'ہندوستانی لسانیات' (1932ء) ہے جس میں انھوں نے اردو کی ابتدا سے متعلق نہ صرف اپنا نظریہ پیش کیا ہے، بلکہ دکنی اردو اور شمالی ہند کی اردو کے لسانیاتی اختلافات کو بھی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ زور نے اردو کے پنجاب میں ''بننے'' کا ذکر سب سے پہلے اپنی انگریزی تصنیف *Hindustani Phonetics* میں کیا جو 1930ء میں پیرس سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد 'ہندوستانی لسانیات' (1932ء) میں انھوں نے اپنے اس نظریے کی مزید تفصیلات پیش کیں۔ زور اردو کو اس زبان پر ''مبنی'' تسلیم کرتے ہیں'' جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی''۔ وہ 'ہندوستانی لسانیات' میں لکھتے ہیں:

''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی، جب تک کہ مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت نہ بنا لیا...

......اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی''۔ (49)

اردو کے آغاز، اس کے عہد بعہد ارتقا اور اس کی لسانی تاریخ سے متعلق ایک جامع تحقیقی تصنیف مسعود حسین خاں (2010-1919ء) کی 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' ہے جو پہلی بار 1948ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے ہندوپاک میں اب تک متعدد ایڈیشن منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے انگلستان اور فرانس کی اعلیٰ دانش گاہوں میں لسانیاتِ جدید (Modern LInguistics) کی اعلیٰ تربیت حاصل کی تھی، اور امریکہ کا بھی علمی سفر کیا تھا۔ (50) وہ توضیحی لسانیات اور جدید لسانیاتی طریقِ کار سے بخوبی واقفیت رکھنے کے علاوہ، تاریخی و تقابلی لسانیات کا علم بھی رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ہند آریائی لسانیات کے بھی رمز شناس تھے۔

مسعود حسین خاں کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا، پھر وہ تنقید کی جانب مائل ہوئے، لیکن جلد ہی انھوں نے ایک ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے اپنی پہچان بنالی۔ بحیثیتِ ماہرِ لسانیات 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو'، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کا بنیادی کام ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جسے ہم اردو کا سب سے قابلِ قبول نظریہ (Most acceptable theory) کہہ سکتے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے اردو کے آغاز و ارتقا کی بحث کو خالص لسانیاتی تناظر میں رکھ کر پیش کیا ہے۔ دستیاب شدہ لسانیاتی مواد کے سائنٹفک تجزیے کے بعد انھوں نے اردو کے آغاز کے مختلف نظریوں کی بڑی خوبی کے ساتھ تنقید کی ہے، اور دہلی اور نواحِ دہلی کی ان بولیوں کی نشاندہی کی ہے جنھوں نے اردو کے آغاز و ارتقا کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بنیادی نظریے کی تشکیل کی ہے جس کی رو سے ''قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے ہیں''۔ (51) اس نظریے کا اعادہ انھوں نے اپنے ایک انگریزی مضمون ''Urdu'' میں بھی کیا ہے جو انڈیانا یونیورسٹی (امریکہ) سے شائع شدہ مجلّے *Current Trends in Linguistics* کی پانچویں جلد

Linguistics in South Asia میں 1969ء میں شائع ہوا۔[52] اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

"Old Urdu was based on the Haryani dialect of Delhi, while Modern Urdu is standardized on the basis of another Delhi dialect, known as Khadi Boli."

(= ''قدیم اردو کی اساس دہلی کی ہریانی بولی پر قائم ہے، جب کہ جدید اردو نواحِ دہلی کی ایک دوسری بولی، کھڑی بولی کی بنیادوں پر معیاری بنائی گئی ہے'')۔[53]

مسعود حسین خاں نے 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' پر نظرِ ثانی کرنے کے بعد اس کا ایک جدید ایڈیشن تیار کیا جو اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن ہے۔ یہ علی گڑھ سے 1987ء میں شائع ہوا۔ وہ اس کے بارے میں اس کتاب کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

''اب اس ساتویں اشاعت میں نہ صرف پچھلے اٹھائیس سال کی نئی معلومات کی روشنی میں اضافہ وترمیمات کی گئی ہیں، بلکہ اس کا تیسرا باب از سرِنو لکھا گیا ہے، ایک لحاظ سے یہی باب اس تحقیقی مقالے کی جان ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے ماخذ کے بارے میں تھوڑی سی نظریاتی ترمیم بھی کی گئی ہے، اور امیر خسرو کی ''نہ سپہر'' میں دی ہوئی بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست سے زبانِ ''دہلی وپیرامنش'' (دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں) کو اردو کا سرچشمہ ثابت کیا گیا''۔

جس ''نظریاتی ترمیم'' کا ذکر مسعود حسین خاں نے اپنے متذکرہ پیش لفظ میں کیا ہے اس کی رو سے اردو کی پیدائش کے سلسلے میں اب کھڑی بولی کو اولیت حاصل ہوگئی ہے، ورنہ اس سے پہلے ہریانی (ہریانوی) کو اولیت حاصل تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی [بولی] اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے''۔[54]

مسعود حسین خاں نے اردو کی پیدائش کے سلسلے میں بجا طور پر کھڑی بولی اور ہریانوی پر زور دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کا بنیادی ڈھانچا یا کینڈا کھڑی بولی پر قائم ہے اور یہی اس زبان کی اصل واساس ہے۔ ہر چند کہ قدیم دور میں اردو پر ہریانوی کے اثرات بھی پڑے ہیں اور دکنی متون سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے، لیکن جیسے جیسے اردو معیاری شکل اختیار کرتی گئی، ہریانوی کے اثرات زائل ہوتے گئے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسعود حسین خاں نے محمود شیرانی کے اس نظریے کی کہ اردو سرزمینِ پنجاب میں پیدا ہوئی بڑی خوبی کے ساتھ تنقید کی ہے اور متعدد مثالوں اور دلیلوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی کی جو خصوصیات محمود شیرانی پنجابی سے منسوب کرتے ہیں وہ ہریانوی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مسعود حسین خاں کے نزدیک قدیم اردو کا ''پنجابی پن'' اس کا ''ہریانوی پن'' بھی ہے۔

اردو کے آغاز وارتقا کے لسانی مسائل ومباحث سے دلچسپی رکھنے والوں میں شوکت سبزواری (1905-1973ء) اور گیان چند جین (1923-2007ء) کے نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ سہیل بخاری (1914-1990) نے بھی اپنے بعض مضامین اور اپنی کتاب 'اردو کا روپ' (1971ء) میں اردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں، لیکن ان میں تضاد بہت ہے۔ ان کی بعض باتیں تو محض 'مفروضہ' ہیں جنھیں 'ایجادِ بندہ' سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

اردو کی لسانی تاریخ سے متعلق شوکت سبزواری کی تحقیقی تصنیف 'اردو زبان کا ارتقا' 1956ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے آغاز کا ایک بالکل الگ نظریہ پیش کیا ہے جو اردو کے پالی زبان سے رشتے کے متعلق ہے۔ اس نظریے کی رو سے اردو کی اصل قدیم پراکرت (پہلی پراکرت) قرار پاتی ہے جس میں پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانیں شامل ہیں۔ شوکت سبزواری کا یہ نظریہ اردو زبان کی تاریخ کو کئی سو سال پیچھے ماضی کے دھندلکے میں لے جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے''۔ (55)

شوکت سبزواری کی ایک دوسری کتاب 'داستانِ زبانِ اردو' کے نام سے 1961ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے اردو کی ابتدا سے متعلق اپنے قدیم نظریے میں ترمیم پیدا کی۔ اس نظریے کی رو سے اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں گیارھویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ (56) وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو کھڑی بولی سے ترقی کر کے بنی جس کی بابت عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی تھی''۔ (57)

شوکت سبزواری کے اس نظریے سے کہ ''اردو کھڑی بولی سے ترقی کر کے بنی''، گیان چند جین کو اتفاق ہے۔ (58) وہ شوکت سبزواری کے تتبع میں کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور مغربی یوپی کی بولی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ یہ پنجاب کی زبان پنجابی کی اولاد ہے۔ اگر کھڑی بولی پنجابی سے نہیں نکلی تو اردو بھی پنجابی سے نہیں نکلی''۔ (59)

وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو، ہندی، کھڑی بولی ایک ہیں۔ اردو کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کسی قدر زیادہ اور تت سم سنسکرت الفاظ تقریباً نہیں کے برابر ہوتے ہیں، لیکن اس خصوصیت کے باعث اردو کھڑی بولی سے علاحدہ زبان نہیں ہو جاتی''۔ (60)

ان عالموں اور ماہرین لسانیات کے علاوہ سید سلیمان ندوی (1884-1953ء) نے اپنی تصنیف 'نقوشِ سلیمانی' (1939ء) میں اردو کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہونے کی بات کہی ہے۔ اسی طرح نصیر الدین ہاشمی (1895-1964ء) نے 'دکن میں اردو' (1922ء) میں، اور آمنہ خاتون نے 'دکنی کی ابتدا' (1971ء) میں اردو کا سراغ دکن میں لگانے کی بات کہی ہے لیکن ان مفروضات (نہ کہ نظریات) کو جدید لسانیاتی تحقیق کی روشنی میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

راقم السطور گذشتہ پچاس برسوں سے پیشہ ورانہ طور پر لسانیاتی تحقیق میں مصروف ہے جس میں اردو کے آغاز و ارتقا اور اس کی لسانی تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے کا اس کا ایک بنیادی تحقیقی کام 1985ء میں 'اردو کی لسانی تشکیل' کی اشاعت ہے جس کی علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب کے اب تک پانچ ایڈیشن اور متعدد ری پرنٹس (Reprints) شائع ہو چکے ہیں۔

'اردو کی لسانی تشکیل' میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ اردو نہ تو کوئی 'کھچڑی' زبان ہے، اور نہ ہی یہ 'پجن' (Pidgin) یا کری اول (Creole) ہے۔ یہ لشکری زبان بھی نہیں، بلکہ اس کی اساس کھڑی بولی پر قائم ہے جس کی سلسلہ وار ایک لسانی تاریخ موجود ہے۔

دکن کے سید حمید الدین قادری شرفی نے اپنی کتاب 'ہند آریائی اور اردو' (1986ء) میں اردو کے آغاز کے تمام نظریوں سے مدلل انداز میں بحث کی ہے اور اردو کے عہد بعہد ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ خورشید احمد صدیقی نے بھی اپنی تصنیف 'اردو زبان کا آغاز' (1993ء) میں اردو کے آغاز کے مختلف نظریوں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

سید احتشام حسین (1912-1972ء) اگرچہ ایک معروف ادبی نقاد تھے، لیکن اردو کے لسانی مسائل سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے اردو کی لسانی تاریخ ہلکے پھلکے اور نہایت سلیس انداز میں 'اردو کی کہانی' (1956ء) کے نام سے لکھی جو بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئی۔ اس کتاب کی مدد سے اردو زبان کے عہد بعہد ارتقا کو بڑی آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ احتشام حسین کا دوسرا علمی کارنامہ 'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' (1948ء) ہے جو دراصل جان بیمز (John Beams) کی انگریزی کتاب *An Outline of Indian Philology* کا ترجمہ ہے، لیکن اردو میں اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوگئی کہ اس میں احتشام حسین کا ایک نہایت وقیع اور عالمانہ مقدمہ شامل ہے جو اردو کے حوالے سے لسانی تحقیق کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اس مقدمے میں اردو کے آغاز و ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے آغاز کے نظریوں سے بھی مدلل بحث کی گئی ہے۔

اردو کے آغاز وارتقا اور اس کے نظریوں کے ذکر کے ساتھ ہندی اور اردو کے لسانیاتی رشتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی لسانیاتی (Sociolinguistic) سطح پر، نیز تہذیبی، ادبی اور رسم خط کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں ہیں، لیکن اگر خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان دونوں کا ماخذ ایک ہی زبان قرار پاتی ہے جو کھڑی بولی ہے۔ اسی لیے بول چال کی سطح پر اردو اور ہندی میں فرق کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو بول چال کی سطح پر یہ دونوں زبانیں آپس میں ضم ہو جاتی ہیں یا اپنے اصلی روپ کھڑی بولی میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اردو اور ہندی کے لسانیاتی رشتوں پر علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی کافی غور کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر سید سجاد ظہیر نے 'اردو، ہندی، ہندوستانی' (1947ء) کے نام سے ایک کتاب شائع کی، اور رام آسرا آزاد نے ''اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ'' کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ علاوہ ازیں گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، عبدالستار دلوی اور راقم السطور نے بھی اپنے بیشتر مضامین و مقالات میں اردو اور ہندی کے باہمی اشتراک و تعلق اور لسانیاتی رشتوں پر غور وفکر سے کام لیا ہے۔

اردو کے دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ رشتوں پر بھی غور وخوض کیا گیا ہے اور ان کے درمیان پائے جانے والے لسانی اشتراک و افتراق کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں امتیاز علی عرشی کی 'اردو میں پشتو کا حصہ' (1960ء)، مہر عبدالحق کی 'ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق' (1957ء)، شرف الدین اصلاحی کی 'اردو اور سندھی کے لسانی روابط' (1970ء)، اور محمد یوسف بخاری کی 'کشمیری اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ' (1982ء) جیسی مفید اور معلوماتی کتابوں کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔

2.4- اصطلاحات سازی

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو میں اصطلاحات سازی کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن (موجودہ انجمن ترقی اردو [ہند])، اور عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (دکن) کے دارالترجمہ کی خدمات لائق ستائش ہیں۔ عثمانیہ

یونیورسٹی ہندوستان کا وہ واحد ادارہ ہے جہاں 1947ء سے قبل جامعاتی سطح پر ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ یہاں اعلیٰ تعلیم کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لائق ماہرین کی رہنمائی میں سائنسی اور سماجی علوم، نیز طب اور انجینئرنگ وغیرہ کی اردو اصطلاحات کثیر تعداد میں وضع کی گئیں۔ انجمنِ ترقیِ اردو نے جس کا صدر مقام اس زمانے میں اورنگ آباد (دکن) تھا مولوی عبدالحق (آنریری سکریٹری) کی رہنمائی میں علمی اصطلاحات سازی کا کام 1917ء سے شروع ہوا اور آٹھ دس سال کے عرصے میں مختلف علوم و فنون سے متعلق ماہرین کی مدد سے کئی ہزار علمی اصطلاحات وضع کر لی گئیں جن میں سیاسیات، نفسیات، معاشیات، فلکیات، طبیعیات، نباتیات، حیاتیات، منطق، آثارِ قدیمہ، علم مثلث، الجبرا، تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ ان اصطلاحات کی اشاعت 'فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ' کے نام سے مولوی عبدالحق کے دیباچے کے ساتھ 1925ء میں عمل میں آئی۔ اس سے پہلے اس کے اجزا انجمن کے رسالے 'اردو' میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ انجمن نے مذکورہ فرہنگ کا حصۂ دوم وسوم 1940ء میں شائع کیا۔ ان میں سے بعض علوم کی اصطلاحات میں اضافے کیے گئے اور پہلے سے وضع شدہ اصطلاحات پر نظرِ ثانی کی گئی۔ عمرانیات کی اصطلاحات جو حصۂ اول میں نہیں تھیں ازسرِ نو حصۂ دوم میں شامل کی گئیں۔ انجمن نے اصطلاحات سازی سے متعلق رہنما اصول بھی مرتب کیے اور اپنے رسالے 'اردو' میں اس سے متعلق کئی مضامین شائع کیے جن میں ''علمی مصطلحات دیسی زبانوں میں'' (سید حسین بلگرامی)، ''اصطلاحاتِ علمیہ'' (عبدالرحمٰن بجنوری)، ''اصولِ وضعِ اصطلاحات'' (وحید الدین سلیم)، اور ''اردو میں علمی اصطلاحات'' (مولوی عبدالحق) خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وحید الدین سلیم (1869-1928ء) نے 'وضعِ اصطلاحات' کے نام سے اردو میں ایک کتاب بھی لکھی جو 1921ء میں انجمنِ ترقیِ اردو کی جانب سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے اصطلاحات سازی سے متعلق اصول بیان کیے ہیں اور مسائل سے بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو کی بیشمار نئی اصطلاحات وضع کیں جو اس کتاب میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اصطلاحات سازی سے متعلق انجمن ترقیِ اردو کا ایک اور اہم کارنامہ آٹھ جلدوں میں 'فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں' کی اشاعت ہے جسے مولوی ظفر الرحمٰن نے

ترتیب دیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ''اس فرہنگ کی آٹھوں جلدوں میں تقریباً ڈیڑھ سو پیشوں کی اصطلاحات اوران کے معانی ومحاورات درج ہیں جن کی مجموعی تعداد کا تخمینہ بارہ ہزار کے قریب ہے''۔ (61) اس کی پہلی جلد 1939ء میں اور آخری (آٹھویں) جلد 1944ء میں شائع ہوئی۔ ہر جلد میں الگ الگ پیشوں سے متعلق اصطلاحات درج ہیں۔

اردو میں اصطلاحات سازی سے متعلق ایک اور اہم نام پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (1866-1955ء) کا ہے۔ کیفی کو نئے نئے الفاظ وتراکیب اختراع کرنے اور نئی نئی اصطلاحات وضع کرنے میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس میدان میں وہ وحیدالدین سلیم سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ کیفی نے اردو مصطلحات میں زبردست اضافہ کیا ہے اور بعض ایسی اصطلاحات وضع کی ہیں جن کی طرف اس سے پہلے کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی۔ کیفی نے ادب، سائنس، سیاسیات، معاشیات، نفسیات، عمرانیات، جغرافیہ، اور دیگر علوم سے متعلق بے شمار اصطلاحات وضع کر ڈالیں۔ ان میں سے بعض اصطلاحات آج بھی اسی طرح رائج ہیں اور بعض متروک ہو چکی ہیں۔ کیفی نے اصطلاحات سازی پر اگرچہ کوئی کتاب نہیں لکھی، تاہم اردو زبان کی تاریخ اوراس کے انشاء واملا سے متعلق ان کی تصنیف 'کیفیہ' (1942ء) کے کئی ابواب میں انھوں نے الفاظ وتراکیب اور وضعِ اصطلاحات سے بحث کی ہے۔ (62)

حکومتِ ہند کے ادارے ترقی اردو بیورو (اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان) نے اپنے قیام 1969ء کے ابتدائی دور میں ہی اجتماعی سطح پر سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق اصطلاحات وضع کرنے کا بڑے پیمانے پر منصوبہ تیار کیا اور اس کے لیے مختلف شعبوں کے ماہرین پر مشتمل اٹھارہ (18) اصطلاحات ساز کمیٹیاں قائم کیں۔ ترقی اردو بیورو نے اس کے لیے کچھ رہنما اصول بھی وضع کیے جس میں دارالترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) کے کاموں سے بھی مدد لی گئی۔ بیورو نے اب تک جو فرہنگِ اصطلاحات شائع کی ہیں ان میں سماجیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، معاشیات، ادب اور لسانیات کی فرہنگیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام انگریزی- اردو فرہنگیں ہیں۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات 1987ء میں شائع ہوئی۔

اس کی تیاری کے لیے ماہرینِ لسانیات پر مشتمل ایک دس رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کے صدر مسعود حسین خاں تھے اور راقم السطور اس کا ایک رکن تھا۔ (63)

پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) کے زیرِ اہتمام بھی بڑے پیمانے پر اردو اصطلاحات سازی کا کام ہوا ہے۔ وہاں یہ کام انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہوا ہے، لیکن وہاں ادب اور سماجی و سائنسی علوم کے علاوہ دیگر شعبوں سے متعلق بھی فرہنگِ اصطلاحات شائع ہوئی ہیں، مثلاً اصطلاحاتِ دفتری، اصطلاحاتِ حساب داری و محاسبی، اصطلاحاتِ عدلیہ و مال گذاری، فرہنگِ اصطلاحات و محاوراتِ قانون، اصطلاحاتِ فنِ طباعت و ترسیم، اصطلاحات بیمہ کاری، اصطلاحاتِ کسٹم، اصطلاحاتِ کتب خانہ، اصطلاحاتِ برقیات وغیرہ۔ جن سماجی و سائنسی علوم کی اصطلاحات شائع ہو چکی ہیں ان میں سیاسیات، لسانیات، قانون، تعلیم، تاریخ، ارضیات و جغرافیہ، موسمیات، کیمیا، برقیات، حیوانیات، وغیرہ شامل ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کے زیرِ اہتمام اصطلاحات سازی کا کام اب بھی جاری ہے۔

2.5- اردو رسم الخط کی اصلاح اور معیار بندی

رسم الخط اور اس کے ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ بھی لسانیات کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اردو رسمِ خط کی اصلاح، صحتِ املا اور املا کی معیار بندی کے مسائل کا تعلق بھی دراصل لسانی مسائل سے ہے۔ اس مسئلے پر اہلِ علم برابر غور و خوض کرتے رہے ہیں۔ املا کے نمونوں میں عہد بعہد فرق اس کی زندہ مثال ہے۔ شاہ حاتم کی تحریکِ اصلاحِ زبان کے زیرِ اثر نہ صرف الفاظ کے ترک و اختیار کا خیال رکھا گیا، بلکہ تلفظ اور املا کی درستی پر بھی خاص زور دیا گیا۔ اردو املا کی اصلاح کی ایک اہم اور کامیاب کوشش انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (اب کولکتہ) میں کی گئی جب طباعت کی سہولیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اردو حروف کو نستعلیق ٹائپ میں ڈھالا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں دکنی متون کی بازیافت اور ایڈیٹنگ، نیز شعراء کے دواوین و کلیات اور تذکروں کی ترتیب و تدوین کے دوران مرتبین کے سامنے رسمِ خط اور املا کے بہت سے مسائل سامنے آئے۔ بیسویں صدی کے نصفِ اول میں صحتِ املا اور

املا کی معیار بندی پر خاص زور دیا گیا اور اردو رسمِ خط کی اصلاح اور سہل کاری کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی۔ اردو رسمِ خط کا علمی اور فنی نقطۂ نظر سے بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ بیشتر مضامین محض اردو رسمِ خط کی مدافعت میں شائع ہوئے۔ اردو رسمِ خط کی اصلاح اور معیار بندی کی کوششیں انفرادی طور پر بھی ہوئی ہیں اور اجتماعی طور پر بھی۔

سنہ 1950ء سے قبل جافر حسن کی 'آسان رسمِ خط' (1940ء)، محمد الیاس برنی کی 'اردو ہندی رسم الخط' (1946ء)، سید مسعود حسن رضوی ادیب کی 'اردو زبان اور اس کا رسم الخط' (1948ء)، اور عبدالقدوس ہاشمی کی 'ہمارا رسم الخط' (1949ء) جیسی اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب 'کیفیہ' (1942ء) میں اردو املا کے مسائل سے بھی بحث کی ہے۔ گذشتہ صدی کے دوران میں اردو رسمِ خط اور املا کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں میں مولوی عبدالحق، احسن مارہروی، عبدالستار صدیقی، سید ہاشمی فرید آبادی، سجاد مرزا، ہارون خاں شروانی، عبدالغفار مدھولی، آل احمد سرور، مسعود حسین خاں، فرمان فتح پوری، گوپی چند نارنگ، رشید حسن خاں، ابو محمد سحر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اس ضمن میں رشید حسن خاں کی ضخیم کتاب 'اردو املا' (1974ء) کا بہ طور خاص ذکر کرنا چاہوں گا جو اس عہد کی علمی ولسانی تحقیق کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ گوپی چند نارنگ کا مرتب کردہ 'املا نامہ' (1974ء) بھی اردو املا کی معیار بندی سے متعلق ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو املا کی اصلاح اور اس کے اختلافی مسائل پر ابو محمد سحر نے بھی قلم اٹھایا اور 'اردو املا اور اس کی اصلاح' (1982ء) کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اسی طرح راقم السطور نے بھی تدریسی نقطۂ نظر سے اردو رسم خط اور املا کا تجزیہ اپنی کتاب 'آیئے اردو سیکھیں' (1987ء) میں پیش کیا۔

ہندوستان میں اردو املا کی اصلاح اور معیار بندی کے سلسلے میں اجتماعی کوشش سب سے پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے ہوئی۔ مولوی عبدالحق کی سکریٹری شپ کے زمانے میں انجمنِ ترقی اردو نے 1943ء میں ایک اصلاحِ رسم خط کمیٹی مقرر کی۔ سید ہاشمی فرید آبادی کی ابتدائی تجاویز پر غور کرنے کے لیے اس کمیٹی کی میٹنگ 21 مارچ 1943ء کو دہلی میں انجمن

کے دفتر میں ہوئی جس میں مولوی عبدالحق، سید ہاشمی فرید آبادی، عبدالستار صدیقی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور وہاج الدین کنتوری نے شرکت کی۔ کمیٹی کی تجاویز جن کے مرتب عبدالستار صدیقی تھے، 16 ستمبر 1943ء کے 'ہماری زبان' میں شائع کی گئیں۔ 21 جنوری 1944ء کو کل ہند اردو کانفرنس، ناگپور کی رسمِ خط کی مجلس نے ترمیم و اضافے کے بعد ان کو منظوری دی اور یہ تجاویز جنوری 1944ء کے رسالہ 'اردو' میں شائع ہوئیں۔ (64) لیکن انجمن کی ان تجاویز کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ تقریباً بارہ سال بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے رسم خط کی اصلاح کی جانب اپنی توجہ پھر مبذول کی۔ اس مرتبہ آل احمد سرور انجمن کے آنریری سکریٹری تھے۔ انھوں نے 1956ء میں اردو رسم خط اور املا کی اصلاح کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ ایک سوالنامہ بھی ترتیب دیا گیا جس کے ذریعے رسمِ خط اور املا میں اصلاح اور ٹائپ اختیار کرنے کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کی گئی۔ بقولِ ابو محمد سحر ''رسم خط اور املا کی اصلاح کے مقاصد جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن اتنا ماننا پڑے گا کہ آزادی کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے اس معاملے میں انتہا پسندی سے کام نہیں لیا، اور جو اصلاحیں نامعقول ہو چکی تھیں ان کو چلانے کی ضد نہیں کی''۔ (65)

اردو املا اور معیار بندی کی دوسری اجتماعی کوشش 1969ء میں حکومتِ ہند کے زیر انتظام ترقیِ اردو بورڈ (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کے قیام کے بعد کی گئی۔ چوں کہ بورڈ کا بنیادی کام اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری اور بعض درسی کتب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانا تھا، اس لیے اردو کے معیاری املا کو سامنے رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ اردو املا کے متعلق بعض امور کو طے کرنے کے لیے ترقی اردو بورڈ نے 1973ء میں ایک املا کمیٹی مقرر کی جس کے صدر سید عابد حسین تھے اور اراکین میں گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں بھی شامل تھے۔ کمیٹی نے اپنی کئی نشستوں میں اردو املا کے مسائل اور اس کی معیار بندی پر غور کیا اور اب تک اس سلسلے میں جو کچھ بھی کام ہو چکا تھا اسے بھی سامنے رکھا اور بحث و تمحیص کے بعد املا سے متعلق متفقہ طور پر ٹھوس سفارشات مرتب کیں۔ سفارشات مرتب کرتے وقت چند رہنما اصول بھی املا کمیٹی کے پیش نظر رہے۔ گوپی چند نارنگ نے سفارشات کے سلسلے میں اس امر کا

بھی اعتراف کیا ہے کہ ''ان میں زیادہ تر ان اصلاحات کو اپنایا گیا ہے جو انجمن کی کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط نے پیش کی تھیں''۔ (66) املا کمیٹی کی سفارشات گوپی چند نارنگ نے 'املا نامہ' کے نام سے مرتب کر کے 1974ء میں شائع کیں۔ 'املا نامہ' کا دوسرا نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن 1995ء میں شائع ہوا۔

اردو رسمِ خط اور املا کے مسائل پر پاکستان میں بھی غور و خوض ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان کے زیرِ اہتمام اردو املا اور رموزِ اوقاف کے مسائل کے موضوع پر جون 1985ء میں ایک سہ روزہ سمینار منعقد ہوا جس کی تمام کاروائی اور پڑھے گئے مقالات کو اعجاز راہی نے 'املا و رموزِ اوقاف کے مسائل' (1985ء) کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ بقول اعجاز راہی ''اس سمینار کا بنیادی مقصد اردو املا اور رموزِ اوقاف کے استعمال میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ایسے اصول وضع کرنا تھا جنھیں اہلِ علم و ادب ہی نہیں، بلکہ عام لوگ بھی اپنا سکیں''۔ (67) اس سمینار کے چار اجلاسوں میں مقالے پڑھے گئے اور بحثیں ہوئیں۔ پانچواں اجلاس سفارشات کے لیے وقف تھا۔ کل ملا کر 14 سفارشات پیش کی گئیں، لیکن چوں کہ یہ ''مفصل'' نہیں تھیں، لہٰذا ان کی تفصیلات مرتب کرنے کے لیے حسبِ ذیل اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی: فرمان فتح پوری، شریف کنجاہی، مظفر علی سید، خواجہ محمد زکریا، ممتاز منگلوری اور محمد صدیق خاں شبلی۔ گوپی چند نارنگ کی اطلاع کے مطابق ''اس کمیٹی کے اجلاس اکتوبر 1985ء میں راولپنڈی میں منعقد ہوئے۔ سمینار کی سفارشات پر غور کیا گیا اور ہر سفارش کے بعد مثالیں درج کی گئیں، اور بعض مسائل جو پہلے پیش کی گئی سفارشات میں شامل نہیں تھے، انھیں بھی زیرِ بحث لا کر کل 24 سفارشات منظور کی گئیں''۔ (68) علاوہ ازیں مقتدرہ قومی زبان نے اردو رسمِ خط اور املا کی معیار بندی پر کئی کتابیں شائع کیں جن میں 'اردو رسم الخط' (سید محمد سلیم)، 'اردو رسم الخط کے بنیادی مباحث' (سہیل بخاری)، 'اردو املا و قواعد: مسائل و مباحث' (فرمان فتح پوری)، 'اردو املا و رموزِ اوقاف' (مرتبہ گوہر نوشاہی)، اور 'اردو رسم الخط' (مرتبہ شیما مجید) خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

3- اردو میں جدید لسانیاتی تحقیق

3.1- لسانیاتِ جدید کی ابتدا

ہندوستان میں لسانیاتِ جدید (Mordern Linguistics) کا فروغ 1953ء میں پونا میں لسانیات کے مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں کے آغاز سے ہوتا ہے اور یہیں سے خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو زبان کے مطالعے کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس کے بعد سے بشمولِ علی گڑھ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں لسانیات کے شعبے قائم ہوتے ہیں (اگرچہ کلکتہ یونیورسٹی اور دکن کالج، پونا میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم کا پہلے سے انتظام موجود تھا)۔ سنہ 1953ء کے بعد سے لسانیات کے میدان میں جو بھی کام ہوا ہے اس میں پونا کے گرما اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے لسانیات کے سند یافتگان ہی پیش پیش رہے ہیں۔ (69)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ زبان کے لسانیاتی مطالعے کے دو خاص پہلو ہیں: تاریخی اور توضیحی۔ زبان کے تاریخی (اور تقابلی) مطالعے کی ابتدا اٹھارھویں صدی کے اواخر سے ہوتی ہے جب سر ولیم جونز (Sir William Jones) رایل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے ایک جلسے میں 27/ستمبر 1786ء کو اپنا معرکۃ الآرا مقالہ پیش کرتا ہے۔ انیسویں صدی میں تاریخی لسانیات کا علم اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کا ارتقاعمل میں آتا ہے اور فرڈی نینڈ ڈی سسیو (Ferdinand de Saussure) کی کتاب *Course in General Linguistics* (جو اس کی وفات کے بعد اس کے شاگردوں نے اس کے لکچر نوٹس کی مدد سے ترتیب دے کر 1916ء میں شائع کی)، یورپ میں توضیحی لسانیات کے فروغ میں نشانِ راہ قرار پاتی ہے۔

تاریخی لسانیات کسی زبان کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں رونما ہونے والی لسانیاتی تبدیلیوں سے سروکار رکھتی ہے، جب کہ توضیحی لسانیات کسی زبان کی کسی ایک وقت میں پائی جانے والی حالت کو بیان کرتی ہے۔ بیسویں صدی میں عالموں کی توجہ 'لسانیاتی تبدیلیوں' (Linguistic Change) سے ہٹ کر 'لسانیاتی توضیح' (Linguistic

(Description) کی جانب منعطف ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز کے دوران امریکہ میں بشریات (Anthropology) کی ایک شاخ کے طور پر رفتہ رفتہ لسانیاتِ جدید کا ارتقا عمل میں آیا، اور لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) کی جامع تصنیف *Language* کی نیویارک سے 1933ء میں اشاعت نے زبانوں کے توضیحی مطالعے کے لیے راہ ہموار کردی۔

توضیحی لسانیات کی پانچ شاخیں ہیں: 1) صوتیات (Phonetics)، 2) تجز صوتیات (Phonemics)، 3) صَرف یا تشکیلیات (Morphology)، 4) نحو یا نحویات (Syntax)، اور معنیات (Semantics)۔ صوتیات تکلمی آوازوں کے مطالعے کا نام ہے، جس میں 'اعضائے تکلم' (Organs of Speech) کی ہیئت وحرکت کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ تکلمی اصوات کی باہمی بامعنی ترتیب وتنظیم کو تجز صوتیات کہتے ہیں۔ صَرف یا تشکیلیات الفاظ کی تشکیل وتعمیر کا نام ہے۔ نحو یا نحویات توضیحی لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں جملوں کی تشکیل کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور معنیات معنی کا مطالعہ ہے۔ اکثر صوتیات اور تجز صوتیات کو ملا کر 'علم الاصوات' (Phonology) کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح صرف اور نحو کو ملا کر 'قواعد' (Grammar) کہتے ہیں۔

توضیحی لسانیات کی ان شاخوں کے علاوہ لسانیات کی چند اور شاخیں بھی ہیں جو زبان کو باہر کی دنیا سے جوڑتی ہیں، مثلاً نفسیاتی لسانیات (Psycholinguistics) جو زبان اور انسانی ذہن کی کارفرمائی کے مطالعے کا نام ہے، سماجی لسانیات (Sociolinguistics) جو سماج کے حوالے سے زبان کے مطالعے کا نام ہے، اطلاقی لسانیات (Applied Linguistics) جس میں زبان کی درس وتدریس نیز ادب کے مطالعے اور ترجمہ نگاری میں لسانیات کے اطلاق سے کام لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بشریاتی لسانیات (Anthropological Linguistics) ہے جو زبان کا مطالعہ متنوع تہذیبی تناظر میں کرتی ہے، اور فلسفیانہ لسانیات (Philosophical Linguistics) ہے جو زبان اور منطقی فکر کے درمیان رشتے کا نام ہے۔ سنہ 1953ء کے بعد سے اردو میں ان میں سے بیشتر میدانوں میں کام ہوا ہے۔

3.2- عمومی لسانیات

بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں اردو میں ایسی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں عمومی لسانیات (General Linguistics) کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ عمومی لسانیات میں لسانیات اور اس کے تمام شعبوں کی مبادیات سے بحث کی جاتی ہے، نیز اس کی تمام ترجہات و ابعاد کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ عمومی لسانیات کو علمِ لسانیات اور اس کے تمام پہلوؤں کا ایک جامع تعارف بھی کہا جا سکتا ہے۔ عمومی لسانیات پر اردو میں شائع ہونے والی غالباً سب سے پہلی کتاب عبدالقادر سروری کی 'زبان اور علمِ زبان' (1956ء) ہے جس میں زبان اور اس کی ماہیت، زبان کے آغاز و ارتقا، علم زبان اور اس کی شاخوں (مثلاً صوتیات، تجزِ صوتیات، تشکیلیات، نحو اور معنیات) سے بحث کی گئی ہے۔ نیز اس کتاب میں تاریخی طریقِ کار، زبانوں کی خاندانی تقسیم اور ہندوستان کی زبانوں کا مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں آخر کے دو ابواب میں علمِ زبان کی تاریخ اور تحریر کے آغاز و ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ایسے وقت میں لکھی گئی تھی جب اردو میں لسانیاتِ جدید کی ابھی صرف ابتدا ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موضوعی اعتبار سے اس کتاب کو اردو میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن اب جب کہ لسانیات کا علم کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے، یہ کتاب عمومی لسانیات کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ ایک دوسرا مسئلہ اس کتاب میں لسانیاتی اصطلاحات کا بھی ہے۔ جس زمانے میں عبدالقادر سروری نے یہ کتاب لکھی تھی، اس وقت اردو میں لسانیاتی اصطلاحات اتنی عام نہیں ہوئی تھیں، بلکہ یہ اصطلاحات سرے سے اردو میں تھیں ہی نہیں۔ سروری کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی اور عربی کا سہارا لے کر اردو میں لسانیاتی اصطلاحات وضع کیں اور اس کتاب میں پہلی بار استعمال کیں۔ ان میں سے بعض اصطلاحات آج بھی مروج ہیں، لیکن بعض اصطلاحات انھوں نے ایسی وضع کیں جو چل نہ سکیں۔ 'زبان اور علمِ زبان' نظرِ ثانی کے بعد دوسری بار 1970ء میں شائع ہوئی۔

عمومی لسانیات پر دوسری اہم کتاب گیان چند جین کی 'عام لسانیات' ہے جو ترقی اردو

بیورو کی جانب سے 1985ء میں شائع ہوئی، لیکن اس سے قبل ان کی ایک اور کتاب 1973ء میں اسی بیورو کی جانب سے 'لسانی مطالعے' کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں زبان کا آغاز، زبان اور علمِ زبان، زبان اور بولی، اردو صوتیات، رسمِ خط کے مسائل، اور اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ جیسے موضوعات پر مقالات شامل تھے۔ یہ کتاب لسانیات سے شغف رکھنے والے طلبہ اور عام اردوداں حلقے میں بیحد مقبول ہوئی تھی، چنانچہ پانچ سال بعد 1979ء میں ترقیِ اردو بیورو کو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ پھر اس کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔

'عام لسانیات' (1985ء) کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ گیان چند جین کی ایک اہم اور بھاری بھرکم کتاب ہے۔[70] اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب کافی چھان بین اور گہرے مطالعے اور غور وفکر کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس میں لسانیات کے تمام شعبوں کی مبادیات سے بحث کی گئی ہے، نیز لسانیات کے میدان میں جو جدید رجحانات سامنے آئے ہیں ان کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ لسانیات کے نصاب میں درسی کتاب کی حیثیت سے اس کی شمولیت طلبہ کے لیے بیحد مفید وسودمند ثابت ہوسکتی ہے۔

عمومی لسانیات سے متعلق شوکت سبزواری کی 'اردو لسانیات' (1966ء)، اقتدار حسین خاں کی 'لسانیات کے بنیادی اصول' (1985ء)، اور خلیل صدیقی کی 'زبان کیا ہے؟' (1989ء) کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا۔ 'اردو لسانیات' شوکت سبزواری کے تاریخی اور توضیحی لسانیات پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین لسانیات کے صرف چند پہلوؤں کا ہی احاطہ کرتے ہیں، لہٰذا یہ کتاب عمومی لسانیات کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا نہیں کرتی۔ دوسری کتاب 'لسانیات کے بنیادی اصول' جدید لسانیاتی تناظر کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں اقتدار حسین خاں نے لسانیات کی تعریف سے لے کر توضیحی لسانیات کی تمام شاخوں، نیز تبادلی قواعد اور تاریخی لسانیات کا ایک اچھا تعارف پیش کیا ہے۔ خلیل صدیقی کی کتاب 'زبان کیا ہے؟' 1989ء میں ملتان سے شائع ہوئی، لیکن عمومی لسانیات کے نقطۂ نظر سے یہ ایک ادھوری کتاب ہے، کیوں کہ اس میں زبان کے تاریخی پہلوؤں اور خاندانِ السنہ کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا ہے، نیز زبان کی تعریف، ماہیت، نظام اور آغاز وغیرہ سے بھی بحث کی گئی

ہے، لیکن توضیحی لسانیات پر اس کتاب میں مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اردو میں وضع کی گئی جدید لسانیاتی اصطلاحات سے بہت کم واقفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ تر انگریزی اصطلاحوں سے ہی کام لیتے ہیں۔

شوکت سبزواری اور خلیل صدیقی کے بعد پاکستان میں زبان اور علمِ زبان کے موضوع پر معروضی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ایک قابلِ قدر کتاب فائزہ بٹ کی 'اردو میں لسانی تحقیق' ہے جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور سے 2017ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی مسائل و مباحث پر فائزہ کی نظر بہت گہری ہے، اور اس ضمن میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ لسانیات کی تاریخ اور اس کی مبادیات کو قلم بند کیا ہے۔ فائزہ بٹ نے اس کتاب میں زبان کی پیدائش نیز لسانیات کے آغاز و ارتقا اور اس کے مختلف شعبوں اور جہتوں کا فاضلانہ محاکمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں اردو لسانیات کے ارتقا پر بھی تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ فائزہ بٹ کا 700 صفحات سے زائد پر پھیلا ہوا یہ لسانیاتی تحقیقی کام پاکستان میں اپنی نوعیت کا غالباً پہلا کام ہے جو مستقبل کے تحقیق کاروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

3.3- علم الاصوات

توضیحی لسانیات کی پانچ سطحیں ہیں۔ ان میں سے پہلی سطح 'صوتیات' (Phonetics) ہے جو تکلمی آوازوں کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ اس میں اعضائے تکلم کی حرکت سے پیدا کی جانے والی تکلمی آوازوں اور ان کے مخارج نیز ان کی درجہ بندی سے بحث کی جاتی ہے۔ توضیحی لسانیات کی دوسری سطح تجزِ صوتیات (Phonemics) ہے۔ اس میں تکلمی آوازوں کی چھان بین، نیز ممیز آوازوں یعنی صوتیوں (Phonemes) کی شناخت اور ان کی ترتیب و تنظیم سے بحث کی جاتی ہے۔ صوتیات اور تجزِ صوتیات کو ملا کر علم الاصوات (Phonology) کا نام دیا گیا ہے۔ اردو کے صوتیاتی مسائل پر لکھنے والوں میں مسعود حسین خاں، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، ابواللیث صدیقی، شوکت سبزواری اور سہیل بخاری وغیرہ کے نام خصوصیت

کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کے صوتیاتی مسائل پر اولاً مسعود حسین خاں نے لکھنا شروع کیا۔ ان کا مضمون ''اردو حروفِ تہجی کی صوتیاتی ترتیب'' اگست 1954ء کے رسالہ 'ہمایوں' (لاہور) میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ان کی کتاب 'اردو زبان اور ادب' میں بھی شامل ہے۔ ان کا ایک اور مضمون ''اردو صوتیات کا خاکہ'' ان کی ایک دوسری کتاب 'شعر و زبان' (1966ء) میں شامل ہے۔ صوتیات اور تجز صوتیات کے موضوع پر ان کا گراں قدر علمی کارنامہ 'اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ' (انگریزی) ہے۔ یہ دراصل وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں 1953ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ (D.Lit.) کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ یہ پہلی بار "A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu" کے نام سے 1954ء میں شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ راقم السطور نے 'اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ' کے نام سے کیا جو 1986ء میں شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس کتاب میں اردو کے حوالے سے صوتیات کے 'عروضی' (Prosodic) نظریے سے بحث کی گئی ہے جسے برطانوی دبستانِ لسانیات کے سرخیل جے. آر. فرتھ (J.R.Firth) نے فروغ دیا تھا۔

مسعود حسین خاں کے بعد اردو صوتیات پر جن عالموں نے انہماک کے ساتھ کام کیا ان میں گیان چند جین کا نام سرِ فہرست ہے۔ جین کے اردو صوتیات سے متعلق مضامین ان کی کتاب 'لسانی مطالعے' (1973ء) میں شامل ہیں جن میں اردو کے مصمتوں، مصوتوں، جڑواں مصوتوں، غنائی اصوات، صوت رکن اور اردو میں بل اور زور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ''اردو کی ہکاری آوازیں اور حروف'' بھی ان کا ایک عالمانہ مضمون ہے جو ان کی کتاب 'کھوج' (1990ء) میں شامل ہے۔

گوپی چند نارنگ نے بھی اردو صوتیات پر کئی اہم مضامین لکھے ہیں جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں: ''اردو کی آوازیں'' (مطبوعہ 'اردو نامہ' [کراچی]، جولائی 1962ء)، ''اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں'' (مطبوعہ 'اردو نامہ' [کراچی]، اکتوبر 1963ء)، ''اردو مصوتوں کی درجہ بندی''

(مشمولہ 'ارمغانِ مالک رام' [نئی دہلی]، 1971ء)۔ ابواللیث صدیقی نے بھی اپنے بعض مضامین میں اردو کے صوتی نظام کا تجزیہ پیش کیا ہے اور لسانی تغیرات سے بحث کی ہے۔ ان کے یہ مضامین 'ادب ولسانیات' (کراچی)، 'نگارِ پاکستان' (کراچی) اور 'فنون' (لاہور) وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ صوتیات کے موضوع پر شوکت سبزواری کے مضامین بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعض مضامین یہ ہیں: ''اردو کے صوتیے'' (مطبوعہ 'اردو نامہ'، جنوری 1964ء)، ''اردو کی مستعار آوازیں'' (مطبوعہ 'اردو نامہ'، اپریل 1967ء)، ''اردو کی غنہ آوازیں'' ('تحریک'، اکتوبر 1966ء)، ''اردو نظامِ اصوات و علامات: جدید صوتیات کی روشنی میں'' ('صحیفہ'، اپریل 1963ء)، ''اردو مصوتے اور ان کی صفات'' (مطبوعہ 'اردو نامہ'، جنوری 1967ء)، ''اردو کی آوازیں'' (مطبوعہ 'اردو نامہ'، اکتوبر 1966ء)، وغیرہ۔

3.4- قواعد نویسی

صوتیات کے بعد توضیحی لسانیات کی دوسری سطح صَرف یا تشکیلیات (Morphology) اور تیسری سطح نحو (Syntax) ہے۔ صرف اور نحو کے مجموعے کو 'قواعد' (Grammar) کہتے ہیں۔ جدید لسانیات کی روشنی میں اردو میں صَرف ونحو یا قواعد پر بہت کم کام ہوا ہے۔ مولوی عبدالحق کی 'قواعدِ اردو' اور اس قبیل کی دوسری تمام اردو قواعدیں جو درسی ضروریات کے پیشِ نظر لکھی گئی ہیں (جن کی تعداد کم نہیں) روایتی طرز کی ہیں۔ جدید لسانیات کی روشنی میں اور خالص توضیحی طرز پر لکھی جانے والی قواعدیں اردو میں بہت کم ہیں۔ اس ضمن میں عصمت جاوید کی 'نئی اردو قواعد' (1981ء) کا ذکر سب سے پہلے کیا جانا چاہیے جو اردو کی سب سے پہلی توضیحی قواعد (Descriptive Grammar) ہے۔ اس میں زبان کی توضیح لسانیاتِ جدید کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس قواعد میں ہمیں پہلی بار نئے لسانیاتی مباحث ملتے ہیں۔ توضیحی قواعد روایتی قواعد (Traditional Grammar) سے کئی معنی میں مختلف ہوتی ہے۔ توضیحی قواعد صرف زبان کی توضیح (Description) پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے، معیارِ صحت قائم نہیں کرتی۔ روایتی قواعد ہدایتی (Prescriptive) اور امتناعی (Proscriptive)

ہوتی ہے جو زبان کو بولنے اور لکھنے کے قوانین وضع کرتی ہے۔ توضیحی قواعد زبان کو بولنے اور لکھنے کے قوانین وضع نہیں کرتی، بلکہ صرف اس کے اصول دریافت کرتی ہے۔ روایتی قواعد 'حرف' کو بنیاد مانتی ہے اور 'صوت' سے صرفِ نظر کرتی ہے، جب کہ توضیحی قواعد میں زبان کے تکلمی یا تقریری پہلو کو اہمیت دی جاتی ہے۔ روایتی قواعد میں 'معنی' کو اولیت دی جاتی ہے، جب کہ توضیحی قواعد میں اجزائے کلام کی معنوی تعریفوں سے گریز کیا جاتا ہے۔ عصمت جاوید کی 'نئی اردو قواعد' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں پہلی بار روایتی قواعد نویسی سے انحراف کرتے ہوئے زبان کی محض توضیح سے کام لیا گیا ہے، اور روایتی قواعد کے علی الرغم 'حرف' کے بجائے 'صوت' کو زبان کی بنیاد مان کر بحث کا آغاز کیا گیا ہے۔ یہی اس کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا حصہ 'صرف' سے متعلق ہے جس میں الفاظ کی ہیئتی اقسام اور ان کے پابند روپوں (Bound forms) سے بحث کی گئی ہے، نیز الفاظ کی درجہ بندی اور ان کی تصریف اور اشتقاق پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے تیسرے حصے کا تعلق نحو سے ہے جس میں جملے کی ساخت اور اردو جملوں کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ چوتھا حصہ مشتقات و مرکبات اور تشکیل الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اردو کے لسانی مزاج کی بھرپور عکاسی کرتی ہے اور اردو میں جدید لسانیات کی روشنی میں لکھی گئی پہلی توضیحی قواعد ہے۔

جدید لسانیاتی نقطۂ نظر سے اردو قواعد کی ترتیب کا کام اقتدار حسین خاں نے بھی انجام دیا ہے۔ ان کی کتاب 'اردو صرف ونحو' 1985ء میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کی جانب سے شائع ہوئی۔ اس میں انگریزی کے توضیحی ماڈل کو سامنے رکھ کر اردو کی توضیح بیان کی گئی ہے۔ اردو کے حوالے سے صرف اور نحو کے تمام پہلوؤں کا توضیحی لسانیات کی روشنی میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اردو کے حوالے سے 'تبادلی قواعد' (Transformational Grammar) کا ماڈل بھی پیش کیا گیا ہے۔ اردو کو تبادلی قواعد کی طرز پر ڈھالنے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

اردو قواعد کے بعض پہلوؤں پر روسی اسکالرز نے بھی بہت عمدہ کام کیے ہیں۔ سونیا چرنیکووا اردو کی ایک ایسی ہی روسی اسکالر ہیں جن کی اردو قواعد سے متعلق اردو زبان میں اب تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب 'اردو کے صیغے' ماسکو سے 1996ء میں

شائع ہوئی تھی، اور دوسری کتاب 'اردو افعال' ان کے ہندوستان میں قیام کے دوران میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے 1989ء میں شائع ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں سونیا چرنیکووا کی اردو قواعد سے دلچسپی کا بین ثبوت ہیں۔ اردو افعال کا توضیحی تجزیہ جس شرح وبسط کے ساتھ سونیا چرنیکووا کی کتاب 'اردو افعال' (1989ء) میں ملتا ہے، وہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ افعال کو کسی زبان کی قواعد میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے، تاہم قواعد نویسوں نے افعال اور فعلی صیغوں کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ سونیا نے اپنی اس کتاب میں افعال کے 52 صیغوں کا توضیحی تجزیہ پیش کیا ہے جن میں حال کے 14، ماضی کے 29 اور مستقبل کے 9 صیغے شامل ہیں۔ ہر صیغے کو انھوں نے کوئی نہ کوئی نام دیا ہے اور اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ سند کے طور پر انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی، رسوا، مرزا فرحت اللہ بیگ، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، منشی پریم چند، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے اربابِ قلم کی نگارشات سے مثالیں پیش کی ہیں۔ سونیا چرنیکووا کی یہ کتاب بلاشبہ اردو قواعد نویسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

روایتی انداز سے ہٹ کر ترتیب دی جانے والی ایک اور قواعد بھی ہے جسے 'اردو قواعد' کہتے ہیں۔ یہ شوکت سبزواری کی تصنیف ہے جو مشفق خواجہ کے پیش لفظ کے ساتھ مکتبۂ اسلوب، کراچی کی جانب سے 1982ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اردو زبان کے اصول و قواعد، اس کے مزاج و منہاج کو سامنے رکھ کر مرتب کیے گئے ہیں۔ اس میں قواعد کے صرف حصۂ صرف کا بیان ملتا ہے جو بڑی حد تک ادھورا ہے۔ نحو سے متعلق اس کتاب میں کچھ بھی نہیں پایا جاتا، تاہم جدید لسانیاتی تناظر میں لکھی جانے کی وجہ سے اس کی بیحد اہمیت ہے۔ توضیحی قواعد کی رو سے اسم کی اس میں صرف دو حالتیں بیان کی گئی ہیں، یعنی قائم (Direct) اور محرف (Oblique)، جب کہ روایتی قواعد میں سنسکرت کی طرز پر اسم کی آٹھ حالتیں، یعنی فاعلی، مفعولی، مفعولی ثانوی، آلی، مجروری، اضافی، ظرفی اور ندائی بیان کی جاتی ہیں۔

اردو قواعد کے بعض مسائل پر جدید لسانیاتی انداز سے روشنی ڈالنے والوں میں گوپی چند

نارنگ، ابواللیث صدیقی، فرمان فتح پوری، رشید حسن خاں، نیّر اقبال اور عطش درانی وغیرہ کے نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

3.5- معنیات

معنیات (Semantics) توضیحی لسانیات کی پانچویں اور آخری سطح ہے۔ اس میں معنی کا سائنسی طور سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ معنی زبان کا ایک پیچیدہ نظام ہے جس کی جڑیں سلسلہ در سلسلہ فلسفہ، منطق، نفسیات اور دیگر علوم تک پھیلی ہوئی ہیں۔ معنی کی بیشمار تعریفیں بیان کی گئی ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے اس کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ بعض ماہرین لسانیات زبان کے ہیئتی مطالعے میں معنی کے تصور سے کام نہیں لیتے، مثلاً لیونارڈ بلوم فیلڈ زبان کی صرف بالائی ساخت یا اس کی ظاہری ہیئت کی قطع کاری (Segmentation) اور درجہ بندی کے عمل پر زور دیتا ہے اور زبان کی زیریں ساخت (Deep strucutre) یا معنی سے صرفِ نظر کرتا ہے، لیکن بعد کے دور میں زبان کے مطالعے اور تجزیے میں معنی کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً بلوم فیلڈ کے بعد دوسرے بڑے ماہرِ لسانیات نوام چومسکی (Noam Chomsky) نے قواعد کی توضیح میں جملے کی بالائی ساخت (Surface strucure) کے علاوہ اس کی زیریں ساخت یا سطح کو بھی تسلیم کیا ہے، اور معنی کو کسی زبان کی قواعد کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ اب کسی ماہرِ لسانیات یا قواعد نویس کے لیے زبان کے مطالعے اور تجزیے میں معنی سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔

اردو میں معنیات کے مطالعے کی طرف عالموں کی بہت کم توجہ مبذول ہوئی ہے۔ معنیاتی مسائل و مباحث پر اردو میں اب تک کوئی باقاعدہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اس موضوع سے متعلق اردو میں مضامین بھی شاذ و نادر ہی لکھے گئے ہیں۔ البتہ عمومی لسانیات کی کتابوں میں معنیات پر ابواب اور بحثیں ضرور مل جاتی ہیں۔ مثلاً 'زبان اور علم زبان' (عبدالقادر سروری) اور 'عام لسانیات' (گیان چند جین) میں معنیات کے بھی ابواب قائم کیے گئے ہیں اور معنی کی تعریفوں کے علاوہ صوت و معنی کا تعلق، معنی کا ارتقا، کثیر معنویت، معنیاتی تبدیلی،

معنیاتی توسیع وتحدید، ترادفات اور تاریخی معنیات جیسے مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔

4 - اطلاقی لسانیاتی تحقیق

جیسے جیسے لسانیات کا علم ترقی کرتا گیا، اس کی افادیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا، چنانچہ لسانیاتی نظریات وتصورات اور لسانیاتی طریقہ ہائے کار، نیز لسانیاتی مطالعات سے برآمد ہونے والے نتائج کا اطلاق زبان کے استعمال کے دوسرے میدانوں میں بھی کیا جانے لگا۔ اس طرح لسانیات کے ایک شعبے کی حیثیت سے 'اطلاقی لسانیات' (Applied Linguistics) کا فروغ ہوا۔ تدریس و تحصیل زبان بالخصوص غیر ملکی زبان، اسلوبیات، لغت نویسی، ترجمہ نگاری، اور زبان کے تجزیہ وتحلیل میں کمپیوٹر کا استعمال چند ایسے میدان ہیں جہاں لسانیات کے اطلاق کے امکانات کافی روشن ہیں۔

4.1- تدریسِ زبان

اطلاقی لسانیات کی سب سے ترقی یافتہ شاخ تدریس و تحصیلِ زبان ہے۔ لسانیات کا تدریسِ زبان سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اکثر اطلاقی لسانیات سے تدریسِ زبان ہی مراد لیا جاتا ہے۔ عالمی سطح پر ترسیل وابلاغ کی ضرورت کی وجہ سے غیر ملکی زبانوں کی تدریس وتحصیل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ عہدِ حاضر میں یورپ، امریکہ، روس، چین، جاپان، نیز خلیجی ممالک میں اردو کی مقبولیت کی وجہ سے اردو کو ثانوی یا غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھنے سکھانے کا رجحان بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ ہند و پاک کی مختلف یونیورسٹیوں میں غیر ملکیوں کو اردو سکھانے کا انتظام موجود ہے۔ حکومتِ ہند کے قائم کردہ ادارے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (Central Institute of Indian Languages) کے زیرِ انتظام کام کرنے والے تدریسِ زبان کے تین مراکز پٹیالہ، سولن (71) اور لکھنؤ میں ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام موجود ہے۔ وہاں کے اساتذہ تدریسی مواد خود تیار کرتے ہیں۔ مرکزی ادارے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے زیرِ اہتمام بھی اردو سکھانے کی ابتدائی نوعیت کی کتابیں تیار کی گئی ہیں جو بیحد مفید ہیں۔

مادری زبان کی حیثیت سے بھی اردو زبان کی تدریس میں بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں جنھیں لسانیات کی مدد سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی تدریس خواہ مادری زبان کی حیثیت سے ہو یا ثانوی یا غیر ملکی زبان کی حیثیت سے، لیکن ہوتی وہ زبان ہی ہے اور زبان کا لسانیات سے گہرا رشتہ ہے۔ لسانیات کا مواد و موضوع ہی زبان ہے، یعنی لسانیات میں زبان ہی کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا لسانیات اور تدریسِ زبان میں اشتراک کا پایا جانا امرِ لازمی ہے۔ لسانیات قدم قدم پر تدریسِ زبان کی معاونت کرتی ہے۔ اسی لیے لسانیات سے واقفیت رکھنے والا شخص زبان کا ایک اچھا معلم بن سکتا ہے، اور زبان کی تدریس بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔

اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلوؤں سے اولین دلچسپی گوپی چند نارنگ کو پیدا ہوئی جنھوں نے اس موضوع پر ایک مختصر کتاب 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو' کے نام سے 1961ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں زبان کے روایتی اور فرسودہ طریقۂ تعلیم سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے لسانیاتی طریقِ کار سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب زبان کے علماء، اساتذہ اور طلبہ تینوں میں بیحد مقبول ہوئی اور آئندہ کے لیے تدریسِ زبان پر لسانیاتی و صوتیاتی اطلاق کی راہیں استوار ہوئیں۔

نارنگ کے بعد تدریس و تحصیلِ زبان کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا۔ چھوٹے موٹے چند مضامین سے قطع نظر، کوئی باقاعدہ تصنیف اس موضوع پر سامنے نہیں آئی۔ البتہ پاکستان میں فرمان فتحپوری نے 'تدریسِ اردو' کے نام سے 1962ء میں ایک کتاب شائع کی جس میں انھوں نے اردو زبان کی تدریس کے بعض لسانیاتی پہلوؤں کا بھی احاطہ کیا۔ یہ کتاب ترمیم و اضافے کے بعد 1972ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

حکومتِ ہند کے ادارے ترقی اردو بیورو (نئی دہلی) سے 1983ء میں معین الدین کی کتاب 'اردو زبان کی تدریس' شائع ہوئی جو ٹیچرز ٹریننگ کالج کے اردو طلبہ و طالبات کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترتیب دی گئی ہے۔ اس لیے اس میں تدریسِ نثر، تدریسِ نظم، تدریسِ غزل اور تدریسِ انشا پر بھی الگ الگ باب ملتے ہیں۔ غیر اردو داں کے لیے

تدریسِ اردو پر ایک علاحدہ باب قائم کیا گیا ہے، تاہم یہ کتاب تعلیم و تدریسِ اردو پر لسانیات کے اطلاق کے تقاضوں کو کما حقہ پورا نہیں کرتی۔

دہلی اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام 1985ء میں دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل پر ایک سمینار منعقد ہوا جس میں بعض مقالے مادری و غیر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس پر بھی پڑھے گئے جن میں لسانیاتی طریقِ کار سے بھی بحث کی گئی۔ یہ مقالے کتابی صورت میں 'دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل' کے نام سے دہلی اردو اکادمی نے 1987ء میں شائع کیے۔

4.2 - اسلوبیات

اطلاقی لسانیات کا ایک دوسرا اہم میدان 'اسلوبیات' (Stylistics) ہے جس پر اردو میں کافی کام ہوا ہے۔ اسلوبیات دراصل ادب کے لسانیاتی مطالعے کا دوسرا نام ہے جس میں زبان کے ادبی و تخلیقی استعمال کا مطالعہ لسانیات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اس مطالعے میں لسانیاتی تجزیے کی مدد سے کسی ادبی فن پارے کے اسلوبی خصائص (Style- features) کا پتا لگایا جاتا ہے جو اس فن پارے کی انفرادیت کے ضامن ہوتے ہیں۔ اسلوبیاتی تجزیے کی بنیاد پر کسی مصنف کے اسلوب کا بھی تعین کیا جاسکتا ہے اور ایک مصنف کے اسلوب کو دوسرے مصنف کے اسلوب سے ممیّز کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے مطالعہ و تجزیے اور پرکھ کو 'اسلوبیاتی تنقید' کا بھی نام دیا گیا ہے۔

اسلوبیاتی تنقید میں ادبی تنقید کے علی الرغم فن پارے یا متن (Text) کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی نقاد سماجی و معاشرتی حالات و واقعات، نیز مصنف کے احوال و کوائف سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک صرف ادبی متن کی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے 'متن آشنا' (Text-oriented) یا متن مرکزی تنقید کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوبیات نے تنقیدِ شعر کو ایک 'نیا رخ' دیا ہے اور ادبی تنقید کو ایک 'نئی جہت' سے روشناس کرایا ہے۔ انگریزی زبان میں اسلوبیات کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی

دہائی سے ہوتا ہے۔ سنہ 1960ء میں ٹامس اے. سیبوک (Thomas A. Sebeok) کی مرتبہ کتاب *Style in Language* کی اشاعت سے اس کے خدوخال متعین ہوتے ہیں اور اس کے بعد کے اسلوبیاتی مطالعوں اور تجزیوں سے اس کا وجود اطلاقی لسانیات کی ایک اہم شاخ کی حیثیت سے مسلّم ہو جاتا ہے۔

اسلوبیات کو اردو میں متعارف کرانے کا سہرا مسعود حسین خاں (1919-2010ء) کے سر ہے جنھوں نے 1960ء سے (امریکہ سے اپنی واپسی کے بعد سے) اسلوبیات سے متعلق مضامین لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے اسلوبیاتی تجزیے کی نہ صرف نظری بنیادیں فراہم کیں، بلکہ اس کے عملی نمونے بھی پیش کیے۔ ''مطالعۂ شعر: صوتیاتی نقطۂ نظر سے''[72] ان کے اوّلین اسلوبیاتی مضامین میں سے ہے جس میں انھوں نے اسلوبیات کا نہ صرف تعارف پیش کیا ہے، بلکہ صوتیاتی سطح پر شعر کے اسلوبیاتی تجزیے کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، نیز تکلمی اصوات کے استعمال، ان کی کثرت وقلت اور تناسب وتوازن کی توجیہ بھی بیان کی ہے اور ان کی صوت جمالیاتی کیفیات، اثریت اور معنیاتی رشتوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تنقیدِ شعر کی بعض اصطلاحوں، مثلاً تنافرِ صوتی، اور نقصِ روانی کی صوتیاتی توجیہ بھی پیش کی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک اور مضمون میں اردو کلامِ غالب کے قافیوں اور ردیفوں کے صوتی آہنگ کا بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اقبال کے صوتی آہنگ کا بھی انھوں نے اپنی کتاب 'اقبال کی نظری وعملی شعریات' (1984ء) میں بہت تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح اپنے ایک اور مضمون میں انھوں نے فانی بدایونی کی ایک نمائندہ غزل کے صوتی تاروپود کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اسلوبیات سے متعلق بعض مباحث ان کے مضامین مثلاً ''تخلیقی زبان''، ''لسانیاتی اسلوبیات اور شعر''، ''ادب میں اسلوب کی اہمیت' وغیرہ میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ راقم السطور نے ان کے اسلوبیاتی مضامین کو مرتب کر کے 'لسانیاتی اسلوبیات' (2019ء) کے نام سے دہلی سے شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب کا 'مقدمہ' بھی راقم السطور نے ہی لکھا ہے جس میں ان کے اسلوبیاتی نظریۂ تنقید سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

اردو میں اسلوبیات کے میدان میں دوسرا اہم نام گوپی چند نارنگ کا ہے۔ مسعود حسین

خاں کی طرح گوپی چند نارنگ بھی لسانیات کا درک رکھتے ہیں اور ادب پر لسانیات کے اطلاق کی اہمیت اور طریق کار سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اسلوبیات سے متعلق اردو میں کئی مفید مضامین لکھے ہیں اور ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو اسلوبیات پر اکثر انگلی اٹھاتے رہتے ہیں۔ (73) 'ادبی تنقید اور اسلوبیات' گوپی چند نارنگ کے اسلوبیاتی مضامین کا قابلِ قدر مجموعہ ہے جو 1989ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں شامل بعض مضامین، مثلاً ''اسلوبیاتِ میر''، ''اسلوبیاتِ انیس''، ''اسلوبیاتِ اقبال'، ''فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام''، اور ''ذاکر صاحب کی نثر'' اسلوبیاتی تجزیوں کے بڑے اچھے نمونے پیش کرتے ہیں۔ نارنگ نے نہ صرف شاعری، بلکہ اردو فکشن کے مطالعے میں بھی اسلوبیات سے کام لیا ہے، اور ادبی فن پاروں کے نہ صرف صوتیاتی سطح پر، بلکہ صرفی، نحوی اور معنیاتی سطحوں پر بھی تجزیے کیے ہیں۔

اسلوبیاتی نقادوں میں مغنی تبسم کو بھی ایک اہم مرتبہ حاصل ہے۔ مغنی کو فانی بدایونی پر ان کے تحقیقی کام کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی جس میں انھوں نے پہلی بار فانی کے شعری اسلوب اور اس کے صوتی حسن کی امتیازی خصوصیات کا سائنسی تجزیہ پیش کیا۔ (74) یہ ان کا ابتدائی کام تھا، لیکن اس کے بعد انھوں نے اسلوبیات کے موضوع پر کئی مضامین لکھے اور ایک کتاب 'آواز اور آدمی' (1983ء) کے نام سے شائع کی جس کے بعض مضامین اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے بیحد اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً ''اصوات اور شاعری''، ''غالب کی شاعری، بازیچۂ اصوات''، ''جدید اردو غزل کی لفظیات''، ''کلامِ غالب میں اسالیب کی آویزش''، ''میر کا لہجہ''، وغیرہ۔

راقم السطور نے بھی اسلوبیاتی موضوعات پر بکثرت لکھا ہے۔ اسلوبیات پر میری پہلی کتاب 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' 1983ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اسی موضوع پر میری دوسری کتاب 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' کے نام سے 2005ء میں شائع ہوئی۔ اسلوبیاتی تنقید پر میری تیسری کتاب 'اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے' کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) سے 2014ء میں شائع ہوئی۔ آخر الذکر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں اسلوبیات کی نظری بنیادوں (Theoretical foundations) سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اسلوبیاتی تنقید کے اطلاقی نمونے

اور شعری تجزیے شامل ہیں، اور تیسرے حصے میں نثری تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔

اسلوبیات پر بعد کے لکھنے والوں میں میرے دو لائق شاگردوں علی رفاد فتیحی اور نذیر احمد ملک کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں اسلوبیات سے دلچسپی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس کا بین ثبوت اسلوبیات کے موضوع پر ان کی شائع شدہ کتابیں ہیں۔ علی رفاد فتیحی کی کتاب 'اسلوبیاتی تنقید' ہے جو 1995ء میں نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں اسلوبیات کی مبادیات سے متعلق وافر مواد موجود ہے۔ فتیحی کے علاوہ نذیر احمد ملک نے بھی 'ادب، ادبی تھیوری اور اسلوبیات' (2020ء) کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں ادبی تھیوری کے ساتھ ساتھ اسلوبیات کے مباحث پر بھی مدلل اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور اسلوبیات کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی جانب اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ کچھ اور اساتذہ بھی جو میرے شاگرد ہیں، مثلاً نذیر احمد ڈھر، اعجاز محمد شیخ، مسعود علی بیگ، عارف حسن خاں اور محمد جہانگیر وارثی وغیرہ بھی اسلوبیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں پاکستان میں بھی اسلوبیات کا فروغ ہوا ہے اور وہاں کے اساتذۂ اردو کا ایک طبقہ اسلوبیاتی تنقید میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ اس ضمن میں محمد اشرف کمال (صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھکر) کا ذکر بیجا نہ ہوگا جنھوں نے اسلوبیات سے اپنی دلچسپی کا ثبوت 'معاصر اردو نعت کا اسلوبیاتی جائزہ' جیسی اہم کتاب شائع کر کے دیا ہے جو 2018ء میں کراچی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اپنی اس کتاب میں اشرف کمال نے معروف نعت گو شعرا کے کلام کا اسلوبیاتی زاویۂ نظر سے تجزیہ پیش کیا ہے اور ان کے اسلوبی خصائص بیان کیے ہیں۔ دوسرا اہم اسلوبیاتی کام عامر سہیل (ایبٹ آباد) کا ہے جنھوں نے 'جدید لسانیاتی اور اسلوبیاتی تصورات' کے نام سے 2021ء میں ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب میں قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کا اسلوبیات کے حوالے سے صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ آج تک اس نقطۂ نظر سے قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا تجزیہ کسی عالم یا نقاد نے پیش نہیں کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے

کہ پاکستان میں نہ صرف لسانیاتِ جدید سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ رہی ہے بلکہ ادب کے اسلوبیاتی مطالعے کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ جب تک کہ لسانیات کی مبادیات سے واقفیت نہ ہو، اسلوبیات سے انصاف نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اسلوبیات کی بنیاد لسانیات ہی پر قائم ہے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ادب کے لسانیاتی مطالعے اور تجزیے ہی کا دوسرا نام 'اسلوبیات' ہے۔

4.3- لغت نویسی

لغت نویسی (Lexicography) ایک دوسرا علمی میدان ہے جہاں لسانیات کی مدد درکار ہوتی ہے۔ لغت کسی زبان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ کوئی لفظ کس طرح لکھا جائے، کس طرح بولا جائے، اس لفظ کے موجودہ اور قدیم معنی کیا ہیں، اس کا تعلق کس جزوِ کلام سے ہے، اس کی تصریفی شکلیں کون کون سی ہیں، نیز اس کے مترادفات اور متضاد الفاظ کون کون سے ہیں یہ تمام باتیں ایک اچھے لغت میں مل جائیں گی۔ لسانیاتی اعتبار سے لغت کسی زبان کی صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی معلومات کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی ترتیب و تدوین کے ہر ہر قدم پر لسانیات کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک اچھا لغت نویس بننے کے لیے لسانیات سے واقفیت بیحد ضروری ہے۔

لغات کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ الفاظ کی نوعیت کے اعتبار سے لغات کی دو بڑی قسمیں ہیں: اول عمومی لغات (General dictionaries)، جن میں عام الفاظ کے تلفظ، معنی، ماخذ اور دیگر لسانیاتی پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ دوم تحدیدی لغات (Restricted dictionaries) جن میں علمی و پیشہ ورانہ اصطلاحات، مترادفات و مرکبات، علاقائی لفظیات، فرہنگِ امثال وغیرہ دی ہوتی ہیں۔ لغات یک لسانی بھی ہوتے ہیں اور دولسانی بھی۔ آخر الذکر لغت میں ایک زبان کے الفاظ کے معنی و مفہوم کو دوسری زبان میں بیان کیا جاتا

ہے جس سے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کے علاوہ تلفظی لغات (Pronouncing dictionaries) بھی ہوتے ہیں جن میں الفاظ کے معنی سے قطع نظر ان کے موجودہ تلفظ سے بحث کی جاتی ہے۔ تاریخی اصولوں پر مبنی لغات بھی تیار کیے جاتے ہیں جنھیں اشتقاقی لغات (Etymological dictionaries) بھی کہتے ہیں۔ ایسے لغات میں موجودہ الفاظ کی قدیم شکلوں کا تعین کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ فلاں لفظ کس لفظ سے نکلا ہے اور پہلے اس کے معنی کیا تھے۔

لغت نویسی کے بے شمار مسائل ہیں جن کا سامنا ہر لغت نویس کو کرنا پڑتا ہے، مثلاً الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب، لغت میں ان کا اندراج، معنی کا تعین اور ان کی ترتیب، محاورات و امثال وغیرہ۔ ان کے علاوہ الفاظ کے تلفظ و املا، نیز تذکیر و تانیث کے بھی بے شمار مسائل ہیں جو تدوینِ لغت کے وقت سامنے آتے ہیں۔

اردو لغت نویسی کے مسائل پر اولین تحریریں ہمیں مولوی عبدالحق، سید مسعود حسن رضوی ادیب اور ابواللیث صدیقی کی ملتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے غالباً سب سے پہلے ''اردو لغات اور لغت نویسی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو ان کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے رسالے 'اردو' (جو اورنگ آباد سے شائع ہوتا تھا) کے جنوری 1931ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں لغت نویسی کے مسائل کو زیرِ بحث لانے کے علاوہ اردو کے بعض مشہور لغات کا بھی ذکر کیا ہے۔ سید مسعود حسن رضوی کا مضمون ''اردو زبان کی لغت'' رسالہ 'ہندوستانی' (الہ آباد) کے جنوری 1931ء کے شمارے میں شائع ہوا، اور ابواللیث صدیقی کے مضمون ''چند قدیم لغات'' کی اشاعت 'اورینٹل کالج میگزین' (لاہور) کے مئی 1949ء کے شمارے میں عمل میں آئی۔ جدید علمی انداز سے بھی اس میدان میں کام ہوا ہے۔ مسعود حسین خاں، گوپی چند نارنگ، رشید حسن خاں اور مسعود ہاشمی وغیرہ نے لغت اور لغت نویسی کے مسائل پر بڑی جامعیت اور دقتِ نظر کے ساتھ غور و خوض کیا ہے۔

مسعود حسین خاں نے اپنے مضمون ''اردو لغت نویسی کے بعض مسائل''[75] میں خالص علمی اور لسانیاتی انداز سے لغت نویسی کے بعض مسائل کو اٹھایا ہے جو تدوینِ لغت کے وقت

سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے لفظ کی تعریف کا تعین کیا ہے، پھر الفاظ کی ترتیب اور لغت میں ان کے اندراجات سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں اردو حروفِ تہجی کے مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ لغت نویسی کے بعض دوسرے مسائل مثلاً املا، تلفظ، معنی کا تعین و ترتیب اور اشتقاقیات سے بھی انھوں نے خالص علمی انداز میں بحث کی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے لغت نویسی کے مسائل پر 1987ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) میں ایک کل ہند سمینار منعقد کیا جس میں پڑھے گئے مقالات کو انھوں نے 'لغت نویسی کے مسائل' کے نام سے مرتب کر کے 1984ء میں شائع کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون ''اردو لغات اور لغت نگاری'' (76) میں لغت نویسی کے بیشتر مسائل کو سائنسی انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ رشید حسن خاں لغت نویسی کے مسائل پر بہت اچھی نظر رکھتے تھے جس کا اندازہ ان کی کتاب 'زبان اور قواعد' (1979ء) کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ مسعود ہاشمی نے لغت نویسی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) سے پی ایچ. ڈی کی سند حاصل کی۔ ان کا یہ مقالہ 'اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ' کے نام سے ترقیِ اردو بیورو (نئی دہلی) کی جانب سے 1992ء میں شائع ہوا۔

پاکستان میں کتبِ لغت کے تحقیقی و لسانی جائزہ پر جابر علی سید اور وارث سرہندی نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اب تک اس قسم کے جائزے پر مشتمل چھے جلدیں مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) سے شائع ہو چکی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کتاب مجلس ترقیِ ادب (لاہور) نے 'لغوی مباحث' کے نام سے 2015ء میں شائع کی ہے۔ اس کے مصنف معروف لسانی محقق رؤف پاریکھ ہیں۔ یہ کتاب لغت نویسی سے متعلق ان کے مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں رؤف پاریکھ نے بڑی دقتِ نظر کے ساتھ اردو لغت نویسی کی تاریخ، محرکات اور رجحانات کا جائزہ پیش کیا ہے اور اردو کے ابتدائی دور کے لغات اور نصاب ناموں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے امیر مینائی کی ''امیر اللغات' اور فیلن کی اردو-انگریزی لغات سے بھی بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں رؤف پاریکھ نے اردو لغت بورڈ (پاکستان) کی تاریخی اصولوں پر مبنی ضخیم اور جامع ترین 'اردو لغت' کا بھی بڑی بے باکی سے جائزہ پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لغت نویسی کے مسائل پر رؤف پاریکھ کی نظر بہت گہری ہے۔

4.4- ترجمہ نگاری

ترجمہ نگاری ایک اور اہم میدان ہے جہاں لسانیات کی مدد درکار ہوتی ہے۔ چوں کہ ترجمے میں ایک زبان میں کہی ہوئی بات کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے اس لیے مترجم کو بیک وقت دو زبانوں کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے اور جب تک کہ دونوں زبانوں پر کامل عبور حاصل نہ ہو، ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمہ جزوی بھی ہوتا ہے اور کلی بھی۔ لفظی بھی ہوتا ہے اور بامحاورہ بھی۔ اسی طرح ترجمہ علمی اور سائنسی بھی ہوتا ہے اور ادبی بھی۔ کسی زبان کی شاعری کا ترجمہ ناممکن بتایا گیا ہے، لیکن یہ اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اسی طرح کسی زبان کے محاورات وضرب الامثال کا بھی ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں، ان کے مفاہیم دوسری زبان میں ضرور ادا کیے جاسکتے ہیں۔ ہر زبان میں کچھ ایسے تہذیبی الفاظ اور فقرے بھی پائے جاتے ہیں جن کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں جدید سائنسی ایجادات کے جو نام ملتے ہیں ان کا ترجمہ اردو میں بمشکل ہی کیا جاسکتا ہے۔ ترجمہ نگاری کا لسانیات کی ہر سطح بالخصوص 'معنیات' (Semantics) سے گہرا رشتہ ہے۔

اردو میں ترجمے کے اولین نمونے ہمیں مغل حکمراں اورنگ زیب (متوفی 1707ء) کے عہد سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔ اس عہد میں معروف مستشرق جون جوشوا کیٹیلر (1659-1718ء) نے، جس نے اردو کی سب سے پہلی قواعد *Grammatica Hindustanica* ترتیب دی، تین مسیحی دعاؤں کے ڈچ زبان سے اردو میں ترجمے کیے اور انھیں ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے رومن خط کا استعمال کیا۔ جارج اے. گریرسن (George A. Grierson) اس کے بارے میں *Linguistic Survey of India* (جلد نہم، حصہ اول، صفحہ: 8) میں لکھتا ہے:

"His translation...may be given as a specimen of

the earliest known translation of any European language into Hindostani."

(= اس کا [کیٹیلر کا] یہ ترجمہ کسی بھی یورپی زبان سے ہندوستانی میں کیے گئے ترجمے کا سب سے قدیم نمونہ ہے)۔

یہاں ''ہندوستانی'' سے مراد ظاہر ہے کہ اردو ہی ہے، کوئی اور ہندوستانی زبان نہیں۔ اس کے بعد بعض عیسائی مبلغین نے توریت و انجیل کے اردو میں ترجمے کیے۔ دکن میں بھی ترجمہ نگاری کو کافی فروغ حاصل ہوا اور وہاں تصوف اور ادبی موضوعات پر فارسی کتابوں کے دکنی اردو میں ترجمے کیے گئے۔

اس کے بعد شمالی ہندوستان میں ترجمہ نگاری کا باقاعدہ طور پر آغاز فضلِ علی فضلی کے ہاتھوں ہوتا ہے جس نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف 'روضۃ الشہداء' کا اردو زبان میں ترجمہ 'کربل کتھا' (1732/33ء) کے نام سے کیا۔ 'کربل کتھا' شمالی ہندوستان کی اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے اور اردو کا پہلا باقاعدہ ترجمہ بھی۔ شمالی ہندوستان میں 'کربل کتھا' کے بعد دوسرا اردو ترجمہ 'نوطرزِ مرصع' کے نام سے ملتا ہے۔ یہ فارسی کے مشہور قصہ 'چہار درویش' کا اردو ترجمہ ہے جسے میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے 1775ء میں مکمل کیا۔ اس کی زبان بیحد مرصع، رنگین اور پُر تکلف ہے جس میں عربی و فارسی کے الفاظ و مرکبات بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں قرآنِ کریم کے دو اردو ترجمے بھی ملتے ہیں: سب سے پہلا ترجمہ قرآن شاہ رفیع الدین دہلوی نے 1787/88ء میں کیا جس کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ اس کے بعد شاہ عبدالقادر دہلوی نے 1790/91ء میں قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اردو میں تراجم کی باقاعدہ طور پر ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب سنہ 1800ء میں کلکتہ (اب کولکتہ) میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اردو ترجموں کا باقاعدگی سے کام یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں زیادہ تر ترجمے کلاسیکی زبانوں مثلاً عربی، فارسی اور

سنسکرت سے کیے گئے۔ میر بہادر علی حسینی نے، جو فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے، 'اخلاقِ ہندی' کے نام سے فارسی تصنیف 'مفرح القلوب' کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ میر بہادر حسینی کے توسط سے میر امن دہلوی نے بھی فورٹ ولیم کالج میں رسائی حاصل کی اور فارسی کے قصۂ 'چہار درویش' کو سلیس اردو میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے۔ یہ ترجمہ 'باغ و بہار' کے نام سے فورٹ ولیم کالج میں 1803ء میں کیا گیا۔ میر امن نے فارسی کی ایک اور کتاب 'اخلاقِ محسنی' (ملا حسین واعظ کاشفی) کا 'گنجِ خوبی' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا، لیکن جو شہرت 'باغ و بہار' کو حاصل ہوئی وہ 'گنجِ خوبی' کو حاصل نہ ہوسکی۔ فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین میں میر شیر علی افسوس کا شمار بھی ہوتا ہے جنھوں نے 'باغِ اردو' اور 'آرائشِ محفل' کے نام سے دو اردو ترجمے کیے۔ 'باغِ اردو' ایران کے شیخ سعدی کی تصنیف 'گلستاں' کا اردو ترجمہ ہے، اور 'آرائشِ محفل' فارسی تصنیف 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ایک اور مصنف سید حیدر بخش حیدری نے گلکرسٹ کی فرمائش پر حاتم طائی کے قصے کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ فورٹ ولیم کالج کے دیگر قابلِ ذکر مصنفین میں مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، اور نہال چند لاہوری کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے سنسکرت اور فارسی کی کئی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔

اردو میں ترجمے کا دوسرا دور سر سید احمد خاں کے ذریعے علی گڑھ میں 1863ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کے بعد سے شروع ہوتا ہے جس کے زیرِ اہتمام معیاری علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ اردو ترجموں کا تیسرا دور حیدر آباد میں دارالترجمہ کے قیام کے بعد سے شروع ہوتا ہے جہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں (جہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھی) اعلیٰ تعلیم کی غرض سے سائنس، طب اور دیگر علوم کی سیکڑوں کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں حکومتِ ہند کے قائم کردہ ادارے ترقی اردو بیورو (اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)، نئی دہلی نے ترجمے کے کام کی از سرِ نو بنیاد ڈالی اور تاریخ، جغرافیہ، تعلیم، سیاسیات، لسانیات، سماجیات، ارضیات، نفسیات، حیاتیات، طبیعیات، کیمیا اور ریاضی جیسے علوم کی بے شمار کتابیں ماہرین سے ترجمہ کروا کر شائع کیں۔

سماجی اور سائنسی علوم سے قطع نظر ادبی تراجم کی بھی اردو میں ایک شاندار روایت رہی ہے۔ بیسویں صدی کے دوران میں بے شمار انگریزی ناولوں، ڈراموں اور نظموں کے اردو میں ترجمے کیے گئے جو مقبول ہوئے۔ ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں سے بھی اردو میں ترجمے کیے گئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

اردو میں ترجمے کا کام جس قدر پھیلا ہوا ہے، اس لحاظ سے ترجمے کے فن اور مسائل پر ہندوستان اور پاکستان میں بہت کم کام ہوا ہے، تاہم اس ضمن میں درج ذیل کتب خصوصی اہمیت کی حامل ہیں: 'ترجمہ کا فن اور روایت' (مرتبہ قمر رئیس)، 'فنِ ترجمہ نگاری' (مرتبہ خلیق انجم)، 'ترجمے کا فن : نظری مباحث' (مرزا حامد بیگ)، 'ترجمہ: روایت اور فن' (نثار احمد قریشی)، 'اردو زبان میں ترجمے کے مسائل' (مرتبہ اعجاز راہی)۔ 'فنِ ترجمہ کاری: مباحث' (مرتبہ صوبیہ سلیم اور صفدر رشید) اور 'فنِ ترجمہ نگاری' (ظہور الدین)، وغیرہ۔

5- لسانیات کا دیگر علوم سے رشتہ

سماجیات اور نفسیات دو ایسے علوم ہیں جن کا لسانیات سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ زبان چوں کہ تہذیب کا ایک جزو ہے، اور یہ سماج ہی میں پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے اس لیے اس کا مطالعہ سماجی و تہذیبی حوالوں سے بھی کیا گیا ہے جس نے ایک نئے شعبۂ علم کو فروغ دیا ہے جسے 'سماجی لسانیات' (Sociolinguistics) کہتے ہیں۔ اسی طرح زبان کے نفسیاتی پہلوؤں کے مطالعے سے 'نفسیاتی لسانیات' (Psycholinguistics) کو فروغ حاصل ہوا، لیکن ان دونوں شعبوں سے متعلق اردو میں ابھی تک خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ عبدالستار دلوی کی کتاب 'اردو زبان اور سماجی سیاق' (1991ء) اور راقم السطور کے چند مضامین سے قطعِ نظر سماجی لسانیات کے موضوع پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ یہی حال نفسیاتی لسانیات کا بھی ہے۔ اس موضوع پر بھی اردو میں صرف گنے چنے مضامین ہی ملتے ہیں۔ لسانیات سے ہم رشتگی رکھنے والے چند دوسرے علوم مثلاً فلسفیانہ لسانیات (Philosophical Linguistics)، بشریاتی لسانیات (Anthropological Linguistics)،

کمپیوٹیشنل لسانیات (Computational Linguistics) کے بارے میں بھی اردو میں مواد کا فقدان ہے۔ شماریاتی لسانیات (Statistical Linguistics) بھی اردو کے لیے ایک نیا موضوع ہے۔

اردو اب وسیع تر خطے میں بولی جانے والی زبان بن چکی ہے۔ اسے بلاشبہ 'وسیع تر ترسیل کی زبان' (Language of Wider Communication) کہہ سکتے ہیں۔ جب کوئی زبان کسی وسیع علاقے یا خطے میں بولی جاتی ہے تو اس کی صوتی، صرفی اور نحوی وقواعدی ساخت میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلیاں علاقائی ہوتی ہیں، لیکن زبان میں طبقاتی بنیادوں پر بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اردو کی علاقائی اور طبقاتی بولیوں کا مطالعہ کئی محققین نے کیا ہے اور جن بولیوں کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں بھوپالی اردو، میسوری اردو، بمبیا اردو، کرخنداری اردو، گجراتی اردو یا گجری اور دکنی اردو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ان بولیوں سے قطع نظر لسانیات میں عوامی یا غیر رسمی بولی جسے اکثر عامیانہ بولی بھی کہہ دیا جاتا ہے، کی بھی بیحد اہمیت ہے۔ ایسی بولی کو انگریزی میں 'Slang' (سلینگ) کہتے ہیں۔ چونکہ اردو میں 'سلینگ' کا مترادف موجود نہیں ہے، اس لیے اردو میں بھی اسے سلینگ ہی کہا جاتا ہے۔ اردو میں سلینگ کے مطالعے کی طرف تا حال کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے، لیکن اردو کے معروف محقق اور زبان شناس رؤف پاریکھ نے جن کا تعلق پاکستان کے لغت بورڈ سے رہا ہے، بڑی تعداد میں اردو سلینگ جمع کر کے اسے ایک لغت کی شکل دے دی ہے جسے بلاشبہ اردو سلینگ کا نقشِ اول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو سلینگ پر مشتمل ان کی فاضلانہ کتاب 'اولین اردو سلینگ لغت' کے نام سے 2006ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب پر راقم السطور نے مفصل مضمون بعنوان ''اردو زبان کی پہلی سلینگ لغت'' قلم بند کیا جو ان کی کتاب 'لسانیاتی مسائل ومباحث' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2016ء) میں شامل ہے۔

حواشی

-1 مثلاً، امریکی ماہرِ لسانیات لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) پانِنی کی سنسکرت زبان کی قواعد، 'اشٹادھیائی' کے بارے میں اپنی شہرۂ آفاق تصنیف *Language* میں، جو 1933ء میں نیویارک سے شائع ہوئی، لکھتا ہے:

"This grammar, which dates from around 350 to 250 BC, is one of the greatest monuments of human intelligence." (p.11)

-2 اس مطالعے کی بنیاد ایک انگریز قانون داں سر ولیم جونز (Sir william Jones) نے 1786ء میں ڈالی جو اس زمانے میں کلکتہ (اب کولکتہ) میں مقیم تھا۔ جونز نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک جلسے میں 27 ستمبر 1786ء کو ایک مقالہ پڑھا جس میں اس نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ سنسکرت (قدیم ہندوستانی زبان)، یونانی، لاطینی، کلٹک اور جرمانک، ان تمام زبانوں میں چونکا دینے والی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ مماثلتیں اتنی حیرت انگیز تھیں کہ جونز کو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ "یہ زبانیں ضرور کسی ایک مشترک ماخذ سے ارتقا پذیر ہوئی ہیں"۔ یہیں سے زبانوں کے تاریخی و تقابلی مطالعے کی باقاعدہ طور پر ابتدا ہوتی ہے۔

-3 'دریائے لطافت'، جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں، تنہا سید انشاء اللہ خاں انشا کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اس کی تالیف میں ان کے نومسلم دوست مرزا محمد احسن قتیل بھی ان کے شریک کار تھے۔ قتیل ابتدائے جوانی میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ ان کا اسلام قبول کرنے سے پہلے کا نام دیوان سنگھ تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے 'دریائے لطافت' کی تصنیف میں انشاء اللہ خاں انشا کے شریکِ کار مرزا محمد احسن قتیل کا نام "مرزا محمد حسن قتیل" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ دیکھیے شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو' (کراچی: آج کی کتابیں، 1999ء)، ص 17 (حاشیہ)۔

4- مولوی عبدالحق نے اپنی 'قواعدِ اردو' (1914ء) کے "مقدمہ" میں لکھا ہے کہ "اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ کی حالی لائبریری میں موجود ہے"۔ (ص 16)۔

5- مولوی عبدالحق، مقدمہ 'قواعدِ اردو' (لکھنؤ: الناظر پریس، 1914ء)، ص 16۔

6- دیکھیے محمد انصاراللہ، 'صہبائی: ایک مختصر تعارف' (علی گڑھ، 1986ء)، ص 102۔

7- مولوی عبدالحق، محولۂ بالا تصنیف، ص 26۔

8- دیکھیے مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون "اردو قواعد نویسی کی روایت"، مشمولہ 'لسانی مسائل و مباحث' از مرزا خلیل احمد بیگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2016ء)، ص 119 تا 154۔

9- سید ضامن علی جلال لکھنوی (1909-1834ء) کی تصنیف 'منتخب القواعد' کو اردو قواعد نویسی میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا دوسرا نام 'گنجینۂ زبانِ ہندی' ہے۔

10- متوفی 1284 ہجری (بمطابق 1867/68ء)۔

11- 'نفس اللغۃ' اس کا تاریخی نام ہے جس سے 1256 ہجری (بمطابق 1840/41ء) نکلتا ہے۔ 'نفس اللغۃ' نشتر کاکوروی کے دیباچے کے ساتھ نیّر پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

12- اوحدالدین بلگرامی کی صراحت کے مطابق 7 رجب 1253 (بمطابق 1837ء) کو اس لغت کی تکمیل ہوئی۔ (بحوالہ رشید حسن خاں، 'زبان اور قواعد' [نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1976ء]، ص 239)۔

13- 'گلشنِ فیض' اس لغت کا تاریخی نام ہے جس سے 1290 ہجری نکلتا ہے جو 1873/74 سنہ عیسوی کے مطابق ہے۔ یہ لغت پہلی بار نول کشور پریس، لکھنؤ سے محرم 1298 ہجری (بمطابق دسمبر 1880ء) میں شائع ہوا۔

14- ان لغات کے مطالعے سے اردو لغت نویسی کے ارتقا اور روایت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

15- 'خالق باری' اور اس نوع کے دیگر منظوم لغات اس مخصوص عہد کی تعلیمی نصابی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کیے گئے تھے۔ ان لغات سے اس عہد کے لغت نویسی کے رجحان کا بھی پتا چلتا ہے۔

16- 'خالق باری' کا سب سے قدیم مطبوعہ نسخہ (جو غالباً پہلا مطبوعہ نسخہ ہے)، وہ ہے جو مصطفائی

پریس، لکھنؤ سے مارچ 1841ء میں طبع ہوا۔

17- 'صمد باری' از میر عبدالواسع ہانسوی۔

18- 'حمد باری' از عبدالسمیع رام پوری۔

19- 'رازق باری' از والہ۔

20- 'قادر باری' از فیاض عسکری۔

21- ''اللہ باری' از حافظ احسن اللہ لاہوری۔

22- دیکھیے 'خالق باری'، مرتبہ محمود خاں شروانی کا دیباچۂ اول (دہلی: انجمن ترقی اردو، 1944ء)، ص 27-26 (حاشیہ)

23- مسعود ہاشمی، 'اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ' (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1992ء)، ص 66۔

24- ایضاً، ص 66۔

25- رشید حسن خاں، 'زبان اور قواعد' (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1976ء)، ص 182۔

26- لغات کے علاوہ جلال لکھنوی کی یادگار 'رسالہ تذکیر و تانیث' معروف بہ 'مفید الشعراء' بھی ہے جو 1884ء میں شائع ہوا۔

27- جلال لکھنوی ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔ انھیں کم عمری ہی سے شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جن اساتذہ سے انھوں نے مشورۂ سخن کیا ان میں میر اوسط علی رشک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

28- 'بہار ہند' کے چار حصے تھے، لیکن صرف ایک حصہ ہی چھپ سکا، باقی تین حصے چھپنے سے رہ گئے۔ مرزا مچھو بیگ نے لکھنؤ کے مشہور اخبار 'اودھ پنچ' میں 'ستم ظریف' کے فرضی نام سے ایک طویل عرصے تک نہایت دلچسپ مضامین لکھے جس سے ان کی بے مثل نثر نگاری اور انشا پردازی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ 'اودھ پنچ' میں شائع شدہ ان کے مضامین کا انتخاب 'چشمۂ بصیرت' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مرتب مولوی حکیم الدین وکیل ہیں۔ مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی کے نام سے بھی مشہور تھے اور ان کا ایک ضخیم دیوان بھی تھا جو ''جملہ اصناف سخن'' پر مشتمل تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ ان کے بیٹے مرزا محمد صدیق

صادق لکھنوی کی تحویل میں آ گیا تھا، لیکن یہ چھپا یا نہیں، اس کا علم نہ ہو سکا۔

29- ’مضامینِ چکبست‘، ص 245۔ بحوالہ رشید حسن خاں، محولۂ بالا کتاب، ص 170 (حاشیہ)۔

30- دیکھیے میکش حیدر آبادی، ’یادگار امیر مینائی‘ ص 10۔

31- دیکھیے ’فرہنگِ آصفیہ‘ کی جلد اول کا دیباچہ (صفحہ 30)۔

32- رشید حسن خاں، محولۂ بالا کتاب، ص 421 (حاشیہ)۔

33- یہ لغت امیر مینائی نے ’امیر اللغات‘ کی ترتیب سے بہت پہلے ترتیب دیا تھا، بلکہ احسن اللہ خاں ثاقب، مرتب ’مکاتیب امیر مینائی‘ (1924ء) کا تو خیال یہ ہے کہ ’امیر اللغات‘ اسی لغت (بہارِ ہند) کی توسیع شدہ شکل ہے۔

34- جلال نے پہلے اس رسالے کا نام ’کارآمدِ شعرا‘ رکھا تھا، لیکن نظرِ ثانی کے بعد اس کا نام ’مفید الشعرا‘ رکھ دیا۔

35- میر امّن، ’باغ و بہار‘، مرتبہ رشید حسن خاں (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1974ء)، ص 13۔

36- بحوالہ حافظ محمود خاں شیرانی، ’پنجاب میں اردو‘ (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1970ء)، ص 52۔

37- ایضاً، ص 53۔

38- محمد حسین آزاد، ’آبِ حیات‘ (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، 1967ء)، ص 13۔

39- دیکھیے مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون ’’اردو قواعد نویسی کی روایت‘‘، مشمولہ ’لسانی مسائل و مباحث‘ از مرزا خلیل احمد بیگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2016)، ص 154-119۔

40- حامد اللہ ندوی، ’لکھنؤ کی لسانی خدمات‘ (بمبئی: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، 1975ء)، ص 53۔

41- مولوی عبدالحق کا یہ مقدمہ (’’اردو لغات اور لغت نویسی‘‘) اس سے پہلے مضمون کی شکل میں رسالہ ’اردو‘ (بابت جنوری 1931ء) میں شائع ہوا تھا۔

42- مسعود حسین خاں، ’’اردو لغت نویسی کے بعض مسائل‘‘، مشمولہ ’سید عابد حسین یادگاری خطبات‘، مرتبہ نثار احمد فاروقی (نئی دہلی: سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ، 1985ء)، ص 124۔

43- اردو لغت بورڈ کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے دیکھیے عابدہ ہما کا مضمون ’’اردو

لغت بورڈ، کراچی کی ادبی خدمات''، مطبوعہ ششماہی تحقیقی مجلّہ 'تحقیق' (سندھ یونیورسٹی، جامشورو)، جلد 16 (2008ء)۔

44- ان ایڈیٹرز کے نام یہ ہیں: مالک رام، آلِ احمد سرور، مسعود حسین خاں، نذیر احمد اور مختار الدین احمد - مالک رام کا تعلق دہلی سے تھا، بقیہ چاروں ایڈیٹرز علی گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔ راقم السطور کو مسعود حسین خاں کے ساتھ علی گڑھ میں ابتدا سے 31 جولائی 1973ء تک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے تدوینِ لغت کا کام انجام دینے کی سعادت حاصل رہی ہے۔

45- حافظ محمود خاں شیرانی، 'پنجاب میں اردو' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1970ء)، ص 19۔

46- ایضاً، ص 20-19۔

47- محمود شیرانی نے اس بات کا ذکر اپنی تصنیف 'پنجاب میں اردو' کے ''عرضِ حال'' میں مختصراً کیا ہے۔

48- سید محی الدین قادری زور، ''اردو کی ابتدا''، مشمولہ فضل الحق (مرتب)، 'اردو لسانیات' (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، 1981ء)۔ یہ کتاب 'اردوئے معلیٰ' (میگزین شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) کا اردو لسانیات نمبر ہے (اشاعتِ اول 1962ء)۔

49- سید محی الدین قادری زور، 'ہندوستانی لسانیات' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1960ء)، ص 95-94۔

50- دیکھیے مسعود حسین خاں کی خودنوشت سوانح حیات 'ورودِ مسعود' (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 1989ء)، آٹھواں باب: ''مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں''۔

51- مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'، بارِ چہارم (علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، 1970ء)، ص 241۔

52- مسعود حسین خاں کے اس مضمون کا ترجمہ راقم السطور نے ''اردو کے لسانیاتی ادب کا جائزہ'' کے نام سے کیا جو ماہنامہ 'جامعہ' (نئی دہلی) کی جون 1973ء (جلد 67، شمارہ 6) کی اشاعت میں شائع ہوا۔

53- دیکھیے ایضاً۔

54- مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو'، بارِ ہفتم (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،

1987ء)،ص236۔

55- شوکت سبزواری،'اردو زبان کا ارتقا' (دہلی: چمن بک ڈپو،س۔ن)،ص105۔

56- اردو اور کھڑی بولی کے رشتے کے بارے میں دیکھیے مرزا خلیل احمد بیگ کا مفصل مضمون ''اردو کی کھڑی بولی بنیاد''، مشمولہ 'لسانی مسائل و مباحث' از مرزا خلیل احمد بیگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2016ء)،ص90-75۔

57- شوکت سبزواری،'داستانِ زبانِ اردو' (دہلی: چمن بک ڈپو،س۔ن)،ص99۔

58- دیکھیے: گیان چند جین، ''اردو کے آغاز کے نظریے''، مطبوعہ 'ہندوستانی زبان' (بمبئی)، جولائی تا اکتوبر 1977ء،(نمبر 4-3)،ص11۔

59- ایضاً،ص7۔

60- ایضاً،ص12۔

61- شہاب الدین ثاقب، 'انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات' (علی گڑھ، 1990ء)،ص282

62- تفصیلات کے لیے دیکھیے مرزا خلیل احمد بیگ کی کتاب 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی' (ساہتیہ اکادمی،1989ء)، پانچواں باب: ''تارید و تصرف اور وضعِ اصطلاحات'' (ص 108تا118)۔

63- راقم السطور فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات کمیٹی کا ایک رکن تھا جس نے نہ صرف لسانیات کی اصطلاحات سازی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بلکہ مسودے کو مسعود حسین خاں کی رہنمائی میں قطعی اور آخری شکل دینے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کی پریس کاپی تیار کرنے کی تمام تر ذمہ داری بھی راقم السطور ہی کو سونپی گئی تھی۔

64- ابو محمد سحر،'اردو املا اور اس کی اصلاح' (بھوپال: مکتبۂ ادب،1982ء)،ص13-12۔

65- ایضاً،ص19۔

66- گوپی چند نارنگ،'املا نامہ' (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،1974ء)،ص24۔

67- اعجاز راہی،'املا اور موز او قاف کے مسائل' (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،1985ء)،ص1۔

68- گوپی چند نارنگ،'املا نامہ'، دوسرا ایڈیشن (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،1990ء)،ص43۔

69- امریکہ کے راک فیلر فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے ہندوستان میں 1953ء سے لسانیات کے موسمِ گرما اسکولوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا جن میں امریکی ماہرین لسانیات بھی پڑھانے آتے تھے۔

70- یہ کتاب 910 صفحات پر مشتمل ہے۔

71- راقم السطور نے سولن (ہماچل پردیش) میں قائم اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر (حکومت ہند) کے پرنسپل کے فرائض چار سال تک (1977 تا 1981ء) انجام دیے۔ اردو رسم خط کی تدریس سے متعلق کتاب 'آیئے اردو سیکھیں' سولن ہی کے دوران قیام میں لکھی گئی۔

72- مشمولہ 'شعر و زبان' (حیدرآباد، 1966ء)۔

73- مثلاً دیکھیے گیان چند جین کا مضمون ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر''، مشمولہ 'پرکھ اور پہچان' از گیان چند جین (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1990ء)۔ گیان چند جین کا یہ وہی مضمون ہے جو سب سے پہلے ماہنامہ 'نیا دور' (لکھنؤ) کے اکتوبر 1984ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ راقم السطور نے اس کا مفصل اور مدلل جواب لکھ کر 'نیا دور' کے مدیر کو بھیج دیا تھا جو اس کی اپریل تا نومبر 1986ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

74- دیکھیے مغنی تبسم، 'فانی بدایونی: حیات، شخصیت اور شاعری' (حیدرآباد، 1969ء)

75- مشمولہ نثار احمد فاروقی (مرتب)، 'سید عابد حسین یادگاری خطبات' (نئی دہلی: سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ، 1985ء)، ص 122 تا 124۔

76- مشمولہ شمس الرحمٰن فاروقی، 'تنقیدی افکار' (الہ آباد: اردو رائٹرس گلڈ، 1983ء)، ص 218 تا 299۔

•••

اردو کی لسانی تاریخیں

'تاریخ' کو ہم موٹے طور پر گذرے ہوئے زمانے کے حالات و واقعات کا بیانیہ کہہ سکتے ہیں۔ زمانہ ہر لحظہ منقلب ہوتا رہتا ہے۔ صبح کو شام میں، رات کو دن میں، اور آج کو کل میں تبدیل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ یہی گذرا ہوا کل 'ماضی' کہلاتا ہے، اور اسی ماضی کی داستان کو ہم 'تاریخ' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تاریخ کا سروکار انسانی تہذیب و تمدن میں تبدیلی کے عمل سے ہے، اور تہذیب کا وجود زبان کی موجودگی کی دلیل ہے۔ زبان کا تہذیب سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہ تہذیب کا جزوِ لاینفک ہے۔ دنیا کی کسی بھی تہذیب کا تصور زبان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی تہذیب صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے تو اس کی زبان بھی مردہ حالت کو پہنچ جاتی ہے۔ ماضی میں بولی جانے والی بے شمار زبانیں جن میں بعض مقتدر زبانیں بھی شامل ہیں، آج مردہ زبانیں (Dead languages) کہلاتی ہیں، کیونکہ ان کی تہذیبیں فنا ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر جب موہن جوداڑو اور ہڑپا یا میسوپوٹیمیا (قدیم عراق) کے بابل (Babylon) اور نینوا (Nineveh) کی تہذیبوں نے کروٹیں بدلیں تو وہاں کی زبان کے تارِ نفس بھی ٹوٹ گئے۔

جس طرح امتدادِ زمانہ کے ساتھ انسانی تہذیب و تمدن میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی تبدیلی کے عمل سے گذرتی ہیں، یہاں تک کہ ایک زبان دوسری زبان کی نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے، پھر دوسری سے ایک تیسری زبان معرضِ وجود میں آتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ زبانوں میں تبدیلی کا یہ سلسلہ متواتر جاری رہتا

ہے۔ چنانچہ ہر فطری زبان نسبی اعتبار سے (Geneologically) کسی نہ کسی ماقبل زبان سے علاقہ رکھتی ہے۔ پھر اس ماقبل زبان کا نسبی رشتہ ماضی میں کسی اور ماقبل زبان سے استوار ہوتا ہے۔ عرفِ عام میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک زبان دوسری زبان کو جنم دیتی ہے یا زبان کی کوکھ سے زبان پیدا ہوتی ہے۔ جب نئی زبان چلن میں آجاتی ہے تو پرانی یا قدیم زبان متروک ہوجاتی ہے اور ایک خاص مدت گذر جانے کے بعد وہ 'مردہ' قرار دے دی جاتی ہے۔ جب کوئی زبان کسی زبان کے بطن سے پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے ساتھ سابقہ زبان کی بعض خصوصیات (Features) بھی ساتھ لاتی ہے۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں میں پائی جانے والی خصوصیات جب آپس میں ملتی جلتی ہوں تو ان زبانوں کو نسبی اعتبار سے مماثل زبانیں (Similar languages) کہا جاتا ہے۔ مماثل زبانوں کو ایک گروہ میں شامل کیا جاتا ہے جسے 'لسانی خاندان' یا 'خاندانِ السنہ' (Language Family) کہتے ہیں۔ دنیا میں بولی جانے والی تقریباً 6,000 زبانوں کو ان کی نسبی بنیادوں پر کئی لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سب سے بڑا لسانی خاندان 'ہند یورپی خاندانِ السنہ' (Indo-European Family of Languages) ہے۔ اس کے کئی ذیلی خاندان (Sub-families) ہیں۔ انھی میں سے ایک ذیلی خاندان کا نام ہند آریائی (Indo-Aryan) ہے جس سے تعلق رکھنے والی زبانیں برِصغیر ہند و پاک، بلکہ جنوبی ایشیا کے ایک بڑے حصے میں بولی جاتی ہیں۔ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں پیوست ہیں۔

(2)

اردو کا باقاعدہ طور پر آغاز شمالی ہندوستان (دہلی و نواحِ دہلی) میں بارھویں صدی کے اواخر میں ہوتا ہے، لیکن اس کا ''ابھار'' 1000 سنہ عیسوی میں شورسینی اپ بھرنش کے خاتمے کے بعد ہی سے شروع ہوجاتا ہے جس کا ثبوت مسعود سعد سلمان (1121-1046ء) کا ''ہندوی'' دیوان ہے جو دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا، لیکن جس کا ذکر سدید الدین محمد عوفی (1242-1171ء) کے فارسی تذکرے 'لباب الالباب' (1227/28ء) اور امیر خسرو (1325-1253ء) کی مثنوی ''نہ سپہر'' (1317/18ء) میں واضح طور پر ملتا ہے۔ ابتدا میں

اردو پر دہلی و نواحِ دہلی کی بولیوں کے اثرات پڑتے ہیں اور یہ سیال حالت میں رہتی ہے۔ اسی زمانے میں سیاسی اسباب کی بنا پر یہ دکن کا رخ کرتی ہے جہاں اس کے بال و پر نکلتے ہیں اور ادب پروان چڑھتا ہے، لیکن اسے اصلی ترقی شمالی ہند ہی میں ملتی ہے جہاں رفتہ رفتہ یہ معیاری شکل اختیار کر لیتی ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اردو نے ابتدا ہی سے 'کھڑی بولی' کا ڈھانچا اختیار کیا جو شمال مشرقی دہلی اور اس سے متصل مغربی یوپی کی بولی ہے۔ جیسے جیسے اردو ترقی کرتی گئی اس کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا گیا اور اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے۔ چونکہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے، اس لیے اس میں ہند آریائی نژاد یا انڈک (Indic) الفاظ، یعنی پراکرت اور اپ بھرنش کے 'تدبھو' الفاظ کا تناسب سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد عربی، فارسی زبانوں کے الفاظ آتے ہیں جو اردو میں تقریباً ایک چوتھائی ہیں جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہر زندہ زبان تبدیلی کے عمل سے گذرتی ہے، چنانچہ اردو زبان میں بھی عہد بہ عہد مختلف قسم کی صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ انھی لسانیاتی تبدیلیوں کے زیرِ اثر اردو اپنے ارتقا کے ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں، اور دوسرے دور سے نکل کر تیسرے دور میں داخل ہوئی جو اس کا قدیم، درمیانی اور جدید دور کہلایا۔ اردو کا قدیم دور 1200 تا 1700 سنہ عیسوی کے دوران شمال و دکن میں اس کے ارتقا پر مشتمل ہے۔ اس کا درمیانی دور 1700ء سے لے کر انقلابِ غدر (1857ء) تک قائم رہتا ہے اور جدید دور 1857ء تا حال قائم ہے۔ اگر تاریخی و زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو زبان اپنے ارتقا کے پورے آٹھ سو سال (1200 تا 2000 سنہ عیسوی) مکمل کر چکی ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران میں اس میں مختلف النوع لسانی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں، تب کہیں جا کر یہ ایک معیاری زبان بن سکی اور اسی کے ساتھ اس نے ایک جدید ترقی یافتہ زبان کا مرتبہ بھی حاصل کیا۔ اردو زبان کی اسی سلسلہ وار تاریخ کو ماہرینِ لسانیات 'لسانی تاریخ' کا نام دیتے ہیں۔

(3)

اردو میں، زبانِ اردو کے حوالے سے لسانی تاریخ نویسی کی روایت تقریباً سو سال پرانی ہے۔ اردو زبان کی سب سے پہلی تاریخ حیدر آباد (دکن) کے حکیم سید شمس اللہ قادری نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط میں لکھی جو 'اردوئے قدیم' کے نام سے پہلی بار 1925ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد حافظ محمود خاں شیرانی، سید محی الدین قادری زور، مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری نے اردو زبان کی تاریخیں لکھیں، لیکن ان میں سے کسی لسانی مورخ نے تاریخ نویسی کے اصول مرتب نہیں کیے، نتیجتاً زبانِ اردو کی یہ تاریخیں کسی ایک نہج پر استوار رہنے کے بجائے افراط وتفریط کا شکار ہو کر رہ گئیں۔

راقم السطور کی ادنیٰ رائے میں اردو کی لسانی تاریخ کو (یا کسی بھی زبان کی لسانی تاریخ کو) موٹے طور پر پانچ اصولوں پر کاربند ہونا چاہیے جو درج ذیل ہیں:

1- اردو زبان کے حسب ونسب اور خاندان کا تعین، یعنی اس امر کا تعین کہ نسلی ونسبی اعتبار سے (Geneologically) اس زبان کا تعلق کس خاندانِ السنہ (Language family) سے ہے۔

2- ہم رشتہ زبانوں اور بولیوں سے اردو کا تقابل اور ان کے درمیان رشتوں کی نوعیت کا تعین۔

3- مستند دلائل اور علمی بنیادوں پر اردو زبان کی ابتدا یا پیدائش کے نظریے کی تشکیل، یعنی اس بات کا تعین کہ اردو کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟

4- اردو کی ساخت (Structure) میں عہد بہ عہد تبدیلیوں اور اس کے تاریخی ارتقا کا جائزہ اور اس کے مختلف ادوار — قدیم، درمیانی اور جدید دور کا تعین۔

5- اردو کے دستیاب شدہ نمونوں اور مواد کا تجزیہ اور ہر دور میں زبان کی ہیئت وساخت میں تبدیلی اور نشوونما کے عمل کا مطالعہ — صوتی، صرفی، نحوی اور قواعدی تبدیلیوں کا مطالعہ۔

اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ لسانی تاریخ نویسی، لسانیات بالخصوص تاریخی و تقابلی

لسانیات (Historical and Comparative Linguistics) سے کما حقہٗ واقفیت کی متقاضی ہے۔ شومیِ قسمت کہ اردو کے جن عالموں نے اردو کے لسانی و تاریخی موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے ان میں سے بیشتر لسانیات کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ انھیں ہم صحیح معنیٰ میں ماہرِ السنہ (Philologist) بھی نہیں کہہ سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کی لسانی تاریخ لکھنے یا لکھوانے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خال خال تحریروں میں اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق بعض ''منتشر'' خیالات ضرور مل جاتے ہیں جن کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کوئی اہمیت نہیں۔

میر امّن نے 'باغ و بہار' (1803ء) کے دیباچے میں اردو کو شہنشاہ اکبر کے عہد کی زبان بتایا جس کی تشکیل کئی زبانوں کے الفاظ سے مل کر ایک کھچڑی زبان کی حیثیت سے ہوئی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے تذکرۂ 'آبِ حیات' (1880ء) میں لکھا کہ ''ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔'' سید سلیمان ندوی نے 'نقوشِ سلیمانی' (1939ء) میں یہ خیال پیش کیا کہ ''قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' (ص 31)۔ نصیر الدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' (1985ء، ایڈیشن) میں اس خیال کا اظہار کیا کہ ''جو دعویٰ اردو کے دکن میں پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔'' (ص 35)۔ نصیر الدین ہاشمی کے اس خیال سے متاثر ہوکر دکن (میسور) کی ایک معروف اہلِ علم آمنہ خاتون نے اپنے کتابچے 'دکنی کی ابتدا' (1970ء) میں دکنی یعنی قدیم اردو کے دکن میں پیدا ہونے کی بات کہی ہے۔

اس ضمن میں پاکستان کے معروف محقق سہیل بخاری کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا جنھوں نے اپنی کتاب 'اردو کی زبان' (1997ء) میں اردو کی پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں عجیب و غریب خیالات پیش کیے ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ اردو مہاراشٹری پراکرت سے پیدا ہوئی ہے۔ (ص 266)۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''اردو کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ یوپی یا دلی میں پیدا ہوئی، درست نہیں ہے۔'' (ص 268)۔ انھی باتوں کا اعادہ کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں: ''حاصلِ کلام یہ ہے کہ اردو مہاراشٹری پراکرت سے مہاراشٹر دیس میں پیدا ہوئی جہاں

سے وہ مذہبی تحریکوں کے ساتھ یوپی پہنچ کر آگرے میں جم گئی۔'' (ص 308)۔ یہ باتیں 'ایجادِ بندہ' کے سوا کچھ نہیں۔ اردو کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ 'لشکری زبان' ہے۔ یہ خیال سب سے پہلے مغربی مصنّفین نے پیش کیا، لیکن اس کی تائید ہمارے ملک کے بعض عالموں نے بھی کی ہے۔ قدیم تحریروں میں زمانۂ حال کی اردو کو''ہندوی'' اور''ہندی'' کہا گیا ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی اپنی کتاب *Indo-Aryan and Hindi* (1942) میں اسے ''ہندوستھانی'' کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ''یہ دہلی کے ترک حکمرانوں کے دربار یا لشکر میں ارتقا پذیر ہونے والی کوئی مصنوعی زبان نہ تھی... اس کا دوسرا نام 'زبانِ اردو' یا 'لشکر کی زبان' بہت بعد کی یعنی سترھویں صدی کے اواخر کی پیداوار ہے'' (ص 197)۔ چٹرجی نے، یہاں 'زبانِ اردو' کی ترکیب میں لفظِ 'اردو' زبان کے معنی میں نہیں (یعنی بہ طور اسمِ خاص نہیں)، بلکہ 'لشکر' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ گویا کہ یہ بات ان کے ذہن میں گھر کر چکی تھی کہ اردو لشکری زبان ہے، ورنہ وہ اسے''لشکر میں ارتقا پذیر ہونے والی زبان'' نہ کہتے۔

اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق میر امن، مولانا محمد حسین آزاد، سید سلیمان ندوی، نصیر الدین ہاشمی، سہیل بخاری اور سنیتی کمار چٹرجی کے یہ خیالات جو سطورِ بالا میں پیش کیے گئے ہیں، جدید لسانیاتی تحقیق کی رو سے رَد کیے جا چکے ہیں کہ یہ محض قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ انھیں کسی طور سے 'نظریہ' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نظریہ سازی کے لیے منطقی طرزِ فکر و استدلال اور مستند دلائل و براہین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو نہ تو کھچڑی زبان ہے، اور نہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے، اور نہ ہی یہ وادیِ سندھ میں معرضِ وجود میں آئی۔ اردو کی ابتدا دکن سے بھی نہیں ہوئی، اور نہ یہ مہاراشٹری پراکرت کی زائیدہ ہے۔ اردو کو لشکری زبان کہنا بھی کسی فسانے سے کم نہیں۔

(4)

اردو زبان کی لائقِ اعتنا اور مربوط و مدلل تاریخ جس میں لسانی تاریخ نویسی کے متذکرہ تمام اصولوں کی پابندی کی گئی ہو اور جو تحقیق کے تقاضوں کو بھی بدرجۂ اتم پورا کرتی ہو اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ تاہم یہاں ہم زمانی اعتبار سے اردو میں لکھی ہوئی چند ان

تصانیف کا ذکر کریں گے جو کلی یا جزوی طور پر تاریخ زبانِ اردو کے مواد اور مسائل و مباحث کے لیے جانی جاتی ہیں، خواہ ان کے مصنفین کے نظریات ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور متغایر ہی کیوں نہ ہوں۔

1- حکیم سید شمس اللہ قادری، 'اردوئے قدیم' (1925ء)

حکیم سید شمس اللہ قادری حیدرآباد (دکن) کے رہنے والے تھے اور پیشے کے لحاظ سے ماہرِ علمِ آثارِ قدیمہ (Archaeologist) تھے۔ انھیں تاریخ سے بھی گہری دلچسپی تھی اور وہ کئی زبانیں بھی جانتے تھے۔

انھیں تاریخ زبانِ اردو سے بھی خاص دلچسپی پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں 'اردوئے قدیم' کی تصنیف و تالیف عمل میں آئی جو 1925ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد 1929ء میں شائع ہوا اور تیسرا ایڈیشن مطبع تیج کمار (وارث مطبع نول کشور) لکھنؤ سے 1967ء میں طبع ہوا۔

سید شمس اللہ قادری نے 'اردوئے قدیم' کے ابتدائی 33 صفحات میں شمالی ہند میں اردو کے آغاز و ارتقا پر سطحی انداز سے روشنی ڈالی ہے اور امیر خسرو (1325-1253) کے ذکر پر اس حصے کو ختم کیا ہے۔ وہ اپنی بات کا آغاز سنسکرت کے ذکر سے کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ''آریاؤں کی مقدس زبان'' ہے۔ پھر وہ پراکرتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خیال میں سنسکرت میں تغیر سے بنی تھیں۔ برج بھاشا کو وہ شورسینی پراکرت تصور کرتے ہیں جس کا مرکز ''برج'' کا علاقہ تھا، لیکن جو ان کے بقول ایک وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اور جسے مولودِ مسیح سے قبل ایک شائستہ زبان کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ ''زمانہ حال کی تاریخی اور لسانی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زبانِ اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا ہے۔''[1] شمس اللہ قادری کا برج بھاشا کو اردو کا ''منبع و مخرج'' قرار دینا اب غلط ثابت ہو چکا ہے، اور اس بات کی بھی تردید ہو چکی ہے کہ پراکرت کے دور میں (جو ہند آریائی کا وسطی دور ہے) برج بھاشا کا وجود تھا۔ برج بھاشا کو مولودِ مسیح سے قبل کی زبان بتانا بھی تعجب خیز امر ہے۔

سید شمس اللہ قادری نے شمالی ہند میں اردو کے آغاز و ارتقا کے جائزے کے بعد دکن اور گجرات میں اردو کے ارتقا پر روشنی ڈالی ہے اور وہاں کے قدیم شعرا اور مصنفین کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نثر و نظم کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے متذکرہ کتاب میں دکنی اردو کے قدیم املا کی مثالیں بھی جمع کر دی ہیں اور ان کا موازنہ اردو کے مروجہ املا سے کیا ہے، نیز دکنی اردو کی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات سے بھی بحث کی ہے۔ اس کتاب میں قدیم اردو (دکنی اردو) کا کثیر مواد جمع کر دیا گیا ہے جو ایک لائق تحسین عمل ہے۔ اس کے باوصف یہ کتاب اردو زبان کی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس میں کئی فروگذاشتیں ہیں۔

2- حافظ محمود خاں شیرانی، 'پنجاب میں اردو' (1928ء)

حافظ محمود خاں شیرانی (1880-1946ء) کی زیرِ مطالعہ کتاب کا نام اگرچہ 'پنجاب میں اردو' ہے، لیکن اسے تاریخِ زبانِ اردو کے ذیل میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ زبانِ اردو کی تاریخ پنجاب کے سیاق و سباق (Context) میں بیان کرتی ہے۔

شیرانی پنجاب کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیتے ہیں اور اس کے ثبوت میں تاریخی و لسانی دلائل پیش کرتے ہیں اور پنجاب کے اردو شعراء اور مصنفین کے نثر و نظم کے نمونے منظرِ عام پر لاتے ہیں جن پر ان کے بقول پنجابی زبان کے اثرات پڑے ہیں، لیکن شیرانی یہ بھول جاتے ہیں کہ 1000 سنہ عیسوی کے بعد پنجاب میں شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے جو زبان معرضِ وجود میں آئی وہ اردو نہیں، بلکہ پنجابی تھی جسے آج پنجاب کا ہر فرد و بشر بہ طورِ مادری زبان بولتا ہے۔ اگر اردو پنجاب میں پیدا ہوئی ہوتی تو آج اہلِ پنجاب کی مادری زبان اردو ہوتی، نہ کہ پنجابی۔

محمود شیرانی اپنی متذکرہ کتاب میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ''اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے''،[2] یعنی پنجاب۔ پھر وہ دوسرا نظریہ یہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی جاتے ہیں، اس لیے وہ اردو کو بھی اپنے ساتھ لے کر

جاتے ہیں۔ ان کے اس نظریے کے مطابق ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں۔''[3] ان کے تیسرے نظریے کی رو سے ''پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔''[4] اپنے انھی تینوں نظریات کو شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ ہند آریائی خاندانِ السنہ پر محمود شیرانی کی گرفت مضبوط نہیں تھی اور وہ جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا اور ان کی تقسیم اور گروہ بندی پر گہری نظر نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ پنجابی اور دہلی ونواحِ دہلی کی بولیوں کے درمیان اختلاف کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ مشرقی پنجابی اور مغربی پنجابی (لہندا) کے فرق کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی ابتدا کی نظریہ سازی میں ان سے چوک ہوئی۔ اردو نہ تو پنجاب میں پیدا ہوئی اور نہ پنجابی سے نکلی۔ صورتِ حال یہ ہے کہ جس زمانے میں پنجاب میں پنجابی ارتقا پارہی تھی اسی زمانے میں دہلی ونواحِ دہلی میں چند بولیاں بھی سر اٹھارہی تھیں جن میں کھڑی بولی کو امتیاز حاصل تھا، چنانچہ یہی کھڑی بولی اردو کا ڈھانچا اور کینڈا (Structure) بنی اور اس پر نواحِ دہلی کی دوسری بولیوں بالخصوص ہریانوی کے اثرات پڑے جس کی تائید دکنی اردو سے ہوتی ہے۔ دہلی ونواحِ دہلی کی بولیوں کی قدامت امیر خسرو کے اُس بیان سے بھی ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' (1318ء) میں ہندوستان کی زبانوں کے سلسلے میں دیا ہے، بلکہ مسعود حسین خاں کا تو یہ خیال ہے کہ ''شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔''[5]

جہاں تک کہ تاریخی دلائل کا تعلق ہے تو تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ پنجاب سے دہلی کی جانب کبھی بڑے پیمانے پر نقلِ مکانی ہوئی ہو جس نے پوری خلقت کو اُدھر سے ادھر منتقل کردیا ہو یہاں تک کہ اردو بولنے والوں سے پورا پنجاب خالی ہوگیا ہو۔ یہ محض مفروضہ ہے جسے شیرانی کے ذہن کی اختراع کہہ سکتے ہیں۔ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نظریے کے ثبوت میں ان کے پاس کوئی ''قدیم شہادت یا سند'' موجود نہیں ہے۔ اب رہی بات لسانی دلائل کی۔ اس ضمن میں شیرانی کہتے ہیں کہ صرف ونحو کے لحاظ

سے پنجابی اور اردو میں بیحد قربت پائی جاتی ہے۔ لیکن جب ان دونوں زبانوں کے صرفی و نحوی نیز قواعدی عناصر کا تقابل کیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ان میں کافی اختلافات موجود ہیں۔ مسعود حسین خاں کا تو واضح لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ ''پنجابی اور اردو میں بعض ایسے اہم اختلافات تا حال موجود ہیں جن کی بنا پر اردو کا پنجابی سے ماخوذ ہونا کسی طرح تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔''[6] شیرانی قدیم اردو بالخصوص دکنی اردو پر پنجابی کے اثرات بتاتے ہیں، لیکن یہ ہریانوی کے اثرات بھی ہیں جو دہلی کے شمال مغرب کی بولی ہے۔ ابتدا میں جب اردو سیال حالت میں تھی تو اس پر ہریانوی کے گہرے اثرات مرتسم ہوئے تھے۔ اسی حالت میں وہ دکن پہنچی تھی۔ ہریانوی کے بعض اثرات دکنی اردو پر آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بقول مسعود حسین خاں ''قدیم اردو اور دکنی کا 'پنجابی پن' اس کا ہریانی پن بھی ہے۔''[7]

پنجابی اور قدیم اردو (دکنی اردو) میں پائی جانے والی بعض مماثلتوں کی بنیاد پر حافظ محمود خاں شیرانی کا یہ نظریہ قائم کرلینا کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی یا پنجابی سے نکلی لسانیاتی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول نہیں اور نہ اسے عقلِ سلیم تسلیم کرنے کو تیار ہے۔ اسی لیے اس نظریے کو رَد کردیا گیا۔ لسانی تاریخ نویسی کے اصولوں پر بھی یہ کتاب پوری نہیں اترتی۔

3- سید محی الدین قادری زور، 'ہندوستانی لسانیات' (1932ء)

سید محی الدین قادری زور (1962-1904ء) ایک تربیت یافتہ ماہرِ لسانیات (Trained Linguist) تھے۔ انھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت انگلستان اور فرانس کی دانش گاہوں میں قیام کر کے حاصل کی تھی۔ ان کا وطنِ مالوف حیدرآباد (دکن) تھا۔ یورپ سے وطن واپسی کے بعد انھوں نے 'ہندوستانی لسانیات' کے نام سے اردو زبان کی تاریخ لکھی جو 1932ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تسوید و ترتیب میں انھوں نے جدید اصولِ لسانیات سے کام لیا، اور ہند آریائی لسانیات کے بارے میں جو نئی تحقیقات ہوئی تھیں، انھیں سامنے رکھا۔ یہ ان کی خوش نصیبی رہی ہے کہ انھیں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (لندن یونیورسٹی) میں آریائی لسانیات کے ماہر آر. ایل. ٹرنر

(R.L.Turner) اور اردو اور پنجابی کے معروف اسکالر ٹی. گریہم بیلی (T. Grahame Baily) کے لکچرز سے استفادے کا موقع ملا۔

محی الدین قادری زور کی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' میں لسانی تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کو کسی حد تک برتا گیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اول میں زبان اور علم زبان (لسانیات) سے عمومی بحث کی گئی ہے، اور لسانی تبدیلی (Language Change) بالخصوص صوتی تغیر وتبدل پر تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کتاب میں دنیا کے لسانی خاندانوں کا ذکر ملتا ہے۔ زور نے اردو سے تعلق رکھنے والے ہند آریائی خاندانِ السنہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، اور اس کی تاریخ کو لسانی ارتقا کے لحاظ سے تین ادوار — قدیم، درمیانی اور جدید ہند آریائی میں تقسیم کیا ہے۔ وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں قدیم ہند آریائی دور میں کئی بولیاں رائج تھیں جو تغیر وتبدل حاصل کر کے آج ہند آریائی زبانوں کی شکل میں موجود ہیں۔

محی الدین قادری زور نے آریوں کے داخلۂ ہند کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں جارج اے. گریرسن (George A. Grierson) کے اس نظریے سے بھی بحث کی ہے جس کے مطابق آریا لوگ ہندوستان میں دو گروہوں میں داخل ہوئے۔ اس نظریے کی رو سے گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں کو اندرونی اور بیرونی زبانوں میں تقسیم کیا ہے۔ مغربی ہندی کی بولیوں (کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی) کا تعلق اندرونی گروہ کی زبانوں سے ہے۔

زور نے جدید ہند آریائی زبانوں کو ان کی ''لسانی اور ترکیبی'' خصوصیتوں کے لحاظ سے درج ذیل پانچ شاخوں میں تقسیم کیا ہے: 1) شمال مغربی، 2) جنوب مغربی، 3) وسطی، 4) مشرقی، 5) جنوبی۔ اردو-ہندی کا تعلق وسطی شاخ سے ہے۔ وسطی شاخ در حقیقت گریرسن کی تخلیق کردہ ''مغربی ہندی'' ہے جس کی پانچ بولیاں ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اردو-ہندی کا تعلق کھڑی بولی سے ہے جسے زور نے ''ہندوستانی'' کہا ہے۔ وہ ''ہندوستانی'' کی اصطلاح اردو کے متبادل کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن اکثر مقامات پر

یہ اصطلاح ہندی، اردو دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن آج 'ہندوستانی' نام کی کسی زبان کا وجود نہیں۔

محی الدین قادری زور نے اپنی متذکرہ کتاب کے حصۂ دوم میں اردو کے آغاز کے مختلف نظریوں سے بحث کی ہے۔ وہ دکن میں اردو کی پیدائش کے منکر ہیں۔ وہ سندھ میں بھی اردو کے پیدا ہونے کی تردید کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ بھی تقریباً رد کر دیا ہے، اور فتحِ دہلی (1193ء) کے بعد دہلی ونواحِ دہلی میں اردو کے معرضِ وجود میں آنے کی مستند رائے سے بھی انھیں اتفاق نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے، بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی۔''[8] لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سی زبان تھی اور کہاں بولی جاتی تھی جو پنجابی اور اردو دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی۔ البتہ انھوں نے اردو کے پنجابی اور کھڑی بولی سے مشابہ ہونے کا ذکر ضرور کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اردو زیادہ کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی،''[9] اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں۔ زور نے اردو پر ہریانوی کے اثر کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''یہاں ایک اور بات مدِنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔''[10] اس سے پہلے زور اردو کو پنجابی کے مشابہ بتا چکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہریانوی نے قدیم اردو (دکنی اردو) کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ دکنی اردو کی لسانی خصوصیات یا امتیازات کی توجیہ بڑی حد تک ہریانوی سے کی جا سکتی ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حافظ محمود خاں شیرانی ان خصوصیات کو پنجابی زبان سے منسوب کرتے ہیں۔

جہاں تک کہ اردو کے مخرج ومنبع اور مولد ومنشا کا تعلق ہے، محی الدین قادری زور نے ماہرِ لسانیات ہوتے ہوئے کوئی ٹھوس نظریہ پیش نہیں کیا۔ اس ضمن میں ان کی آراء نہایت مبہم ہیں جن سے قاری کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ وہ اردو کو کبھی پنجابی سے مشابہ بتاتے ہیں تو کبھی کھڑی بولی سے متاثر گردانتے ہیں۔ وہ اس پر ہریانوی کے ''قابلِ لحاظ اثر'' کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اردو کو ایک ایسی زبان سے مشتق بتاتے ہیں جس سے پنجابی بھی نکلی ہے،

لیکن اس زبان کا وہ نہ تو کوئی نام بتاتے ہیں اور نہ پتا۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ زور نے مستند دلائل و براہین کی بنیاد پر اردو کے آغاز کا کوئی ایسا نظریہ پیش نہیں کیا جو قابلِ قبول ہو، اور جس کی حیثیت حرفِ آخر کی ہو!

لسانی تاریخ نویسی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ متعلقہ زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا جائے، چنانچہ اس خیال کے مدنظر محی الدین قادری زور نے اپنی متذکرہ کتاب کے حصۂ دوم میں اردو کے ارتقا سے بھی بحث کی ہے، لیکن اردو کا یہ ارتقا زمانی یعنی عہد بہ عہد ارتقا نہیں، بلکہ مکانی اعتبار سے ہے جس میں انھوں نے اردو کی ''سہ مرکزی تقسیم'' قائم کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''زبانِ ہندوستانی کا ارتقا پنجاب ہی سے شروع ہو چکا تھا، لیکن اس کے ثانوی مدارج دوآبہ، گجرات اور دکن میں تکمیل کو پہنچے۔ دہلی میں یہ زبان ڈیڑھ سو سال تک رہنے کے بعد گجرات اور دکن کا رخ کرتی ہے۔''[11] زور نے مکانی یا علاقائی اعتبار سے اردو کی جو ''سہ مرکزی تقسیم'' گجراتی، دکنی اور شمالی کے نام سے قائم کی ہے ان کی لسانی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے لسانی اختلافات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہ ایک طرح کا بولیوں کا مطالعہ (Dialect Study) ہے جس کی لسانیات میں بیحد اہمیت ہے۔

4- مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' (1948ء)

سید محی الدین قادری زور کے بعد مسعود حسین خاں (1919-2010ء) دوسرے اردو اسکالر ہیں جنھوں نے یورپ کی دانش گاہوں میں لسانیاتِ جدید کی تربیت حاصل کی۔ زور کی 'ہندوستانی لسانیات' (1932ء) کی اشاعت کے پندرہ سال بعد مسعود حسین خاں کا تحقیقی مقالہ 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' (1948ء) شائع ہوا جس پر انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ. ڈی کی سند تفویض ہوئی تھی۔ مسعود حسین خاں نے لسانیات کی اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لیے (1950ء میں) اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (لندن یونیورسٹی) میں داخلہ لیا، پھر کچھ عرصے بعد وہ پیرس (فرانس) گئے اور وہاں کی سوربون (Sorbonne University) سے انھوں نے 'عروضی صوتیات' (Prosodic Phonology) کے

موضوع پر مقالہ لکھ کر 1953ء میں ڈی. لٹ کی سند حاصل کی۔

ہر چند کہ مسعود حسین خاں نے لسانی تاریخ نویسی کے اصول مرتب نہیں کیے، لیکن ان کی تصنیف 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو (جس کا ساتواں ایڈیشن ترمیم و اضافے کے بعد 1987ء میں شائع ہوا) کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اسے نوکِ قلم پر لاتے وقت لسانی تاریخ نویسی کے ممکنہ اصولوں کی پوری طرح پاسداری کی ہے، چنانچہ کتاب کے ابتدائی دو ابواب میں انھوں نے ہند آریائی کے ارتقا سے بحث کی ہے جس میں آریوں کے وطن اور ان کے داخلۂ ہند سے لے کر ہند آریائی کے عہدِ قدیم، عہدِ وسطیٰ اور عہدِ جدید پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، پھر جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کی ہے، اور مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ گریرسن کی جدید ہند آریائی زبانوں کی اندرونی اور بیرونی زبانوں میں تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اندرونی زبان کی شاخ میں صرف مغربی ہندی ایک ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں... اندرونی گروہ کی نمائندہ زبان محض مغربی ہندی ہے۔ مغربی ہندی کا یہ نام مدھیہ دیشہ کی زبان کو گریرسن نے دیا ہے جس نے سب سے پہلے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی مدھیہ دیشہ کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے، کیوں کہ اسی علاقے میں سنسکرت، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش پروان چڑھتی ہیں جن کی سچی جانشین اس علاقے کی جدید بولیاں کھڑی بولی (ہندوستانی)، برج بھاشا، ہریانی، بندیلی اور قنوجی ہیں جن کے مجموعے کو گریرسن 'مغربی ہندی' کا جدید نام دیتا ہے۔"[12] اردو کا تعلق اسی مغربی ہندی کی کھڑی بولی سے ہے۔ قدیم کھڑی بولی (بعض ماہرینِ لسانیات کے نزدیک قدیم ہندوستانی) کے نمونے شمالی ہندوستان میں تقریباً 1000 سنہ عیسوی کے بعد سے ملنا شروع ہو جاتے ہیں جو اپ بھرنش کا آخری دور ہے اور جدید ہند آریائی زبانوں کے "ابھار" کا زمانہ ہے۔ مسعود حسین خاں نے اپنی متذکرہ کتاب میں اردو کی ابتدا سے متعلق محمد حسین آزاد، حافظ محمود خاں شیرانی اور سید سلیمان ندوی کے نظریوں کی ٹھوس دلائل کی بنیاد پر تردید کرتے ہوئے اردو کے آغاز کا ایک منفرد نظریہ تشکیل دیا ہے جسے لسانیاتی اعتبار سے سب سے مستند اور قابلِ قبول

نظریہ (Most acceptable theory) تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ ثلث صدی (75 سال) کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اسے چیلنج نہیں کیا جا سکا ہے۔

مسعود حسین خاں کے نظریے کی رو سے اردو فتحِ دہلی (1193ء) کے بعد دہلی و نواحِ دہلی میں پیدا ہوئی۔ شہر دہلی کو انھوں نے چار بولیوں کا ''سنگم'' بتایا ہے جہاں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا اور میواتی ملتی ہیں۔ کھڑی بولی، دہلی کے شمال مشرق کی بولی ہے۔ یہ علاقہ مغربی یوپی سے متصل ہے جسے دوآبہ گنگ و جمن بھی کہتے ہیں۔ ہریانوی دہلی کے شمال مغرب کی بولی ہے۔ یہ علاقہ صوبۂ ہریانہ سے ملا ہوا ہے۔ دہلی کے جنوب میں تھوڑی دوری پر برج بھاشا مل جاتی ہے اور جنوب مغرب میں میواتی کا چلن ہے جو راجستھانی کی ایک بولی ہے۔ ان بولیوں، بالخصوص کھڑی بولی اور ہریانوی نے اردو کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔''[13] اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا سے متعلق اپنے نظریے کی بنیاد امیر خسرو (1253-1325ء) کے اُس بیان پر رکھی ہے جو ان کی مثنوی ''نہ سپہر'' (1318ء) میں ہندوستانی زبانوں کے سلسلے میں ملتا ہے۔ خسرو ہندوستان کی گیارہ زبانوں کے ذکر کے بعد بارھویں زبان کا ذکر ''دہلی و پیرامنش'' کہہ کر کرتے ہیں جس سے ان کی مراد دہلی و نواحِ دہلی کی بولیاں ہیں، چنانچہ مسعود حسین خاں نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ''اردو کا ماخذ یہی بولیاں ہیں۔''[14] ان کی تحقیق کا ماحصل ان کا یہ بیان ہے:

> ''زبانِ 'دہلی و پیرامنش' اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے، اور 'حضرتِ دہلی' اس کا حقیقی مولد و منشا۔''[15]

5- شوکت سبزواری، 'اردو زبان کا ارتقا' (1956ء)

شوکت سبزواری (1908-1973ء) کا تعلق میرٹھ (اتر پردیش) سے تھا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پہلے ڈھاکہ پہنچے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے، پھر کراچی جا بسے اور وہیں رحلت فرمائی۔

شوکت سبزواری محقق اور نقاد ہونے کے علاوہ ماہر لسانیات بھی تھے۔ لسانیات سے

ان کی دلچسپی بہت گہری تھی۔ لسانی موضوعات پر لکھی ہوئی چار کتابیں ان کی یادگار ہیں جن میں سے ایک کتاب کا نام 'اردو زبان کا ارتقا' ہے جو 1956ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب کی وجہ سے انھیں خاصی شہرت حاصل ہوئی اور علمی دنیا میں ایک ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے انھوں نے اپنی جگہ بنالی۔

مسعود حسین خاں کی 'مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو' (1948ء) کے بعد شوکت سبزواری کی 'اردو زبان کا ارتقا' (1956ء) اردو کی لسانی تاریخ سے متعلق دوسری اہم کتاب ہے جس میں لسانی تاریخ نویسی کے اصولوں کی بڑی حد تک پابندی کی گئی ہے، اگرچہ ان کے نظریات دوسرے ماہرین لسانیات سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ اس کتاب میں سب سے پہلے تو انھوں نے اردو کے حسب ونسب اور خاندان کا پتا لگایا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے جس کا تعلق نسلی ونسبی اعتبار سے ہند یورپی خاندانِ السنہ سے ہے جو ایک بڑا اور اہم لسانی خاندان ہے، پھر ہم رشتہ بولیوں اور زبانوں سے اردو کا مقابلہ کیا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ان بولیوں کا اردو کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ اردو کو محمد حسین آزاد نے برج بھاشا سے، اور محمود خاں شیرانی نے پنجابی سے ماخوذ بتایا ہے، لیکن شوکت سبزواری نے تقابلی مطالعے کے ذریعے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی ہے کہ برج بھاشا اور پنجابی میں سے کوئی بھی زبان اردو کی اصل نہیں۔ ان کے خیال میں اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ تنہا اس امر کا ثبوت ہے کہ اردو برج بھاشا سے ماخوذ نہیں۔ اسی طرح پنجابی اور اردو کے تقابلی مطالعے سے سبزواری نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی بعض فعلی شکلیں اور صیغے پنجابی سے زیادہ قدیم ہیں اور ان کا سلسلہ قدیم پراکرت سے جا کر مل جاتا ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اردو پنجابی سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے:

> ''دو یا دو سے زیادہ زبانوں کی مماثلت اور بعض اصول واصوات میں مشابہت اپنی جگہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ زبانیں متحد الماخذ ہیں یا ان میں سے ایک دوسرے کی اصل ہے۔ اس کے لیے زبان کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ زبان کی لسانی خصوصیات کا کھوج لگا کر یہ دیکھنا کہ ان کی

ارتقائی تاریخ کیا ہے اور وہ کیسے اور کہاں سے آئیں۔،،(16)

شوکت سبزواری نے اردو کے آغاز کے جس نظریے کی تشکیل اپنی متذکرہ کتاب میں کی ہے وہ تمام نظریوں سے الگ تھلک ایک منفرد نظریہ ہے جس کی جانب کسی محقق یا ماہرِ لسانیات کی توجہ اب تک مبذول نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے اور اس کی ابتدا دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح شورسینی اپ بھرنش کے اختتام (1000سنہ عیسوی) کے بعد بارھویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو بارھویں صدی کے آس پاس جس بولی کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے وہ 'کھڑی بولی' ہے جو مغربی یوپی (دوآبہ' گنگ وجمن) اور شمال مشرقی دہلی کی بولی ہے، لیکن شوکت سبزواری کو اس نظریے سے اختلاف ہے۔ وہ اردو کی اصل اور اس کی ابتدا کو وسطی ہند آریائی عہد میں تلاش کرتے ہیں جو 'پراکرت' کا عہد ہے۔ اردو کو وہ پراکرت سے ماخوذ بتاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو پراکرت سے ماخوذ نہیں، بلکہ شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ وسطی ہند آریائی عہد 500 قبلِ مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے ابتدائی پانچ سو برس (500ق م تا آغاز سنہ عیسوی) کو اولین یا پہلی پراکرت کہا گیا ہے۔ پالی کا ارتقا اسی زمانے میں ہوا۔ اشوک کے کتبے بھی سنگی لوحوں پر اسی پراکرت میں نصب ہوئے۔ شوکت سبزواری کہتے ہیں:

> ''اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجے کو پاکر ٹھہر گئی، ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولی جانے کے باعث برابر تشتی ترشاتی اور پھلتی پھولتی رہی۔'' (17)

اس سلسلے میں انھوں نے اردو اور پالی کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے، اور صوتی و صرفی مماثلتوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

یہاں اس امر کا ذکر کرتا چلوں کہ شوکت سبزواری نے اپنی متذکرہ کتاب میں ہند آریائی لسانیات کے اکثر مسلمات سے روگردانی کی ہے، مثلاً وہ سنسکرت کو پالی کی بنیاد تسلیم

نہیں کرتے۔ پالی کے ارتقا کا زمانہ پہلی پراکرت کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں جو بولیاں رائج تھیں، پالی ان میں سے ایک تھی۔ اس کا چلن مگدھ (موجودہ صوبۂ بہار اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ) میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ (ق م c. 480-400) ماگدھی پراکرت بولتے تھے۔

شوکت سبزواری پالی کی ''اصل'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پالی کا کینڈا بتاتا ہے کہ اس کی اصل سنسکرت کی جگہ ویدک زمانے کی کوئی اور بولی ہے۔ سنسکرت اور پالی مساوی درجے کی زبانیں ہیں۔ ان کی بنیاد الگ الگ دو قدیم بول چال کی زبانوں پر ہے۔ دونوں مدتوں تک ادب، فن اور فلسفہ کے خیالات کے اظہار کے لیے استعمال ہوتی رہیں۔''(18)

لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''سنسکرت میں صوتی اور صرفی تغیرات ہوئے تو اس نے اولین پراکرت یعنی 'پالی' کا روپ اختیار کیا۔''(19) سبزواری کے ان دونوں بیانات میں جو تضاد ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

شوکت سبزواری نے جارج گریرسن کے اس نظریے سے بھی اختلاف کیا ہے کہ اس نے شورسینی اپ بھرنش کے خاتمے کے بعد 'مدھیہ دیشہ' یعنی درمیانی علاقے (Midland) میں 'مغربی ہندی' کے نام سے ایک زبان قائم کی جس سے پانچ ملتی جلتی بولیاں ارتقا پذیر ہوئیں جن کے نام ہیں: 1) کھڑی بولی، 2) ہریانوی، 3) برج بھاشا، 4) بندیلی، اور 5) قنوجی۔ کھڑی بولی سے گریرسن 'ہندوستانی' مراد لیتا ہے جس کی ادبی شکل کو وہ 'اردو' کہتا ہے۔ شوکت سبزواری کہتے ہیں:

''مغربی ہندی جسے کھڑی اور برج کا سرچشمہ اور ماخذ بتایا جاتا ہے ایک طرح سے فرضی اور خیالی زبان ہے... برج، کھڑی، بندیلی اور قنوجی کے علاقے میں کبھی کوئی ایک زبان نہ تھی جو ان بولیوں کے درمیان کی چیز ہو، اور جو بعد میں ان بولیوں میں بٹ گئی ہو۔ ان علاقوں میں چند ملتی جلتی زبانوں کو دیکھ کر ان کا ایک مشترک ماخذ فرض کرنا ایک ایسا فعل ہے جسے فکرِ

انسانی کی اختراع سمجھنا چاہیے۔''[20]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش سے ہوا جس کا ماخذ شورسینی پراکرت ہے، لیکن شوکت سبزواری اس لسانیاتی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ''اردو کی صرفی ونحوی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں۔''[21] سبزواری اردو کی بعض صوتی خصوصیات کو 'پالی' سے مشابہ بتاتے ہیں جو ان کے خیال میں نہ شورسینی پراکرت میں پائی جاتی ہیں اور نہ اپ بھرنش میں۔ سبزواری اپنے اس بیان کی تردید بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ''اردو کی اصل اور اس کی ابتدا'' میں لکھتے ہیں:

> ''اردو بے شبہ پراکرت سے ماخوذ ہے...... یہ پراکرت جسے میں اردو کی اصل قرار دے رہا ہوں سنسکرت، پالی، شورسینی، پراکرت، مغربی اپ بھرنش کے سلسلۃ الذہب کی ایک گم شدہ کڑی ہے۔''[22]

شوکت سبزواری یہ بھی کہتے ہیں کہ ''قدیم ہندی کو اردو کی اصل نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔''[23] قدیم ہندی سے سبزواری کی مراد قدیم کھڑی بولی ہے جو شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ ہے اور اردو کی ''اصل'' ہے۔ بارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں (1193ء میں فتح دہلی کے بعد) دہلی میں وارد ہونے والے مسلمانوں نے جس زبان کو 'ہندوی' اور 'ہندی' کہا اور جو بعد میں 'اردو' کہلائی، اس کی ''اصل'' قدیم ہندی ہی ہے۔ کھڑی بولی اسی قدیم ہندی کے بطن سے پیدا ہوئی اور اسی کھڑی بولی نے اردو کا روپ اختیار کیا۔ اس اعتبار سے قدیم ہندی نو وارد مسلمانوں کی پروردہ 'ہندوی' اور 'ہندی' کی ماں تصور کی جاسکتی ہے۔ ہم اسے قدیم ترین کھڑی بولی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مسعود حسین خاں نے اسے 'قدیم کھڑی' اور 'قدیم اردو' کے ناموں سے پکارا ہے۔ گیان چند جین لکھتے ہیں کہ ''کھڑی بولی نہ بیرونی فاتح لے کر آئے، نہ یہ خلا میں پیدا ہوگئی۔ ہندوستان میں اس کی کوئی روایت، کوئی مورث، کوئی آبا و اجداد رہے ہوں گے۔''[24] ظاہر ہے کہ کھڑی بولی کی ''مورث'' یہی 'قدیم ہندی' یا قدیم ترین کھڑی

بولی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

شورسینی اپ بھرنش کے خاتمے (1000 سنہ عیسوی) اور فتحِ دہلی (1193ء) کے درمیان کے تقریباً دو سو سال کے عرصے میں 'قدیم ہندی' یا قدیم ترین کھڑی بولی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں انھیں ''اوہٹھ'' کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں ناتھ پنتھی جوگیوں کے دوہے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دوہوں کی زبان میں قدیم ہندی (قدیم کھڑی بولی) کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے علاوہ 'بیسل دیو راسو' اور چندر بردائی کی 'پرتھوی راج راسو' کے بعض حصے بھی قدیم ترین کھڑی بولی میں ہیں۔ ودیاپتی کی 'کیرتی لتا' بھی اسی دور کی تصنیف ہے جس میں قدیم کھڑی بولی کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ متذکرہ عہد کی سب سے اہم تصنیف 'ہیم چندر شبدانوشاسن' ہے جو ایک جین عالم ہیم چندر کی لکھی ہوئی قواعد ہے۔ اس میں کئی دوہے ایسے ملتے ہیں جن کی زبان قدیم کھڑی بولی ہے۔ اس میں الف (ا) پر منتہی ہونے والے الفاظ ملتے ہیں جو اردو کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

شوکت سبزواری کی یہ عجیب منطق ہے کہ وہ شورسینی اپ بھرنش سے ارتقا پانے والی ''قدیم ہندی'' (=قدیم کھڑی بولی) کو چھوڑ کر قدیم ہند آریائی عہد کی بولیوں کو گرفت میں لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو انھیں بولیوں میں سے ایک ہے، اور پالی کو اس کی ترقی یافتہ، ادبی اور معیاری شکل بتاتے ہیں۔''[25] سبزواری نے اردو کے آغاز کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ بہت مبہم، الجھا ہوا اور ایک لحاظ سے غیر منطقی نظریہ ہے۔ وہ اردو کا آغاز پراکرت اور پالی میں تلاش کرتے ہیں، بلکہ ویدک عہد تک پہنچ جاتے ہیں جو بے سود ہے۔ اردو کا آغاز اس وقت سے ماننا ہوگا جب سے اس زبان کی لسانیاتی خصوصیات (Linguistic features) ابھرنا شروع ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اردو کا ابھار شورسینی اپ بھرنش کے خاتمے (1000 سنہ عیسوی) کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسے ہم قدیم ہندی بھی کہہ سکتے ہیں اور قدیم کھڑی بولی بھی۔ نو وارد مسلمانوں نے، جو دہلی میں 1193ء کے بعد سکونت پذیر ہوئے، اسی زبان کو 'ہندوی' اور 'ہندی' کہا۔

حواشی

1- حکیم سید شمس اللہ قادری، 'اردوے قدیم' (لکھنؤ: مطبع تیج کمار، 1967ء)، ص6۔
2- حافظ محمود خاں شیرانی، 'پنجاب میں اردو' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، 1970ء)، ص99۔
3- ایضاً، ص99۔
4- ایضاً، ص84۔
5- مسعود حسین خاں، ''پیش لفظ''، 'مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو'، ساتواں ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء)۔
6- مسعود حسین خاں، ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ''، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، اضافہ شدہ ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2007ء)، ص88۔
7- مسعود حسین خاں، ''پیش لفظ''، محولہ بالا کتاب۔
8- سید محی الدین قادری زور، 'ہندوستانی لسانیات' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، 1960ء)، ص95۔
9- ایضاً، 95۔
10- ایضاً، ص95۔
11- ایضاً، ص97۔
12- مسعود حسین خاں، محولہ بالا کتاب، ص56 تا 57۔
13- ایضاً، ص236۔
14- ایضاً، ص262۔
15- ایضاً، ص262۔

16- شوکت سبزواری، 'اردو زبان کا ارتقا' (دہلی: چمن بک ڈپو، اردو بازار، س ن)، ص 104 تا 105۔

17- ایضاً، ص 105۔

18- ایضاً، ص 84۔

19- ایضاً، ص 78۔

20- ایضاً، ص 101۔

21- ایضاً، ص 102۔

22- شوکت سبزواری، ''اردو کی اصل اور اس کی ابتدا''، مشمولہ 'اردو لسانیات' از شوکت سبزواری، اشاعتِ اول (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1975ء)، ص 11۔

23- شوکت سبزواری، محولۂ بالا کتاب ('اردو زبان کا ارتقا')، ص 102۔

24- گیان چند جین، 'لسانی مطالعے'، پہلا ایڈیشن (نئی دہلی: ترقی اردو بورڈ، حکومتِ ہند، 1973ء)، ص 176۔

25- شوکت سبزواری، محولۂ بالا کتاب ('اردو زبان کا ارتقا')، ص 105۔

●●●

اردو اور ہندی کا سماجی لسانیاتی تناظر

(مردم شماری کے اعداد و شمار کے حوالے سے)

ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے۔ یہاں نہ صرف نسلی، تہذیبی اور مذہبی رنگارنگی پائی جاتی ہے، بلکہ لسانی بوقلمونی بھی اس ملک کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ہندوستان کی لسانی تکثیریت کا بڑی حد تک اندازہ ہمیں یہاں کی مردم شماری سے ہوتا ہے جو ہر دس سال بعد عمل میں آتی ہے۔ مردم شماری ایک ایسا طریقِ کار ہے جو ہندوستان کی لسانی صورتِ حال اور سماجی لسانیاتی تناظر (Sociolinguistic perspectives) کو اعداد و شمار کی روشنی میں سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

ہندوستان کی 2011ء کی مردم شماری سے مادری زبان کے جو اعداد و شمار برآمد ہوئے ہیں وہ نہایت حیران کن ہیں۔ اس مردم شماری کی رو سے ہندوستان میں 19,569 مادری زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن مردم شماری کے لسانی اندراجات کے تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ لوگ مادری زبان کے بارے میں بڑے مبہم تصورات رکھتے ہیں۔ مادری زبان کو بالعموم علاقے، مذہب، پیشے، ذات پات اور قومیت کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مادری زبان کے لیے کئی کئی نام استعمال کیے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں کثیر تعداد میں مادری زبانیں مندرج ہو جاتی ہیں۔

سنہ 2011ء کی مردم شماری میں مندرج تمام مادری زبانوں کی چھان بین اور تجزیے کے بعد 121 ایسی مادری زبانوں کی شناخت عمل میں آئی ہے جن میں سے ہر ایک زبان کے

بولنے والوں کی تعداد دس ہزار (10,000) یا اس سے زیادہ ہے۔ ان میں سے 22 زبانوں کی حیثیت درجِ فہرست زبانوں (Scheduled languages) کی ہے کہ ان کا ذکر دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈیول (8th Schedule to the Constition of India) میں ملتا ہے۔ درجِ فہرست زبانوں میں صرف وہ زبانیں شامل کی گئی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ (10,00,000) یا اس سے زیادہ ہے۔ یہ زبانیں ہیں: (1) آسامی، (2) بنگالی، (3) بوڑو، (4) ڈوگری، (5) گجراتی، (6) ہندی، (7) کنڑ، (8) کشمیری، (9) کونکنی، (10) ملیالم، (11) منی پوری، (12) مراٹھی، (13) میتھلی، (14) نیپالی، (15) اڑیا، (16) پنجابی، (17) سنسکرت، (18) سنتھالی، (19) سندھی، (20) تامل، (21) تلگو، اور (22) اردو۔ [1]

ہندوستان کی کثیر آبادی، یعنی 96.71% فی صد آبادی انھی زبانوں کو بولتی ہے۔ بقیہ 3.29% فی صد لوگ دوسری زبانیں بولتے ہیں۔ درجِ فہرست زبانیں ہندوستان کی بڑی زبانیں (Major languages) تسلیم کی گئی ہیں۔ انھیں آئینی زبانیں (Constitutional languages) بھی کہتے ہیں۔ ان میں سے باستثنائے اردو، سندھی، اور سنسکرت، سبھی زبانیں علاقائی زبانیں (Regional languages) ہیں۔ اردو اور سندھی کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے۔ سنسکرت بھی اگرچہ علاقائی زبان نہیں ہے، لیکن اسے ہندوستان کی مقتدر اور ثروت مند کلاسیکی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو اگرچہ اصطلاحی معنی میں ہندوستان کے کسی بھی صوبے یا مرکز کے زیرِ انتظام علاقے کی 'علاقائی' یا اکثریتی زبان نہیں ہے، لیکن بعض صوبوں میں جہاں ہندی یا بعض دوسری درجِ فہرست زبانیں بہ لحاظِ تعداد و تناسب پہلی زبان کا درجہ (Rank) رکھتی ہیں اور علاقائی زبانیں کہی جاتی ہیں، ان میں سے بعض علاقوں (صوبوں) میں اردو دوسری بڑی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں اردو 'ذیلی علاقائی زبان' (Sub-regional language) کہی جاسکتی ہے۔

ہندوستان کی 22 درجِ فہرست زبانوں کے علاوہ، 99 مادری زبانیں، 'غیر درجِ فہرست زبانیں' (Non-scheduled languages) ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے

والوں کا مجموعی تناسب درج فہرست زبانوں کے بولنے والوں کے مجموعی تناسب کے مقابلے میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے،، بہت ہی کم ہے۔

جدول-1

دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈیول کی زبانیں[2]

ہندوستان کی کل آبادی کے تناسب سے (مردم شماری 2011ء)

زبانیں	بولنے والوں کی تعداد	فی صد
1- ہندی	528,347,193	43.63%
2- بنگالی	97,237,669	8.03%
3- مراٹھی	83,026,680	6.86%
4- تلگو	81,127,740	6.70%
5- تامل	69,127,881	5.70%
6- گجراتی	55,492,554	4.58%
7- اردو	50,772,631	4.19%
8- کنڑ	43,706,512	3.61%
9- اڑیا	37,521,324	3.10%
10- ملیالم	34,838,819	2.88%
11- پنجابی	33,124,726	2.74%
12- آسامی	15,311,351	1.26%
13- میتھلی	13,583,464	1.12%
14- سنتھالی	10,413,637	0.83%

15- کشمیری	7,368,192	0.61%
16- نیپالی	2,926,168	0.24%
17- سندھی	2,772,264	0.23%
18- ڈوگری	2,596,767	0.21%
19- کونکنی	2,256,502	0.19%
20- میتیئی (منی پوری)	1,761,079	0.15%
21- بوڑو	1,482,929	0.12%
22- سنسکرت	دس لاکھ (1,000,000) سے کم بولنے والے	—

ہندی اور اردو دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈیول کی دو اہم زبانیں ہیں۔ جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا گیا ہے، ان دونوں زبانوں کا شمار ہندوستان کی بڑی زبانوں (Major languages) میں ہوتا ہے۔ سنہ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق ہندی بولنے والوں کی مجموعی آبادی ہندوستان کی کل آبادی کا 43.63% فی صد ہے، جب کہ اردو بولنے والوں کی آبادی، ہندوستان کی مجموعی آبادی کا 4.19% فی صد ہے۔ بہ لحاظِ تناسبِ آبادی ہندی، ہندوستان کی پہلی بڑی زبان ہے۔ اسے ہندوستان کی اکثریتی زبان بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ہندوستان کی اکثریت ہندی زبان بولتی ہے۔ اس لحاظ سے اردو، ہندوستان کی ساتویں بڑی زبان قرار پاتی ہے۔ اپنے بولنے والوں کی تعداد و تناسب کے اعتبار سے، ہندی، بنگالی، مراٹھی، تلگو، تامل اور گجراتی ہندوستان کی علی الترتیب پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی بڑی زبانیں ہیں۔ اردو ساتویں بڑی زبان ہے۔ دیگر درجِ فہرست زبانوں مثلاً کنڑ، اڈیا، ملیالم، پنجابی، آسامی وغیرہ کا شمار بہ لحاظِ تعداد و تناسب، اردو کے بعد ہوتا ہے۔ اردو کے مقابلے میں بہ حیثیت مادری زبان، ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد کم ہے۔

جہاں تک کہ ہندوستان کی اردو گو آبادی کا تعلق ہے، اگر ہم 2011ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کا موازنہ، 2001ء کی مردم شماری سے کریں تو ہمیں پتا چلے گا کہ اس دس سال کے عرصے میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ سنہ 2001ء کی مردم شماری میں اردو بولنے والوں کی مجموعی تعداد پانچ کروڑ پندرہ لاکھ (5.15 Crore) تھی جو دس سال بعد 2011ء کی مردم شماری میں گھٹ کر پانچ کروڑ سات لاکھ (5.07 Crore) ہوگئی۔ تعداد کے گھٹنے کی وجہ سے اردو کے Rank میں بھی فرق پیدا ہو گیا۔ 2001ء کی مردم شماری میں درج فہرست زبانوں (Scheduled languages) میں اردو کو چھٹا مقام حاصل تھا، لیکن 2011ء کی مردم شماری میں اردو Degrade ہو کر ساتویں مقام پر پہنچ گئی اور چھٹا مقام گجراتی کو حاصل ہو گیا جو پہلے ساتویں نمبر پر تھی۔ اہلِ اردو کے لیے یہ امر تشویش کا باعث ہونا چاہیے، اور انھیں اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ اردو کی مقبولیت میں دس سال کے عرصے میں کیوں کر کمی واقع ہوگئی، جیسا کہ مردم شماری کے متذکرہ اعداد و شمار (Census data) سے ظاہر ہے۔

گذشتہ پانچ مردم شماریوں (1971ء تا 2011ء) کے اعداد و شمار پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں پتا چلے گا کہ اردو بولنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافے ہوتے رہے ہیں، لیکن 2011ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد بڑھنے کے بجائے آٹھ لاکھ کم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے زبان کے Rank میں بھی فرق آگیا ہے۔ ذیل کے جدول سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے:

جدول-2

اردو کے اعداد و شمار 1971 تا 2011ء

مردم شماری	اردو بولنے والوں کی تعداد	فی صد	درجہ Rank
1971ء	28,620,895	5.22%	6

1981ء	34,941,435	5.25%	5
1991ء	43,406,932	5.18%	6
2001ء	51,536,111	5.01%	6
2011ء	50,772,631	4.19%	7

اس کے علی الرغم ہندی (بہ طورِ پہلی زبان یا مادری زبان) بولنے والوں کی تعداد میں 2001ء اور 2011ء کے درمیان میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ 2001ء کی مردم شماری میں ہندی بولنے والوں کی کل تعداد 422,048,642 (42.20 Crore) تھی جو ہندوستان کی کل آبادی کا 41.03% فی صد ہے، لیکن دس سال کے عرصے میں، یعنی 2011ء کی مردم شماری میں یہ تعداد بڑھ کر 528,347,193 (52.83 Crore) ہوگئی اور تناسب 43.63% فی صد ہوگیا۔ ہندی بولنے والوں کی تعداد میں محض دس سال کے عرصے (2001ء تا 2011ء) میں 106,298,551 (10.62 Crore) لوگوں کا زبردست اضافہ نہایت تعجب خیز امر ہے۔ ہندوستان کی کل آبادی کے تناسب کے لحاظ سے یہ اضافہ 2.60% فی صد ہے۔

سنہ 2011ء کی مردم شماری میں اردو کے اعداد و شمار میں تخفیف کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مردم شماری کے وقت مسلمانوں کے ایک طبقے نے اپنی مادری زبان اردو کی بجائے ہندی لکھوائی ہو۔ اگرچہ زبان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، تاہم اردو کو ہندوستان میں مسلمانوں کی زبان سمجھ لیا گیا ہے، لیکن جنوبی ہند کے مسلمان اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ اپنے اپنے علاقے کی زبانیں بولتے ہیں، اور اردو سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی تھی اور یہیں کے ہندو اور مسلمان اسے بولتے تھے، لیکن اب اردو بولنے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ہندوؤں نے بوجوہ رفتہ رفتہ ہندی اختیار کرلی۔ ہر چند کہ ہندی کا علاقہ وہی ہے جو اردو کا علاقہ ہے لیکن اس علاقے میں اردو کی حیثیت ذیلی علاقائی زبان (Sub-regional language) کی ہوگئی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں ملتی جلتی

زبانیں ہیں۔ (اگر چہ ان میں تفریق واضح ہے) لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ یہاں کے اردو بولنے والوں کے ایک بڑے طبقے نے بوجوہ اپنی مادری زبان اردو کی بجائے 'ہندی' لکھوادی ہو (یا ہندی لکھ دی گئی ہو)۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شمالی ہند، بالخصوص اتر پردیش (یوپی) میں اردو کی حالت نہایت خستہ ہو چکی ہے۔ یہاں کے ہندوؤں میں تو اب خال خال ہی کوئی شخص اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہوگا۔ مسلمانوں کی نوجوان نسل تو اردو سے بالکل ہی نابلد اور بیگانہ ہو چکی ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو تو بول سکتی ہے، لیکن اسے اردو لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ اس کی بہت سی وجہیں ہیں جنھیں یہاں بیان کرنا اس مقالے کا موضوع نہیں۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ اردو زبان، ہندی میں رفتہ رفتہ ضم اور مدغم (Assimilate) ہوتی جا رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کا معمر طبقہ اور اسلامی مدارس کے ذمہ دار فارغین ہی ہیں جو اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے فکر مند اور کوشاں ہیں۔

سنہ 2011ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی تعداد حقیقتاً پائی جاتی تھی اس سے بہت کم تعداد میں مسلمانوں نے مردم شماری میں اپنی مادری زبان 'اردو' لکھوائی تھی۔ اگر صرف اتر پردیش (یوپی) کی مثال سامنے رکھی جائے تو پتا چلے گا کہ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق اتر پردیش (یوپی) میں مسلمانوں کی کل تعداد تین کروڑ پچاسی لاکھ (3.85 Crore) تھی، لیکن یوپی کے جن مسلمانوں نے اس مردم شماری میں اپنی مادری زبان 'اردو' درج کروائی تھی ان کی تعداد صرف ایک کروڑ آٹھ لاکھ (1.08) تھی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مردم شماری میں صرف مسلمان ہی اپنی مادری زبان اردو لکھواتے ہیں، تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ سنہ 2011ء کی مردم شماری میں یوپی کے صرف 28% فی صد مسلمانوں نے ہی اپنی مادری زبان 'اردو' درج کروائی ہے۔ یہ فیصد یوپی میں مسلمانوں کی جتنی مجموعی تعداد ہے اس کی نصف سے بھی بہت کم ہے۔ اردو کی یہ صورتِ حال اہلِ اردو کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔!

اردو، ہندوستان کے جنوبی صوبوں میں بھی بولی جاتی ہے، لیکن وہاں اس کی حالت

مایوس کن نہیں ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اردو ایک ہندوستان گیر زبان (Pan-Indian language) ہے۔ جنوب کے کئی صوبوں میں مادری زبان کی حیثیت سے اردو بولنے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اردو، شمال کی طرح جنوبی ہند کے بھی کسی صوبے کی پہلی یا اکثریتی زبان نہیں ہے، لیکن ان صوبوں میں اس کا مقابلہ براہِ راست ہندی سے بھی نہیں ہے۔ وہاں کے اردو بولنے والوں کو اس بات کا خوف نہیں کہ اردو، ہندی میں رفتہ رفتہ ضم یا مدغم (Assimilate) ہوتی جا رہی ہے، کیوں کہ وہاں ہندی کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اردو کو جنوب کی متعلقہ علاقائی زبانوں کی طرف سے کوئی Threat بھی نہیں۔ جنوب کے اردو بولنے والوں میں اپنی زبان کے تئیں وہ سرد مہری بھی نہیں جو اتر پردیش (یو پی) میں ہے۔ اہلِ یو پی کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ اردو انہی کے صوبے میں زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ یہاں اردو تعلیم کا ڈھانچا بری طرح چرمرا چکا اور، تہس نہس (Crumble) ہو چکا ہے۔ اس کے علی الرغم جنوب کی ایک ریاست مہاراشٹر کو دیکھیں جہاں اردو نظامِ تعلیم کا جال بچھا ہوا ہے۔

جدول-3

علاقائی سطح پر اردو اور ہندی کا درجہ

بہ لحاظِ تناسب آبادی

(مردم شماری 2011ء)

صوبے اور مرکز کے زیر انتظام علاقے	پہلی زبان	دوسری زبان	تیسری زبان	چوتھی زبان
1- آسام	——	——	——	ہندی
2- آندھرا پردیش	——	اردو	ہندی	——

3- اترا کھنڈ	ہندی	اردو	——	——
4- اتر پردیش	ہندی	اردو	——	——
5- اڈیشا	——	ہندی	——	——
6- بہار	ہندی	——	اردو	——
7- پنجاب	——	ہندی	اردو	——
8- تامل ناڈو	——	——	——	اردو
9- تلنگانہ	——	اردو	——	——
10- جزائر انڈمان ونکوبار	——	ہندی	——	——
11- جموں وکشمیر	——	——	ہندی	——
12- جھارکھنڈ	ہندی	——	——	اردو
13- چنڈی گڑھ	ہندی	——	اردو	——
14- چھتیس گڑھ	ہندی	——	——	——
15- دادرونا گرحویلی	——	ہندی	——	——
16- دہلی	ہندی	——	اردو	——
17- راجستھان	ہندی	——	——	——
18- سکم	——	ہندی	——	اردو
19- کرناٹک	——	اردو	——	——
20- گجرات	——	ہندی	——	——
21- گووا	——	——	ہندی	——
22- لکش دویپ	——	——	——	ہندی
23- مدھیہ پردیش	ہندی	——	اردو	——

24- مغربی بنگال	——	ہندی	——	اردو
25- منی پور	——	——	ہندی	——
26- مہاراشٹر	——	ہندی	اردو	——
27- میزورم	——	——	ہندی	——
28- ناگالینڈ	——	——	ہندی	——
29- ہریانہ	ہندی	——	اردو	——
30- ہماچل پردیش	ہندی	——	——	——

جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہندی بطورِ مادری زبان بولنے والوں کی تعداد میں متذکرہ دس برسوں کے دوران میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اس زبردست اضافے کی وجہ 'Population explosion' تو ہے ہی، اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ دس ہندی گوصوبوں میں رائج بولیوں (Dialects) کو جن میں سے ہر بولی لسانیاتی اعتبار سے دوسری بولی سے مختلف ہے، ہندی میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ان میں سے چند بولیوں کے نام یہ ہیں: کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی، اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی، مگہی، بھوجپوری، مارواڑی، میواڑی، مالوی، میواتی، شیخاوتی، وغیرہ۔

جدول-3 پر ایک نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ 2011ء کی مردم شماری کی رو سے ہندی، دس صوبوں اور ایک مرکز کے زیرِ انتظام علاقے میں مادری زبان کی حیثیت سے اور پہلی بڑی زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔ یہ بہ لحاظِ تعداد و تناسب وہاں کے اکثریتی طبقوں کی زبان ہے۔ یہ صوبے ہیں: (1) اتراکھنڈ، (2) اترپردیش، (3) بہار (4) جھارکھنڈ، (5) چھتیس گڑھ، (6) دہلی، (7) راجستھان، (8) مدھیہ پردیش، (9) ہریانہ، اور (10) ہماچل پردیش۔ اس کے علاوہ چندی گڑھ (مرکز کے زیرِ انتظام علاقہ) بھی ہندی اکثریتی علاقہ ہے۔ ہندوستان کے 92.28% فی صد ہندی بطورِ مادری زبان بولنے والے انھی دس صوبوں میں پھیلے ہوئے ہیں جسے 'ہندی بیلٹ' (Hindi Belt) کہتے ہیں، ہندی کو

ان صوبوں میں سرکاری زبان (Official language) کا درجہ حاصل ہے۔ ملک کے ہندی بولنے والوں کی ایک تہائی ($1/3^{rd}$) سے ذرا زیادہ آبادی صرف اتر پردیش میں پائی جاتی ہے۔ اتر پردیش کے علاوہ بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان کثیر ہندی آبادی والے صوبے ہیں۔

ہندی بہ لحاظِ تعداد و تناسب دوسری بڑی زبان کی حیثیت سے بطورِ مادری زبان اڈیشا، پنجاب، جزائرِ انڈمان ونکوبار، دادر ونا گر حویلی، سکم، گجرات، مغربی بنگال اور مہاراشٹر میں بولی جاتی ہے۔ ہندی بہ طورِ مادری زبان، تیسری بڑی زبان کی حیثیت سے آندھرا پردیش، جموں و کشمیر، گوا، منی پور، میزورم اور ناگالینڈ میں بولی جاتی ہے۔ مادری زبان کی حیثیت سے ہندی بولنے والے دور دراز آسام اور لکش دویپ میں بھی آباد ہیں جہاں یہ چوتھی بڑی زبان کا درجہ (Rank) رکھتی ہے۔ جن علاقوں میں ہندی بطورِ مادری زبان دوسری، تیسری اور چوتھی بڑی زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہے وہ دراصل 'غیر ہندی علاقے' ہیں۔ ان علاقوں میں ہندی بولنے والے بہ لحاظِ تعداد و تناسب نسبتاً کم ہیں۔

ہندی کا جتنا زور اور اثر شمالی ہندوستان میں پایا جاتا ہے، اتنا جنوب میں نہیں۔ جنوبی ہند میں ہندی بطورِ مادری زبان بولنے والے خال خال (Sporadically) پائے جاتے ہیں۔ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق ہندی (بطورِ مادری زبان) کو جنوب کے سات صوبوں میں سے چار صوبوں: کیرالا، تامل ناڈو، کرناٹک اور تلنگانہ میں تعداد و تناسب کے اعتبار سے چوتھا درجہ (Rank) بھی حاصل نہیں ہے۔ آندھرا پردیش اور مہاراشٹر جنوبی ہند کے دو ایسے صوبے ہیں جہاں مادری زبان کی حیثیت سے ہندی بولنے والوں کو علی الترتیب تیسرا اور دوسرا مقام حاصل ہے۔ آندھرا پردیش میں بہ حیثیتِ مادری زبان تلگو پہلا مقام، اردو دوسرا مقام اور ہندی تیسرا مقام رکھتی ہے۔ مہاراشٹر میں پہلی زبان مراٹھی کے بعد ہندی کو دوسرا مقام حاصل ہے۔ آندھرا پردیش کے علاوہ جنوبی ہند کے ایک اور صوبے گوا میں بھی ہندی کو بہ طورِ مادری زبان تیسرا مقام حاصل ہے۔ یہاں کی پہلی بڑی زبان (مادری زبان) کونکنی ہے۔ یہ گوا کی سرکاری زبان بھی ہے۔ مراٹھی کو یہاں کی دوسری بڑی زبان کا درجہ حاصل ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اور جدول-3 سے بھی ظاہر ہے کہ اردو ہندوستان کے کسی بھی صوبے یا مرکز کے زیر انتظام علاقے (Union Territory) کی اکثریتی زبان نہیں ہے، یعنی مادری زبان کی حیثیت سے اردو بولنے والے ہندوستان کے کسی بھی صوبے یا مرکز کے زیر انتظام علاقے میں اکثریت میں نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے اردو ہندوستان کے کسی بھی صوبے کی 'علاقائی زبان' (Regional language) نہیں ہے، یعنی بہ اعتبار تعداد و تناسب اسے پہلی زبان کا درجہ (Rank) حاصل نہیں ہے، لیکن یہ کئی صوبوں میں کثیر تعداد میں مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہے، خاص طور پر ان صوبوں میں جہاں کی پہلی زبان ہندی ہے۔ اس اعتبار سے اردو کا علاقہ بھی وہی ہے جو ہندی کا ہے، چنانچہ اس نکتے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اردو کو 'ذیلی علاقائی زبان' (Sub-regional language) کہا جا سکتا ہے۔ 'ہندی بیلٹ' (Hindi Belt) کے جن دس صوبوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہماچل پردیش، چھتیس گڑھ اور راجستھان کو چھوڑ کر، بقیہ سات صوبوں میں جہاں بہ اعتبارِ تعداد و تناسب ہندی کو پہلا درجہ (Rank) حاصل ہے، انھی صوبوں میں اردو کو دوسرا، تیسرا یا چوتھا درجہ حاصل ہے۔ یہ صوبے ہیں: اترا کھنڈ، اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، دہلی، مدھیہ پردیش، اور ہریانہ۔ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق اترا کھنڈ اور اتر پردیش میں پہلی زبان ہندی کے بعد اردو دوسری بڑی زبان ہے۔ علاوہ ازیں بہار، دہلی، مدھیہ پردیش اور ہریانہ میں پہلی زبان ہندی کے بعد اردو تیسری اور جھارکھنڈ میں ہندی کے بعد چوتھی بڑی زبان ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جہاں ہندی کا غلبہ ہے وہاں اردو کا وجود بھی مسلّم ہے۔ اس اعتبار سے 'ہندی بیلٹ' کو 'ہندی-اردو بیلٹ' (Hindi-Urdu Belt) کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا جا چکا ہے کہ اردو دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈیول میں مندرج 22 بڑی زبانوں (Major languages) میں سے ایک ہے، اور ہندوستان کی کل آبادی کے تناسب سے ان زبانوں میں اس کا ساتواں درجہ (Rank) ہے۔ اس کے بعد متذکرہ شیڈول میں جن زبانوں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً کنڑ، اڈیا، ملیالم، پنجابی، آسامی، کشمیری وغیرہ،

ان کے بولنے والوں کی تعداد اردو بولنے والوں کی تعداد سے بہت کم ہے۔ یہ زبانیں بمقابلہ اردو تعداد و تناسب میں کم ہوتے ہوئے بھی علاقائی زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں اور اپنے اپنے صوبوں کی سرکاری زبانیں (Official languages) بھی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کی اکثریت ان کے اپنے مخصوص علاقوں اور صوبوں تک ہی محدود رہی ہے۔ اس کے علی الرغم اردو ہندوستان میں شمال تا جنوب کئی صوبوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور صحیح معنیٰ میں ایک ہندوستان گیر زبان (Pan-Indian language) بن گئی ہے۔

شمال کے علاوہ اردو جنوب میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق اردو جنوبی ہند کے تین صوبوں آندھرا پردیش، تلنگانہ، اور کرناٹک میں بہ لحاظِ تعداد و تناسب دوسری بڑی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان صوبوں کی پہلی زبانوں تلگو اور کنڑ کے بعد اردو ہی کا شمار ہوتا ہے۔ جنوبی ہند کے ایک اور صوبے مہاراشٹر میں بھی اردو بولنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں اردو تیسری بڑی زبان کے طور پر رائج ہے۔ یہاں کی پہلی بڑی زبان مراٹھی، دوسری ہندی اور تیسری اردو ہے، لیکن اردو اور ہندی بولنے والوں کی تعداد میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ جنوبی ہند کے ایک اور صوبے تامل ناڈو میں بھی مادری زبان کی حیثیت سے اردو بولنے والے موجود ہیں، لیکن بہ لحاظ تعداد و تناسب وہاں اردو چوتھا مقام رکھتی ہے۔

خلاصہ

اردو اور ہندی اگرچہ لسانیاتی اعتبار سے ہم رشتہ زبانیں ہیں اور ان کا ماخذ بھی مشترک ہے، نیز تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک دوسرے سے بہت قریب رہی ہیں، لیکن آگے چل کر یہ دونوں زبانیں الگ الگ راستوں پر چل نکلیں۔ ان دونوں زبانوں کو اگر ہم سماجی لسانیاتی تناظر (Sociolinguistic perspective) میں رکھ کر دیکھیں تب بھی ان کی جداگانہ حیثیت کا ہمیں اندازہ ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سماجی لسانیات (Sociolinguistics) زبانوں کے تاریخی پس منظر سے زیادہ ان کے سماجی رول اور کارپردازی، نیز ان کی تہذیبی

ضرورت اور قدر کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہے۔ سماجی لسانیات کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سماجی و تہذیبی رنگا رنگی ہی در حقیقت لسانی بوقلمونی کو جنم دیتی ہے۔ مختلف سماجی طبقوں اور مختلف تہذیبی گروہوں میں مختلف زبانوں کا پایا جانا فطری مظہر ہے۔ تاریخی اور لسانی اعتبار سے اردو اور ہندی کے درمیان خواہ کتنا ہی اشتراک کیوں نہ ہو، سماجی اور تہذیبی سطح پر اردو کی جداگانہ حیثیت کو اس لیے تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ ایک مخصوص سماجی طبقے اور تہذیبی گروہ کی نمائندگی کرتی ہے، نیز اس کی تہذیبی شناخت کے علاوہ، بقول مسعود حسین خاں، اس کی ''تہذیبی قدر اور ضرورت'' بھی ہے۔(3)

راقم السطور کو گیان چند جین کے اس موقف سے سخت اختلاف ہے کہ ''اردو اور ہندی ایک زبانیں ہیں۔''(4)

حواشی

1- درج فہرست زبانیں (بہ لحاظِ رومن حروفِ تہجی):

1. Assamese
2. Bengali
3. Bodo
4. Dogri
5. Gujrati
6. Hindi
7. Kannada
8. Kashmiri
9. Konkani
10. Malayalam

11. Manipuri
12. Marathi
13. Maithili
14. Nepali
15. Odiya
16. Punjabi
17. Sanskrit
18. Santhali
19. Sindhi
20. Tamil
21. Telugu
22. Urdu

2- دیکھیے جدولوں کے لیے مردم شماری 2011ء کی لینگویج رپورٹ:

Census of India 2011, Paper 1 of 2018. Language : India, States and Union Territories (Table C-16). Office of the Registrar General, India (New Delhi).

3- مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب 'اردو کا المیہ' میں لکھا ہے کہ "زبان ایک تہذیبی اور معاشرتی عمل ہے... جب کسی سیاسی انقلاب کے تحت کوئی جماعت اپنی زبان کے ترک پر مجبور ہو جاتی ہے تو اس کی تہذیبی انفرادیت ختم ہونے لگتی ہے اور تخلیقی اعتبار سے وہ مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ اردو، اردو بولنے والوں کے لیے ایک تہذیبی قدر بھی ہے اور ضرورت بھی۔" (بحوالہ 'اردو کا المیہ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، 1973ء)، ص 62-61۔

4- دیکھیے گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005ء)۔ مزید دیکھیے متذکرہ کتاب کا رد: 'ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی' از مرزا

خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2007ء)۔

راقم السطور نے گیان چند جین کی متنازع فیہ کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کا مفصل و مدلل جواب 'ایک بھاشا جو مسترد کردی گئی' لکھ کر دیا جس کا اسلوب معروضی اور غیر جذباتی تھا۔ اہل علم نے ناچیز کی اس کاوش کو بہ نظرِ تحسین دیکھا اور خطوط لکھ کر حوصلہ افزائی کی۔ گیان چند جین اپنی متذکرہ کتاب کی تسوید کے دوران فرقہ وارانہ ذہنیت اور منفی طرزِ فکر کا شکار ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان و ادب کے تئیں متعصبانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اردو گو مسلمانوں کو بھی اپنے تعصب کا نشانہ بنایا تھا، جب کہ وہ اردو ہی کے ماحول میں پلے بڑھے تھے اور اردو ہی کی روزی روٹی سے انھوں نے اپنی گذر بسر کی تھی۔ گیان چند جین سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ ان سے میری مراسلت کا سلسلہ تادمِ آخر (جب انھوں نے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی) جاری رہا۔ ان کا آخری خط 31 جنوری 2007ء کا تحریر کردہ تھا جو انھوں نے پورٹرول، کیلی فورنیا (USA) سے مجھے ارسال کیا تھا۔ انھوں نے اس خط میں لکھا تھا: ''اردو ہندی وغیرہ سب کو بھول گیا ہوں۔'' اس خط کا عکس میری متذکرہ کتاب 'ایک بھاشا جو مسترد کردی گئی' کے ضمیمے میں شامل ہے۔

●●●

سر سید احمد خاں کی لسانی پالیسی

سر سید احمد خاں (1817-1898ء) انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے مصلح گذرے ہیں۔ 1857ء کے ہنگامۂ غدر نے ہندوستانی مسلمانوں کا سب کچھ چھین کر انھیں شکستہ دل، زخم خوردہ اور بے سہارا بنا دیا تھا۔ زمانے کے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کی ان میں ذرا بھی سکت باقی نہ رہ گئی تھی۔ ماضی کا جاہ و جلال اور عظمتِ رفتہ کا احساس انھیں حال کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے باز رکھتا تھا۔ نئے حالات جس تیزی کے ساتھ ملک کو آگے لے جا رہے تھے اسی تیزی کے ساتھ مسلمان پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اور قعرِ مذلت میں گرتے جا رہے تھے۔ ان کا نہ کوئی یار و مددگار تھا اور نہ کوئی مونس و غم خوار، بالآخر قوم کی اصلاح کا بیڑا سر سید نے اٹھایا، سیاسی اقتدار کے ختم ہونے اور غدر کے حالات سے دوچار ہونے کے بعد ہندوستانی مسلمان ہر لحاظ سے پس ماندہ ہو چکے تھے۔ نئے حالات سے سمجھوتے کی پہلی کڑی جدید تعلیم کی تحصیل تھی۔ سر سید جو صحیح معنی میں مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ تھے ان کی تعلیمی پستی کو دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے تھے اور ان کی تعلیمی فلاح و بہبود کے لیے نت نئے منصوبے بناتے تھے۔ سر سید سیاست سے اپنا دامن بچانا چاہتے تھے، کیوں کہ سیاسی اعتبار سے نہ صرف مسلمان بلکہ پوری ہندوستانی قوم کو انگریزوں کے ہاتھوں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ من حیث القوم مسلمانوں کو

جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا یہی ایک ذریعہ تھا اور اسی کی تحصیل کے بعد مسلمان ترقی کے تمام مدارج طے کر سکتے تھے۔ لیکن مسلمان کسی بھی طرح جدید تعلیم کی طرف راغب نہیں ہو رہے تھے اور سرسید کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ سرسید کو اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے کڑی سے کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا اور بڑی سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ 1875ء میں علی گڑھ میں ایم. اے. او. کالج (محمدن اینگلو اورینٹل کالج) کا قیام عمل میں آیا جس نے مسلم قوم کی کایا پلٹ دی۔

سرسید کے تعلیمی مشن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اکثر یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ سرسید مسلمانوں میں انگریزی زبان کا بھی فروغ چاہتے تھے۔ انھیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ اردو زبان جدید علوم کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ نہ صرف اردو بلکہ کوئی بھی مشرقی زبان مغربی علوم کی تحصیل کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ جہاں تک کہ اردو کا تعلق ہے، بول چال سے قطع نظر اس زبان سے اب تک صرف شعر وشاعری اور ادب کی آبیاری ہی کا کام لیا جاتا تھا۔ سادہ نثر اگرچہ میرامن کے ہاتھوں انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کے تحت پروان چڑھ چکی تھی، لیکن اس کا چلن ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ ورنہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ 'باغ و بہار' کے تصنیف کیے جانے کے تقریباً ربع صدی کے بعد بھی مقفیٰ و مسجع اور حد درجہ رنگین نثر میں 'فسانۂ عجائب' نہ لکھتے۔ انیسویں صدی کے وسط تک اردو میں علمی نثر کا وجود ناپید تھا۔ علمی نثر کی بنیاد دراصل سرسید کی تحریروں ہی سے پڑتی ہے۔ سرسید کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو شعریت اور رنگینی کے دائرے سے باہر نکال کر اس قابل بنا دیا کہ وہ نئے نئے موضوعات اور عصری تقاضوں کی متحمل ہو سکے۔ سرسید کو اردو کی کم مائیگی کا پورا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو کے مایۂ ناز ادیب اور انشاء پرداز ہوتے ہوئے بھی اردو کو اپنے تعلیمی مشن میں کوئی حصہ نہ دے سکے۔ اردو کو انھوں نے ایم. اے. او. کالج میں کبھی ذریعہ تعلیم نہیں بننے دیا۔ یہ درست ہے کہ اردو نے ادبی اعتبار سے علی گڑھ میں خوب ترقی حاصل کی۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو کو یہاں خوب فروغ حاصل ہوا، تاہم یہ اس

قابل نہ ہوسکی کہ جدید تعلیم کا اسے ذریعہ بنایا جاسکتا۔ ایم. اے. او. کالج کی حدود میں انگریزی زبان کا ہی دور دورہ رہا اور یہ سرسید کی منشا کے عین مطابق تھا۔

سرسید نے ایم. اے. او. کالج کی بنیاد آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی طرز پر رکھی تھی اور اسی کی نہج پر وہ یہاں کے طلبہ کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ کالج کے تعلیمی معیار کو بلند رکھنے کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ کالج میں نہ صرف انگریز پرنسپل مقرر کیا بلکہ بہت سے انگریزی اساتذہ کا بھی تقرر کیا اور ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی ہی رکھا۔ ایم. اے. او. کالج کے قیام سے قبل اسکول میں بھی ذریعۂ تعلیم انگریزی تھی۔ 24رمئی 1875ء کو جب اسکول کا افتتاح ہوا تو یہ طے پایا کہ نویں جماعت میں عربی، فارسی، انگریزی، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم دی جائے گی۔ اردو کو ان مضامین کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔

سنہ 1877ء میں جب یہی اسکول کالج بنا تو سائنس، فلسفہ، منطق، قانون کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ بعض مضامین کو چھوڑ کر بقیہ تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ سرسید کا خیال تھا کہ جدید علوم انگریزی کے ذریعہ ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں، کیوں کہ انگریزی زبان میں ان علوم کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے۔ سرسید نے جدید علوم کے فروغ کے لیے غازی پور میں 1862ء میں ایک ترجمہ سوسائٹی قائم کی تھی جس کے زیر اہتمام انگریزی سے اردو میں کتابیں ترجمہ کی جاتی تھیں، بعد میں یہ سوسائٹی علی گڑھ منتقل ہوگئی اور سائنٹفک سوسائٹی کہلائی، لیکن بہت جلد ہی انھیں اس بات کا احساس ہوگیا کہ ترجمہ شدہ کتابوں سے کام نہیں چل سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی جدید علوم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے انگریزی زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔ سرسید نے انگریزی زبان کی تحصیل اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور اسے کبھی اردو کا حریف نہیں سمجھا۔ سرسید اردو زبان کی خوبیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور اسے دنیاوی ترقی اور مادی خوشحالی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ غدر کے فوراً بعد 1858ء میں مرادآباد میں انھوں نے جو اسکول قائم کیا تھا اس میں پہلی بار انگریزی تعلیم کو جزو نصاب بنایا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک اسکول 1864ء میں انھوں نے غازی پور میں بھی قائم کیا تھا جو وکٹوریہ میموریل اسکول کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس اسکول میں بھی انگریزی تعلیم پر زور تھا۔ بقول

مسعود حسین خاں ''تعلیمی میدان میں وہ ابتدا سے انگریزی زبان اور تہذیب کے کوشاں رہے۔''(1)

1863ء میں انھوں نے کلکتہ میں آنریبل مولوی عبداللطیف خاں بہادر کے مکان پر ایک جلسے میں فارسی میں تحریر کردہ اپنا ایک بیان پڑھا تھا جو انگریزی زبان کی تائید میں ان کا غالباً سب سے پہلا مطبوعہ بیان ہے۔ اس میں انھوں نے یہی کہا تھا کہ تمام علوم انگریزی زبان میں بند ہیں۔ لہٰذا انگریزی زبان کی تحصیل اور اکتساب میں کسی قسم کی مذہبی مداخلت نہیں ہونی چاہیے اور یہ زبان تعصبِ مذہبی سے بالاتر ہو کر سیکھنی چاہیے۔ مولوی عبداللطیف نے سرسید سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی زبان زندگی کو ترقی سے ہم کنار کر سکتی ہے تو وہ انگریزی زبان ہے۔(2)

سرسید احمد خاں نے انگلستان سے واپسی کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (MAO College) کے لیے جو تعلیمی اسکیم مرتب کی تھی اس میں انگریزی کو خاص درجہ دیا تھا۔ اس اسکیم میں سرسید نے یہ کہا تھا کہ ''اعلیٰ درجے کی دنیوی تعلیم کے لیے نہایت ضروری ہے کہ کلیتاً انگریزی زبان میں تعلیم ہو تاکہ مسلمان لڑکے انگریزی میں ایسے قابل نکلیں کہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے ہندوستانیوں کو مل سکتے ہیں ان کو وہ حاصل کر سکیں۔''(3)

حواشی

1- مسعود حسین خاں، ''علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی اور اردو زبان''، مشمولہ 'شعر و زبان' از مسعود حسین خاں (حیدرآباد، 1966ء)، ص 211۔

2- ایضاً، ص 212۔

3- ایضاً، ص 213۔

●●●

ڈپٹی نذیر احمد بحیثیتِ زبان داں

ڈپٹی نذیر احمد (1836-1923ء)[1] کا شمار اردو کی ممتاز ترین ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف باعتبارِ زمانی اردو کے اوّلین ناول نگار ہیں بلکہ دیگر کئی حیثیتوں سے بھی وہ صفِ اول کے ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں 'مرأۃ العروس'، 'بنات النعش'، 'توبۃ النصوح'، 'فسانۂ عجائب'، 'ابن الوقت' وغیرہ کو آج بھی نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مترجم کی حیثیت سے بھی نذیر احمد کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ انھوں نے نہ صرف قرآنِ کریم کا رواں اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا بلکہ بعض قانونی نوعیت کے تراجم بھی کیے۔ مثلاً ترجمۂ تعزیراتِ ہند (انڈین پینل کوڈ)، قانونِ انکم ٹیکس، ضابطۂ فوجداری، قانونی اسٹامپ وغیرہ۔ علاوہ ازیں دربارِ تاج پوشی شہنشاہِ ایڈورڈ ہفتم سے متعلق حکومتِ وقت نے جو ضخیم کتاب بہ زبانِ انگریزی شائع کی تھی اُسے بھی اُردو کے قالب میں ڈھالا۔ نذیر احمد کو مذہبیات، علمِ کلام، ہیئت و منطق اور دیگر اخلاقی و علمی موضوعات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کی تصانیف 'الحقوق والفرائض'، 'مبادی الحکمۃ'، 'سموات'، 'اجتہاد'، 'ایمان بالقدر' وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نذیر احمد کو اردو پر کامل عبور ہونے کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ دورانِ ملازمت انھوں نے انگریزی بھی سیکھ لی تھی اور وقتِ ضرورت اس کا استعمال بھی کرتے تھے۔

کثیر التصانیف ہونے کے علاوہ نذیر احمد ایک خوش بیان شاعر [2] اور شیریں زبان مقرر بھی تھے۔ [3] کہا جاتا ہے کہ جس طرح ان کے قلم میں قوتِ تحریر تھی اسی طرح اُن کی زبان میں قوتِ تقریر بھی تھی۔ اپنی عملی زندگی میں وہ ایک لائق مدرس، ذمہ دار انسپکٹر آف اسکولز اور فرض شناس ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ''بہت بڑے بزنس مین''، یعنی کاروباری بھی تھے۔ [4]

نذیر احمد کی علمی زندگی کا ایک اہم پہلو جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے ان کی زبان دانی، لسانی رمز شناسی، قواعد نویسی، لغت نگاری اور املا و انشاء سے ان کی گہری دلچسپی بھی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ نذیر احمد کو لسانی مسائل اور قواعد نویسی سے اس وقت سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی جب ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ انھوں نے اپنا پہلا ناول 'مرأۃ العروس' 1868ء میں تصنیف کیا جو دوسرے سال یعنی 1869ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس وقت وہ ضلع جالون میں (بمقام اورئی) ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ 1869ء میں انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے 'منتخب الحکایات' تصنیف کی اور اُسی سال اپنے بیٹے میاں بشیر الدین احمد کے لیے 'چند پند' لکھی۔ جس زمانے میں نذیر احمد یہ کتابیں تصنیف کر رہے تھے تو ایک طرف تو ان کا ذہن بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کی طرف لگا ہوا تھا اور دوسری جانب وہ زبان دانی اور قواعد نویسی کے مسائل میں اپنا سر کھپا رہے تھے۔ چنانچہ 1869ء میں ہی انھوں نے مبتدیوں کے لیے 'خالق باری' کی طرز پر ایک کتاب 'نصابِ خسرو' تصنیف کی اور 1870ء میں 'صرفِ صغیر' کے نام سے ایک رسالہ فارسی قواعد سے متعلق اردو میں تحریر کیا۔ یہ کہنے کو تو فارسی قواعد ہے، لیکن اس میں مثالیں جا بجا فارسی کے علاوہ اُردو سے بھی دی گئی ہیں، بلکہ بعض جگہ تو صرف اُردو ہی میں مثالیں ملتی ہیں۔ اس اعتبار سے اگر اسے اُردو قواعد کی بھی کتاب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

نذیر احمد سے قبل اردو زبان میں قواعد نویسی کی شاندار روایت موجود تھی۔ یورپی عالموں کی اردو قواعدوں سے قطع نظر، اردو زبان میں اردو صرف و نحو پر نذیر احمد سے قبل کئی کتابیں تصنیف کی جا چکی تھیں، مثلاً سر سید احمد خاں کا رسالہ صرف و نحو جو 1840ء میں مرتب

ہوا، اردو صرف ونحو پر مولوی احمد علی کی کتاب 'فیض کا چشمہ' جو 1845ء میں شائع ہوئی اور امام بخش صہبائی کا رسالہ 'قواعدِ صرف ونحوِ اردو' جو اسی زمانے میں طبع ہوا، خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

رسالہ 'صرفِ صغیر'[5] نذیر احمد نے 1870ء میں تصنیف کیا،[6] جس وقت کہ وہ شہر گورکھپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ رسالہ انھوں نے ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر ایم کیمپسن کے کہنے پر تحریر کیا تھا تاکہ یہ ان مدارس میں پڑھایا جا سکے جہاں فارسی داخلِ نصاب ہے۔ یہ مفید عام پریس، آگرہ میں 1871ء میں چھپا تھا۔ کتاب کے شروع میں بہ طورِ دیباچہ نذیر احمد نے ہندوستان میں فارسی کے آغاز وارتقا اور چلن پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اردو کی تکمیل کے لیے فارسی کی تحصیل کو ضروری قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''جو شخص فارسی نہیں جانتا اُس کی اردو درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔'' نذیر احمد کے نزدیک ''اپنی اردو زبان کی تکمیل کرنے کے واسطے فارسی کی ضرورت ہے، کیونکہ اردو میں زیادہ تر فارسی کے لفظ ہیں۔''

اس دیباچے میں نذیر احمد نے اردو کی پیدائش سے متعلق بھی اپنا نظریہ پیش کیا ہے لیکن یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل کئی اور اہلِ علم اردو کو ''مخلوط'' اور ''لشکری'' زبان کہہ چکے ہیں۔ چنانچہ نذیر احمد نے بھی وہی بات دہرادی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اردو کے معنی ہیں لشکر، پس یہ بولی ایک لشکر کی بولی ہے۔ اکبر کے وقت جو لشکر تھا اس میں ہر ملک کے آدمی تھے اور ان کو رعایا سے ملنے کی ممانعت تھی۔ اس واسطے کہ لشکر کے سپاہی جب رعیت سے اختلاط پیدا کرتے ہیں تو خاص شہر سے ان کو اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ان کا دل باہر جانے اور لڑنے مرنے کو نہیں چاہتا۔ اکبر نے اپنے لشکر والوں کو رعیت سے ملنے نہ دیا۔ اس لشکر میں رفتہ رفتہ اُردو بولی پیدا ہو گئی تھی۔ اس بولی میں ہر ملک کے لفظ ہیں۔ عربی، سنسکرت، ترکی، کشمیری، چینی، مرہٹی، ہر بولی اس میں پائی جاتی ہے اور سب بولیاں گڈمڈ ہو کر یہ زبان پیدا ہوئی۔''

حیرت ہے کہ نذیر احمد نے عربی، سنسکرت، ترکی، کشمیری، چینی اور مرہٹی کا تو ذکر کیا لیکن فارسی کو نظر انداز کر گئے۔ اسی طرح نواحِ دہلی کی بولیوں مثلاً کھڑی بولی اور ہریانوی جن پر زبانِ اردو کی بنیاد قائم ہے کا بھی کہیں ذکر نہیں آیا۔ نذیر احمد نے اپنے اس دیباچے میں ہندوستان کی مقامی بولی کو 'بھاکا' کہا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "اس ملک کی اصل بولی بھاکا تھی جو کچھ بدل بدلا کر متھرا کے نواح میں اب بھی بولی جاتی ہے۔"

رسالہ 'صرفِ صغیر' بالکل روایتی طرز پر لکھا گیا ہے اور اس میں عربی قواعد نویسی کو نمونہ بنایا گیا ہے جس کی ابتدا 'لفظ' سے ہوئی ہے۔ انھوں نے لفظ کی تین قسمیں بیان کی ہیں: اسم، فعل، حرف۔ 'اسم' کو آدمیوں یا چیزوں کے نام اور 'فعل' کو آدمی یا جانور کے کام یا حرکت سے منسوب کیا ہے اور جو لفظ نہ کسی کا نام ہیں اور نہ کسی کا بیان انھیں 'حرف' کہا ہے۔ اسم اور فعل کے درمیان انھوں نے ایک فرق یہ بتایا ہے کہ "اسم میں وقت کا شمول نہیں ہوتا اور فعل کے معنی میں ہمیشہ وقت ہوا کرتا ہے۔" پھر "وقت" کی تین قسمیں بیان کی ہیں: ماضی، مستقبل اور حال۔ ان تمام امور کے بیان میں انھوں نے جا بہ جا مثالیں پہلے اردو اور پھر فارسی سے دی ہیں اور کہیں کہیں صرف اردو سے۔

نذیر احمد کی اس قواعد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بیشتر اصولِ قواعد انھوں نے نثر میں بیان کرنے کے علاوہ اشعار کی صورت میں بھی بیان کیے ہیں تاکہ مبتدیوں کو انھیں یاد کرنے میں آسانی ہو اور ان کا دل اس میں لگا رہے ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ زبان و قواعد کی خشک اور نیرس باتوں سے بچوں کا دل فوراً اوب جاتا ہے۔ نذیر احمد کی اصولِ قواعد پر مبنی نظمیں بہت ہلکی پھلکی اور آسان ہیں اور ان میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔ باتوں ہی باتوں میں وہ کوئی نہ کوئی قاعدہ سکھا دیتے ہیں۔ اسم، فعل اور حرف کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اسے نذیر احمد نے نظم میں اختصار اور خوبی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

چاہتا ہے سیکھنا گر صَرف کو   سیکھ پہلے اسم و فعل و حرف کو
اسم یعنی نام جیسے عُمر و زید   وقت کی اس میں نہیں زنہار قید

فعل کے معنیٰ ہوئے اردو میں کام　　　　وقت کا ہے شرط اس میں انضمام
وقت جو موجود ہے وہ حال ہے　　　　اور جو آنے کو ہے استقبال ہے
کہتے ہیں ماضی اُسے جو ہو چکا　　　　ہو گذرنا پاس کا یا دور کا
حرف دو لفظوں میں صرف اک ربط ہے　　　　ورنہ تنہا اس کا معنی خبط ہے

نذیر احمد نے اپنی اس کتاب میں اصولِ قواعد نہایت سلسلہ وار بیان کیے ہیں۔ اسم، فعل اور حرف کے بعد انھوں نے ان کی قسمیں بھی بیان کی ہیں۔ اسم کے ضمن میں انھوں نے اسمِ فاعل اور اسمِ مفعول کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر اسم کی مزید دو قسمیں جامد اور مصدر بیان کی ہیں۔ مصدر سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ سب فعل ہوتے ہیں اور مشتقات کہلاتے ہیں اور ہر ایک لفظ صیغہ۔ مصدر کی پہچان اردو میں یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے آخر میں 'نا' ہوتا ہے جیسے آنا، جانا، کھانا وغیرہ اور فارسی میں 'دن' یا 'تن' جیسے آمدن، رفتن، خوردن، وغیرہ۔

مصدرِ فارسیت گویم من　　　　آخرش ہست لفظِ دن یا تن
اس کو اردو میں اس سے پہچانا　　　　کہ ہے آخر میں اُس کے لفظِ 'نا'

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، زمانہ اور وقت کے لحاظ سے نذیر احمد نے فعل کی تین بڑی قسمیں ماضی، مستقبل اور حال بیان کی ہیں۔ آگے چل کر ماضی کی چھے قسمیں: ماضیِ بعید، ماضیِ قریب، ماضیِ مطلق، ماضیِ تمام، ماضیِ احتمال، ماضیِ تمنائی بیان کی ہیں۔ مستقبل کی ایک اور حال کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ انھوں نے ایک فعل مضارع کا بھی ذکر کیا ہے جو حال و استقبال دونوں زمانوں پر دلالت کرتا ہے۔ فعل سے بننے والے صیغوں میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ان کی تین وجہیں ہیں، یعنی فاعل کا (1) مذکر و مؤنث ہونا، (2) واحد و جمع ہونا اور (3) غائب، حاضر یا متکلم ہونا۔ علاوہ ازیں مصدر کی دو اور قسمیں بیان کی گئی ہیں، مصدر لازم ''جس میں صرف فاعل درکار ہوتا ہے۔'' اور مصدر متعدی جس میں ''فاعل کے علاوہ مفعول بھی ہوتا ہے۔'' اسی طرح فعل کی مزید قسمیں بیان کی گئی ہیں: فعلِ معروف اور فعل مجہول۔ فعلِ معروف میں فاعل کے تعلق سے فعل بدلتا ہے اور فعلِ مجہول میں مفعول کے تعلق سے۔ آگے چل کر نذیر احمد نے فارسی کے ایک فعل 'زدن' بمعنی مارنا کی مکمل گردان دی ہے تا کہ اسی قیاس

پر جملہ مصادر کی گردان بخوبی ذہن نشین کی جا سکے۔

اسم اور فعل کے تفصیلی بیان کے بعد نذیر احمد نے 'حروف' (Particles) کو بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن حروف کے سلسلے میں کہی گئی ان کی بہت سی باتیں قواعد کی حدود سے نکل کر رسم خط کے دائرے میں داخل ہوگئی ہیں۔ اسی طرح بعض لاحقوں کو بھی انھوں نے حروف کے زمرے میں شامل کرلیا ہے، مثلاً 'چہ' ایک لاحقہ ہے جو تصغیر کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے باغچہ، لیکن نذیر احمد نے اسے حرف مانا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی (ہندوستان + ی) اور پنجابی میں جو 'ی' نسبتی ہے اسے بھی وہ حروف مانتے ہیں جب کہ قواعد کی رُو سے اسے لاحقہ کہیں گے۔ بعض دوسرے لاحقے مثلاً ستاں (گلستاں)، دان (قلمدان)، ناک (غمناک)، مند (نیاز مند)، ور (ہنرور)، بان (فیلبان) وغیرہ بھی نذیر احمد کی قواعد میں حروف کا درجہ رکھتے ہیں۔

رسالہ 'صرفِ صغیر' کا آخری باب اضافت سے متعلق ہے۔ نذیر احمد نے اضافت کی تین قسمیں بیان کی ہیں: اضافتِ زیر، ہمزۂ مکسور اور یائے مکسور۔ ان کی تقسیم بالکل واضح ہے یعنی ''جن کلمات کے آخر میں ہائے ماقبل مفتوح ہو'' یعنی جو الفاظ ہائے مختفی پر ختم ہوں مثلاً بندہ، خستہ وغیرہ ان کی اضافت ہمزۂ مکسور ہوتی ہے مثلاً بندۂ خدا، خستۂ گرسنگی۔ اور جن کلمات کے آخر میں الف ہو یا واؤ ماقبل مضموم وان کی اضافت یائے مکسور کی صورت میں ہوتی ہے مثلاً خدائے خلق، جفائے دشمن یا خوے نیک، روے خوب وغیرہ۔ ان کے علاوہ مضاف اور مضاف الیہ کی دیگر تمام صورتوں میں مضاف کے آخری حرف کے نیچے زیر دے کر اضافت بنائی جاتی ہے۔ مثلاً شمشیرِ آہن، باشندگانِ دہلی، مصاحبِ بادشاہ وغیرہ۔ نذیر احمد اضافت کی پابندی کے سختی سے قائل تھے۔ ان کے خیال میں ''عبارت جو بے قیدِ اضافت پڑھی جاتی ہے نہایت بے نمک اور بدمزہ ہوتی ہے۔'' وہ حکِ اضافت کو ایک ''مکروہ غلطی'' تصور کرتے ہیں جس سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

'صرفِ صغیر' کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا اہم علمی کارنامہ 'رسم الخط' کی تالیف ہے۔ یہ اردو املا نویسی سے متعلق 32 صفحوں کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ نذیر احمد کے نزدیک ''یہ

رسالہ اس قدر ضروری ہے کہ کوئی مکتب، کوئی اسکول اس سے مستثنیٰ نہیں۔'' وہ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''میری تصنیف وتالیف کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب میرے اپنے بچے تعلیم کے قابل ہوئے۔ آخر آپ پڑھا تھا، پڑھایا تھا۔ سررشتۂ تعلیم کی نوکری کے ذریعے سے پڑھنے پڑھانے کی نگرانی کی تھی۔ طریقۂ تعلیم کے خلل اور کتابوں کے نقص مجھ کو ذرا ذرا معلوم تھے۔ آنکھوں دیکھے تو مکھی نگلی نہیں جاتی۔ میں نے آپ اپنے طور کی کتابیں بنائیں اور آپ ہی پڑھائیں۔ تصنیف وتالیف کا اصلی محرک تو یہ تھا۔ بخت واتفاق سے کتابیں سرکار میں پیش ہو کر پسند اور لوگوں میں پھیل کر مقبول ہوئیں۔ خدا جانے میں اس بارے میں کیا کچھ کرتا اور کیسے کیسے منصوبے ذہن میں تھے۔ مگر دیکھا تو لوگوں کو علم کا مطلق شوق نہیں اور یہ جو کچھ دیکھتے ہو نری دھوکے کی ٹٹی ہے۔ آج سرکار نوکریوں سے امتحان کی قید اٹھا دے پھر دیکھیے کالجوں اور اسکولوں کی کیسی گت ہوتی ہے۔ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ معاش کا انحصار نہ ہو تو لوگ علم کے نام سے تنکا بھی نہ توڑیں۔ میں نے علمی کتابیں بھی لکھ کر دیکھیں۔ مگر لوگوں کی بے رغبتی کی وجہ سے کسی کے دوبارہ چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ الا ماشاء اللہ۔ میں نے اپنا قاعدہ یہ رکھا ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں اس کے رواج دینے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ میں کتاب کیا تصنیف کرتا ہوں گویا کنکوے بناتا ہوں۔ اگر ان میں پرواز کا مادہ ہے، خود بخود اڑیں گی۔ ورنہ میں کہاں ان کے پیچھے دُم چھلے کی طرح بندھا بندھا پھروں۔ اس بے اعتنائی پر بلکہ بے اعتنائی بھی نہیں، حمیت اور خودداری پر خدا کے فضل سے میری ساری کتابیں ایسی مقبول ہوئیں والحمد للہ علی ذٰلک کہ دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوتی اور جگہ جگہ بار بار چھپتی چلی جاتی ہیں۔ مگر علمی کتابیں ہیں کہ جب سے تصنیف ہوئیں اینڈی پڑی ہیں۔ یہ رسالہ ''رسم الخط'' بھی ان

ہی علمی کتابوں میں ہے جن کو کسی فقیر کی بددعا ہے کہ ہندوستانی ان سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ میرے نزدیک یہ رسالہ اس قدر ضروری ہے کہ کوئی مکتب، کوئی اسکول اس سے مستغنی نہیں۔ اہل یورپ جن کو مشرقی زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں کہیں مدتوں میں جاکر زبان تو ٹوٹی پھوٹی بولنے بھی لگتے ہیں مگر کتابت پر بالکل قادر نہیں ہوتے۔ ان کو ان قواعد کا سیکھنا نہایت ضروری اور مفید ہے بشرطیکہ جو منشی ان کو پڑھاتا ہے ان قواعد کو خود سمجھ کر ان کو سکھائے۔ بے شک ان قواعد کے بدون بھی کام چل رہا ہے لیکن جیسا صرف ونحو اور منطق کا ہونا ضروری ہے ویسا ہی ان قواعد کا بلکہ بدرجۂ اولیٰ۔ مگر قاعدے ہمیشہ غور طلب ہوتے ہیں، کسی قدر یہ بھی ہیں۔ خدا اتنی زحمت اٹھانے کی توفیق دے۔ میں تو مدتیں ہوئیں اس رسالے کو رو بیٹھا تھا۔ نذیر حسین تاجر کتب کے اصرار سے مکرر چھپوانے کی اجازت دے دی۔ ان کو اس کے پھیلنے کی توقع ہے، مجھ کو نہیں۔''

رسالہ 'رسم الخط' کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں حروف کی پوری شکل یعنی مفرد حروف سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں ان کے مرکبات یعنی ترکیبی شکلوں کا بیان ہے۔ نذیر احمد نے حروف کو ماقبل اور مابعد کے حروف کے ساتھ جوڑنے اور ملانے کے طریقوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور قواعدِ متعلقۂ ترکیبِ لاحق، قواعدِ متعلقۂ ترکیبِ سابق اور قواعدِ متعلقۂ ترکیب طرفین کے نام سے الگ الگ باب قائم کیے ہیں۔ ان کے علاوہ لکھائی کے کچھ اور ''متفرق'' قاعدوں سے بھی بحث کی ہے۔ خاتمۂ کتاب میں انھوں نے خوش خطی کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔ نذیر احمد کے نزدیک ''خوش خطی ایک ہنر ہے جس کی قدر ہر ایک زمانے میں ہوتی رہی ہے۔'' وہ خوش خطی کو بجائے خود کوئی ''علم'' تصور نہیں کرتے کیوں کہ ان کے خیال میں ''نہ اس سے عقل کو تیزی حاصل ہوتی ہے نہ اخلاق کو درستی، نہ معلومات کو ترقی''۔ وہ خوش خطی کو صرف ''مصوری یا نقاشی کا ایک شعبہ'' سمجھتے ہیں۔ خوش خطی کے بارے میں نذیر احمد کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ''یہ تو کسی طرح مناسب نہیں کہ انسان تحصیلِ علم پر اس کو ترجیح دے۔ تاہم یہ عام پسند اور ہر دل عزیز ہنر ایسا بھی نہیں کہ لڑکے اس سے بے بہرہ رہیں۔

کم سے کم اتنا تو ضرور ہے کہ کمالِ خوش خطی حاصل نہ کریں تو عیب بد خطی بھی اپنے میں پیدا نہ ہونے دیں۔''

قواعد و زبان دانی سے متعلق ڈپٹی نذیر احمد کا ایک اور علمی کارنامہ ''**ما یغنیك فی الصرف** '' ہے۔ اس میں عربی زبان کی صرف سے بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب نذیر احمد نے 1892ء میں تصنیف کی جو 1893ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''بے شک اس کا پڑھنے والا صرف کا علامہ محقق تو نہیں ہو جائے گا مگر امید ہے کہ جتنی باتیں ضروری اور بکار آمد ہیں وہ سب کو جانے، سب کو سمجھے اور سب کا برتاؤ کر سکے۔''

''**ما یغنیك فی الصرف** '' نذیر احمد نے اپنے بیٹے میاں بشیر الدین احمد کے لیے لکھی تھی تاکہ اس کتاب کی مدد سے انھیں عربی صحت کے ساتھ لکھنا پڑھنا آجائے۔ اس زمانے میں عربی صرف و نحو کی جو کتابیں رائج تھیں ان میں بیحد خامیاں تھیں اور وہ مبتدیوں کے مطلب کی نہیں تھیں۔ ان میں بیجا طوالت تھی اور صرفی و نحوی مسائل کو گورکھ دھندا بنا کر پیش کیا گیا تھا جس میں اگر کوئی الجھ گیا تو الجھتا ہی چلا جاتا تھا۔ نذیر احمد نے عربی زبان سکھانے کی ایک ایسی نصابی کتاب کی ضرورت محسوس کی جو ''نئی اور قریب الفہم'' ہو اور وری ضرورتوں کو خاطر خواہ پوری کرتی ہو۔ چناں چہ جب ''**ما یغنیك فی الصرف** '' کی ترتیب عمل میں آئی تو انھوں نے اسے اپنے بیٹے کو عربی پڑھانے کے لیے آزمایا۔ جب یہ اس ''امتحان میں پوری اتری اور اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوا'' تو نذیر احمد نے سوچا کہ اسے کیوں نہ مدارس کے عربی نصاب میں شامل کیا جائے اور گورنمنٹ سے انعام لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ کتاب گورنمنٹ میں پیش کی۔ گورنمنٹ نے یہ کتاب کسی مولوی صاحب کے پاس بھیج کر ان سے اس کے بارے میں رائے طلب کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مولوی صاحب نے گورنمنٹ کو اس کتاب کے بارے میں اچھی رائے نہیں دی۔ چنانچہ یہ کتاب داخلِ نصاب نہ ہو سکی۔ گورنمنٹ نے یہ کہہ کر کتاب واپس کر دی کہ ''عربی خواں طلبہ اپنا پرانا کورس بدلنا پسند نہیں

کرتے۔" نذیر احمد کو اس بات سے بہت رنج ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اس کتاب کو جمع کر کے تو میں عجب پریشانی میں پڑا ہوں۔ چھے برس ہوئے کہ میں نے یہ رسالہ اپنے لڑکے کے لیے لکھا تھا۔ ان دنوں مجھ کو سرکاری انعاموں کی چاٹ لگی ہوئی تھی۔ اس رسالے کو بھی سرکار میں پیش کیا۔ وہاں سے خالی پیلی شکریہ کے ساتھ بڑی لمبی چوڑی تعریف لکھ کر آئی۔ مگر مولویوں کے ڈر سے جو اَدبدا کر ہر نئی بات کی مخالفت کیا کرتے ہیں، گورنمنٹ نے اس رسالے کے رواج دینے پر جرأت نہ کی۔ گورنمنٹ کے نامنظور کرنے سے دل کچھ ایسا کھٹا ہوا کہ میں نے بھی پھر کچھ پروانہ کی۔ مگر میرا لڑکا بشیر الدین احمد اس کتاب کو مجھ سے پڑھتا رہا۔[7] اس کو اس کے مطالعے نے خاطر خواہ نفع دیا۔"

"**ما یغنیک فی الصرف**" چار حصوں پر مشتمل ہے:

- اول : منشعب مع خواص الابواب
- دوم : میزان صحاح
- سوم : معتلات
- چہارم : رسم الخط

ہر باب کے تحت نذیر احمد نے قواعدِ صرف بہت آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیے ہیں جس سے مبتدیوں کو عربی زبان سیکھنے میں بہت مدد ملتی ہے اور صرفی اصول بہت آسانی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنی اس کتاب میں تمرین کا ذکر نہیں کیا ہے۔ تمرین کے ذیل میں فعل کی گردان دی جاتی ہے جس میں ماضی، مضارع، امر، نہی، معروف و مجہول، اسمِ مفعول وغیرہ کے صیغے حاضر، غائب اور متکلم، نیز واحد، جمع اور تثنیہ اور مذکر و مونث کے حوالے سے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ ان صیغوں کی تعداد کئی سو تک پہنچ جاتی ہے۔ تمرین کی مشق سے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا ہے، لیکن نذیر احمد نے یہ کام معلمین و اساتذہ کے ذمہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی تجویز کے مطابق تمرین کی مشق کرالیں۔

نذیر احمد ''**ما یغنیك فی الصرف**'' کی طرز پر ''**ما یغنیك فی النحو**'' بھی لکھنا چاہتے تھے، لیکن جب اول الذکر کتاب کی طرف سے انھیں مایوسی ہوئی تو انھوں نے اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ ترک کر دیا اور تمام مواد جو انھوں نے ''**ما یغنیك فی النحو**'' کی ترتیب کے لیے جمع کیا تھا وہ اپنے بڑے بھائی مولوی علی احمد کو دے دیا جو عربی زبان کے ایک جید عالم تھے۔ مولوی علی احمد نے اس مواد کو بروئے کار لاتے ہوئے ''**ما یغنیك فی الصرف**'' کی طرز پر عربی نحو کی ایک کتاب توضیح المرام کے نام سے ترتیب دی جس سے نذیر احمد کے بیٹے بشیر الدین احمد نے تو فائدہ اٹھایا لیکن یہ چھپ کر مقبول عام نہ ہو سکی۔

حواشی

1- ڈپٹی نذیر احمد کے سال پیدائش کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ سید افتخار عالم مارہروی نے 'حیات النذیر' میں نذیر احمد کی پیدائش کا سال 1836ء درج کیا ہے (دیکھیے ص۲)۔ مشہور محقق مالک رام، نذیر احمد کا سال پیدائش 1833ء لکھتے ہیں (دیکھیے 'توبۃ النصوح'، مرتبہ مالک رام، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1972ء، ص۵)۔ اشفاق احمد اعظمی نے اپنی کتاب 'نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے' (دہلی: مکتبہ شاہراہ، 1974ء) کے صفحہ ۱۱ پر نذیر احمد کا سال پیدائش 1831ء لکھا ہے۔ لیکن دوسرے بہت سے محققین نے 'حیات النذیر' کی روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے نذیر احمد کا سال ولادت 1836ء (۶/ دسمبر 1836ء) ہی قرار دیا ہے۔

2- نذیر احمد عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا عربی، فارسی کلام زیادہ محفوظ نہ رہ سکا، لیکن ان کی اردو نظموں کا مجموعہ سید افتخار عالم مارہروی (مصنف 'حیات النذیر') نے 'نظمِ بے نظیر' کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

3- محمد نذیر حسین (تاجر کتب) نے نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ مرتب کر کے 1892ء میں دہلی سے شائع کیا۔ اس میں نذیر احمد کے کل 13 لکچرز شامل ہیں جو شروع سے جون

1892ء تک دیے گئے تھے۔ نذیر احمد کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد نے نذیر احمد کے ۲۲ لکچروں کا مجموعہ (1888 تا 1895ء) مرتب کر کے 1918ء میں شائع کیا۔ محمد نذیر حسین (تاجر کتب) نے 'لکچروں کا مجموعہ' کی دوسری جلد بھی شائع کی جس میں 1896ء سے 1898ء تک کے 12 لکچر شامل ہیں۔

4- کہا جاتا ہے کہ وہ لاکھوں روپے کا کاروبار کرتے تھے اور عمر کے آخری حصے میں کافی دولت مند ہو گئے تھے۔

5- ڈاکٹر جعفر رضا نے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول 'توبۃ النصوح' اپنے سیر حاصل ''مقدمہ'' کے ساتھ مرتب کر کے 1971ء میں الہ آباد سے شائع کیا۔ انھوں نے اس کتاب کے صفحہ 7 پر نذیر احمد کی تصانیف کی فہرست بھی دی ہے اور ان کی ایک کتاب کا نام 'صرف کبیر' لکھا ہے۔ نذیر احمد نے 'صرف کبیر' کے نام سے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ یہ دراصل 'صرفِ صغیر' ہے جس کا نام غلطی سے ڈاکٹر جعفر رضا نے 'صرف کبیر' لکھ دیا ہے۔ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ضروری ہے۔

6- سید افتخار عالم مارہروی نے 'حیات النذیر' میں لکھا ہے کہ یہ رسالہ 1869ء میں لکھا گیا''۔ (دیکھیے ص 169)، لیکن رسالہ 'صرفِ صغیر' پر اس کی تاریخ تالیف 1870ء اور تاریخ طباعت 1871ء درج ہے۔

7- سید افتخار عالم مارہروی، 'حیات النذیر' ص 201۔

●●●

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور لسانی تحقیق

اردو زبان وادب کی یہ بڑی خوش نصیبی رہی ہے کہ اس کے چاہنے والوں اور اس کی مشاطگی کرنے والوں میں ہر فرقے، ہر مذہب اور ہر خطے کے لوگ شامل رہے ہیں۔ دوسری قوموں کی اردو خدمات سے قطع نظر کشمیری پنڈتوں کی اردو زبان وادب کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کشمیری پنڈت اپنی علمی وادبی سرگرمیوں کے لیے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ نے کشمیری پنڈتوں کے فارسی اور اردو سے شغف اور ان کے علم وفضل کا اپنی تحریروں میں کھل کر اعتراف کیا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی اردو شعر وادب سے دلچسپی اور اردو خدمات کا سلسلہ تقریباً چار صدیوں پر محیط ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد کے ایک عالم پنڈت چندر بھان برہمن (1574-1662ء) ہیں۔ دوسرے ممتاز کشمیری پنڈتوں سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی تک پہنچتا ہے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی 13 دسمبر 1866ء کو دہلی کے کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت کنھیالال دتاتریہ راجہ بھرپور سنگھ کے عہد میں شہر نابھ میں محکمۂ پولیس میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ کیفی ابھی صغر سن تھے کہ ان کے والد کا عین جوانی میں ہیضے کے عارضے میں انتقال ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ کیفی کی پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت ان کے عزیزوں کی نگہداشت میں دہلی میں ہوئی۔

کیفی کی ابتدائی تعلیم پرانی طرز پر ہوئی۔ انھوں نے سب سے پہلے اردو اور فارسی کی تعلیم پائی۔ پھر اسکول میں داخل ہوئے اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ دہلی میں کیفی اپنے اہلِ کنبہ کے ساتھ بازار سیتارام میں واقع ایک مکان میں سکونت پذیر تھے۔ قریب ہی ایک مکتب تھا جس میں انھیں داخل کیا گیا۔ یہیں ان کی رسم بسم اللہ ہوئی اور مکتب کے 'میاں جی' سے یہیں انھوں نے اپنی فارسی کی تعلیم کا آغاز کیا اور جلد ہی 'کریما'، 'خالق باری'، 'گلستاں'، 'بوستاں' اور 'دستور الفصاحت' وغیرہ کتابیں ختم کرلیں۔ بعد میں فارسی کی تکمیل میں انھیں اپنے نانا سے بہت مدد ملی جن کا شمار اس زمانے کے فارسی کے جید عالموں میں ہوتا تھا۔ کیفی نے 'انوار سہیلی'، 'یوسف زلیخا' اور 'بہارِ دانش' وغیرہ گھر پر اپنے نانا سے پڑھیں اور فارسی اور اردو کے بعد کیفی نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور 1880ء میں سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اردو فارسی کی طرح آپ نے انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔ علاوہ ازیں کیفی سنسکرت اور عربی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔

کیفی کی شادی لکھنؤ کے ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں ہوئی تھی۔ کیفی کے خسر پنڈت اجودھیا ناتھ لکھنؤ کے قدیم باشندے تھے۔ وہ فیض آباد میں بھی ملازمت کر چکے تھے۔ کیفی کی بیوی اس دور کے لحاظ سے اچھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ ان کا انتقال کیفی ہی کی زندگی میں 1924ء کے آس پاس ہوا۔ اس وقت کیفی کی عمر تقریباً 58 سال کی تھی۔ بیوی کی بے وقت اور اچانک موت کا صدمہ کیفی کو تمام عمر رہا۔ کیفی کے تین بیٹے ہوئے۔ آپ کے بڑے بیٹے کا نام پنڈت پیارے موہن دتاتریہ تھا۔ یہ انگریزی اخبار 'ٹری بیون' (The Tribune) کے جو اس زمانے میں لاہور سے شائع ہوتا تھا، فرسٹ اسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ پیارے موہن دتاتریہ انگریزی کے ایک ممتاز صحافی اور متعدد کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ اردو کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو میں ایک نئی طرز کا ڈرامہ ''پھول کماری'' کے نام سے تحریر کیا تھا جو اردو داں حلقے میں بے حد پسند کیا گیا تھا۔ انھوں نے بحیثیت ناشر کیفی کے لکچروں اور مضامین کا مجموعہ 'منشورات' کے نام سے پہلی بار 1924ء میں لاہور سے شائع کیا۔ اس کتاب کے شروع میں ان کا ایک مختصر نوٹ بھی شامل ہے۔ کیفی کے لیے یہ بڑی فراغت اور اطمینان کا

زمانہ تھا۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں ایک شاندار کوٹھی بھی تعمیر کرائی گئی تھی اور یہ سب لوگ بڑی آسودگی اور آرام کے ساتھ وہاں زندگی کے دن گذار رہے تھے کہ ان کے بیٹے پنڈت پیارے موہن دتاتریہ کا اچانک انتقال ہوگیا۔ بیٹے کی موت کے صدمے نے کیفی کو زندہ درگور کردیا تھا۔ بیوی کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور کی عظیم الشان کوٹھی ویران نظر آتی تھی۔ کیفی کا دل یہاں بالکل نہیں لگتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے منجھلے بیٹے پنڈت سریندر موہن دتاتریہ کے پاس لائل پور چلے گئے جو وہاں کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ کیفی یہاں کئی سال رہے۔ وہ اکثر گرمیوں میں کشمیر جایا کرتے تھے۔ 1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو کیفی اس وقت لائل پور میں تھے۔ اس وقت ان کی عمر اسی ۸۰ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ تقسیم کی وجہ سے لائل پور کی فضا مسموم ہو چکی تھی، چنانچہ کیفی کے پوتے رام موہن دتاتریہ کسی طرح انھیں لائل پور سے نکال کر بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی (اب ممبئی) لے گئے۔ سریندر موہن دتاتریہ بھی لائل پور سے بچ کر نکل آئے تھے۔ کیفی کے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے پنڈت مدن موہن دتاتریہ عنفوانِ شباب ہی میں داغ مفارقت دے چکے تھے۔ کیفی کو یہ سب سے پہلا خاندانی صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔

کیفی نے اپنی تعلیم کے دوران میں اردو، فارسی اور انگریزی پر کافی عبور حاصل کرلیا تھا۔ ادب کے ساتھ ساتھ انھیں صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ فارغ التحصیل ہونے پر انھوں نے ایک کانگریسی اخبار 'خیر اندیش' کے ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھال لی۔ یہ اخبار لالہ مرلی دھر نے جو پنجاب کے حریت پسند اور ایک سرگرم سیاسی کارکن تھے، انبالہ سے نکالا تھا، لیکن یہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا اور بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ اس اخبار کی ادارت کے دوران ہی کیفی کو کانگریس کا ڈیلی گیٹ منتخب کیا گیا اور وہ 1889ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی گئے لیکن علمی آدمی ہونے کی وجہ سے سرگرم سیاست میں کبھی حصہ نہ لے سکے۔ 'خیر اندیش' جب بند ہوگیا تو کیفی کپورتھلہ دربار سے وابستہ ہوگئے۔ وہاں کے راجا دلجیت سنگھ کیفی کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ کیفی مدتوں ان کے ساتھ رہے۔ اسی زمانے میں وہ یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ یورپ کی سیاحت کے دوران پہلی عالمی

جنگ چھڑ گئی اور سیاسی حالات ناگفتہ بہ ہونے لگے۔ بالآخر جنگ کے دوران ہی انھیں واپس لوٹنا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سال کی تھی۔

یورپ سے واپسی پر کیفی کی ملاقات تذکرۂ 'خم خانۂ جاوید' کے مصنف لالہ سری رام سے ہوئی جو زندگی بھر کی دوستی اور قرب کا باعث ہوئی۔ یہاں تک کہ اکثر لوگ کیفی کو لالہ سری رام کا بڑا بھائی سمجھتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کیفی نے 'خم خانۂ جاوید' کی تدوین میں لالہ سری رام کی ہر ممکن مدد کی۔ اس کام کا منصوبہ بہت بڑے پیمانہ پر تیار کیا گیا تھا اور یہ ایک طولانی کام تھا، لیکن 'خم خانۂ جاوید' کی ابھی صرف چار جلدیں ہی شائع ہوئی تھیں کہ ناگہانی طور پر لالہ سری رام کا انتقال ہو گیا۔ کیفی کو ان کی وفات کا اتنا صدمہ تھا کہ لالہ سری رام کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں۔

کیفی ابھی 'خم خانۂ جاوید' کے کاموں میں مصروف تھے کہ راجہ دلجیت سنگھ جن کے ساتھ وہ کپورتھلہ میں رہ چکے تھے کشمیر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنا پرائیویٹ سکریٹری بھیج کر کیفی کو دہلی سے کشمیر بلوالیا۔ کیفی خوشی خوشی وہاں چلے گئے اور ریاستِ کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

سنہ 1947ء میں تقسیمِ ملک کے وقت جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا۔ کیفی اس وقت لائل پور میں اپنے منجھلے بیٹے پنڈت سریندر موہن دتاتریہ کے پاس تھے۔ کہیں سے یہ افواہ پھیلی کہ کیفی قتل کر دیے گئے۔ اس خبر کو سن کر علمی و ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اخباروں میں تعزیتی نوٹ شائع ہونا شروع ہو گئے۔ ایک شاعر مولانا اطہر ہاپوڑی نے جنھیں کیفی سے بے حد عقیدت تھی، کیفی کی وفات پر مرثیہ بھی لکھ ڈالا۔ کیفی نے جب اپنی موت کی خبر اخباروں میں پڑھی تو انھیں بہت صدمہ پہنچا۔ 'ریاست' کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتوں کو انھوں نے لکھا کہ اہلِ وطن کے اس رویّے کو دیکھ کر جو دلی اذیت مجھے ہوئی اور جس طرح میری روح تڑپی اور تڑپ کر رہ گئی موت ہی اس سے نجات دلا سکتی ہے۔ بعض اخبارات میں ان کی موت کی خبر کی تردید کی گئی کیوں کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، کیفی بہ سلامت اپنے پوتے رام موہن دتاتریہ کے ساتھ بذریعۂ ہوائی جہاز لائل پور سے بمبئی آ گئے تھے۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صحیح معنیٰ میں اردو کے ایک سچے عاشق، شیدائی اور پرستار تھے۔ وہ اردو کے محسن بھی تھے اور خادم بھی۔ انھوں نے نہ صرف ادبی و علمی سطح پر اردو کی گراں قدر خدمات انجام دیں بلکہ عملی طور پر بھی اردو کی ترقی اور اس کی بقا کے لیے تاعمر کوشاں رہے۔ وہ جہاں بھی رہے علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے اور اردو زبان کے فروغ کے منصوبے بناتے رہے۔ کیفی کا حیدر آباد (دکن) کی علمی و ادبی کانفرنسوں اور جلسوں میں اکثر جانا ہوتا تھا۔ مولوی عبدالحق بھی ان دنوں حیدر آباد میں سرکاری ملازم تھے۔ ان سے کیفی کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کیفی نے اپنی علمیت اور اردو دوستی کا سکہ وہاں کے عوام پر بہت جلد بٹھا دیا تھا۔ مولوی عبدالحق بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ مولوی عبدالحق کے کیفی کے ساتھ نہایت دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے جو تاعمر قائم رہے۔ حتیٰ کہ ملک کی تقسیم بھی ان کی دوستی کو متزلزل نہ کر سکی۔ مولوی عبدالحق، کیفی کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔ وہ عمر میں مولوی عبدالحق سے چند سال بڑے بھی تھے۔ مولوی عبدالحق نے اس بات کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ کیفی کو اردو کے ساتھ والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ اردو کی خدمت کا دل میں بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کیفی کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے کاموں کی طرف راغب کیا۔ سنہ 1938ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کا دفتر اورنگ آباد سے منتقل ہو کر دہلی آ گیا تھا۔ اب انھیں ایک ایسے معاون اور رفیقِ کار کی ضرورت تھی جو انجمن کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹا سکے۔ اردو زبان و ادب کو فروغ دینے، اردو تحریک میں سرگرمی پیدا کرنے اور انجمن کے کاموں کو آگے بڑھانے میں انھیں کیفی سے بڑھ کر اور کون مل سکتا تھا، چنانچہ مولوی عبدالحق انھیں لائل پور سے دہلی لے آئے اور دونوں انجمن کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

دہلی میں انجمن ترقی اردو کے کاموں کو درست کرنے کے بعد مولوی عبدالحق اور کیفی نے انجمن کی صوبائی شاخوں کی طرف توجہ دی، چنانچہ دونوں 1939ء میں کشمیر گئے اور وہاں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی۔ یہاں ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی جس میں سر تیج بہادر سپرو، نواب جعفر علی خاں اثر، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر تارا چند وغیرہ نے شرکت کی۔ اسی سال

یعنی 1939ء میں انجمن ترقی اردو دہلی کی کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کی تیاری کے لیے انھوں نے بڑی تگ و دو کی اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں رات دن ایک کر دیا۔ کیفی اس زمانے میں دریا گنج میں کوٹھی نمبر-اے میں مقیم تھے۔ یہ ڈاکٹر مختار الدین انصاری کی کوٹھی تھی۔ انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے منتقل ہو کر اسی کوٹھی میں آیا تھا۔ یہیں رہ کر کیفی نے 'خم خانۂ جاوید' کی پانچویں جلد کی ترتیب کا کام مکمل کیا جو لالہ سری رام کے بے وقت انتقال کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ یہ جلد 1940ء میں شائع ہوئی۔ کیفی انجمن کی سرگرمیوں اور اپنے علمی و ادبی کاموں میں انتہائی مصروف تھے کہ 1945ء میں ان پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا۔ جب ان کے بیٹے پنڈت سریندر موہن دتاتریہ کو ان کی بیماری کا علم ہوا تو وہ دہلی آ کر انھیں اپنے ساتھ لائل پور لے گئے۔ اس کے دو سال بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے۔ ادھر 1947ء کے ہنگاموں میں کیفی بچتے بچاتے لائل پور سے بمبئی پہنچے۔

سنہ 1930ء سے لے کر 1947ء تک کا زمانہ اردو کے لیے بڑا نازک دور تھا۔ اس پُر آشوب دور میں اردو کے مخالفین اردو کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اردو مخالف سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ اردو کا وجود سخت خطرے میں پڑ گیا تھا۔ مولوی عبدالحق ہر طرح کے چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ اردو کے دفاع کے لیے پورے طور پر میدان میں اتر آئے تھے۔ وہ گاندھی جی کے اس اصرار سے کہ ملک کی زبان ''ہندی اتھوا ہندوستانی'' ہو سخت مایوس ہوئے تھے۔ سنہ 1936ء میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا جو اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ناگپور میں منعقد ہوا تھا اس کے بعد سے ہندی اردو تنازع نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس اجلاس نے مولوی عبدالحق کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسی لیے وہ ناگ پور کو ''جاگ پور'' کہا کرتے تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کے دفتر کو دہلی منتقل کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی۔ ایسی نازک صورتِ حال میں جب 1938ء میں انجمن کا دفتر دہلی منتقل ہوا تو یہ تحفظِ اردو کی تحریک کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ انجمن میں اردو کے تحفظ اور بقا کے نئے نئے منصوبے بنائے جاتے تھے اور آئے دن جلسے اور میٹنگیں ہوتی تھیں۔ محبان و بہی خواہانِ اردو اپنے اپنے مشورے پیش کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق اس زمانے میں بیحد مصروف

رہتے تھے۔ کیفی جب تک دہلی میں رہے، اپنی بساط بھرا نجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور مولوی عبدالحق کو اپنا بھرپور تعاون دیتے رہے۔ اردو کی تحریک کو جلا بخشنے اور اردو کے کاز کو فروغ دینے میں کیفی 1945ء تک مولوی عبدالحق کے دستِ راست بنے رہے۔ اگر کیفی کی رفاقت اور معیت عبدالحق کو حاصل نہ ہوئی ہوتی تو وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتے اور اردو تحریک میں بھی شاید وہ تیزی اور گرمی پیدا نہ ہونے پاتی۔

تقسیمِ ملک کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کا شیرازہ پورے طور پر بکھر چکا تھا۔ مولوی عبدالحق پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ انجمن کا دفتر لٹ چکا تھا۔ اس کی لائبریری برباد ہو چکی تھی اور ہزاروں قیمتی اور نایاب قلمی نسخے اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب اور مشاہیر کے خطوط نذرِ آتش کر دیے گئے تھے۔ کیفی کو انجمن کے لٹنے اور برباد ہونے کا شدید رنج تھا۔ وہ انجمن کے قالب میں دوبارہ روح پھونکنا چاہتے تھے اور اس کے کاموں کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے لیے کیفی ہی سب سے موزوں انسان تھے، کیونکہ مولوی عبدالحق کے ساتھ رہ کر انجمن کا کام کرنے کا سب سے زیادہ تجربہ کیفی ہی کو حاصل تھا۔ فتنہ فرو ہونے پر ان سے جو کچھ بھی ہو سکا انھوں نے اپنی بساط بھر انجمن کے لیے کیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا کیے۔ چنانچہ انجمن چل نکلی اور اس نے آزاد ہندوستان میں اردو کے فروغ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تقسیمِ ملک کے بعد قاضی عبدالغفار انجمن کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور اکتوبر 1947ء میں انجمن کا دفتر دہلی سے علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ کیفی کا تعلق اس وقت بھی انجمن سے برقرار رہا۔ وہ مختلف حیثیتوں سے انجمن سے منسلک رہے اور اس کی میٹنگوں میں شرکت کے لیے باوجود ضعیفی اور پیرانہ سالی کے باقاعدہ طور پر دہلی سے علی گڑھ آیا کرتے تھے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ کیفی ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں لائل پور سے بمبئی آ گئے تھے اور وہیں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی وغیرہ کی کوششوں سے احمد آباد (گجرات) میں ایک کل گجرات اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لیے لوگ کیفی کو بمبئی سے احمد آباد لے آئے۔ کراچی سے مولوی عبدالحق بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے احمد آباد آئے تھے۔ اس طرح دہلی کے دو بچھڑے دوست پھر ملے اور گلے مل

کر خوب روئے۔ کانفرنس ختم ہوگئی تو مولوی عبدالحق کیفی کو اپنے ساتھ ہوائی جہاز سے کراچی لے گئے لیکن ان کی صحت وہاں زیادہ خراب رہنے لگی اس لیے وہ واپس دہلی آگئے۔ کراچی سے واپسی پر انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس بار وہ 'خم خانۂ جاوید' کے مصنف لالہ سری رام کی عالی شان کوٹھی واقع علی پور روڈ کے ایک حصے میں مقیم ہوئے اور عمر کے آخری ایام تک وہیں قیام پذیر رہے۔

کیفی کی بیماریوں کا سلسلہ 1945ء سے شروع ہوتا ہے، جب پہلی بار ان پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال سے ذرا کم تھی۔ 17 فروری 1951ء کے اپنے ایک خط میں وہ مالک رام صاحب کو جو ان دنوں بغداد میں مقیم تھے، لکھتے ہیں:

''میں بہت بوڑھا ہوں اور چھ برس سے مختلف بیماریوں کا تختۂ مشق ہوں۔''

دل کی بیماری کا حملہ ہونے پر وہ اپنے بیٹے پنڈت سریندر موہن دتاتریہ کے پاس لائل پور چلے گئے تھے۔ وہاں ان کا ہومیوپیتھی علاج شروع ہوا تھا جس سے مرض میں افاقہ ہونے لگا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد علاج کے لیے انھیں بمبئی لے جایا گیا جہاں امراضِ قلب کے ایک ماہر کا علاج شروع ہوا۔ کچھ مدت تک وہ بمبئی میں رہے، پھر لائل پور آگئے اور یہاں پھر ہومیوپیتھی علاج شروع ہوگیا۔ 1950ء کے بعد سے ان کی صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔ 11 فروری 1953ء کو ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نام ایک خط میں کیفی اپنی بیماری کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

''میرا چھیاسی واں سال گذر رہا ہے۔ 1945ء سے وجعِ مفاصل، دل اور سانس کی بیماریوں کا شکار ہوں۔ مجھے امید نہیں کہ ایک سال سے زیادہ مرگِ مسلسل کی سزا بھوگ سکوں گا۔''

نومبر 1954ء میں مالک رام بیرونِ ملک سے وطن واپس ہوئے۔ یہاں پہنچتے ہی وہ کیفی سے ملنے غازی آباد گئے۔ اس وقت ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ بہت زیادہ کمزور ہوگئے تھے۔ بقول مالک رام:

''وہ محض ہڈیوں کا پنجرہ رہ گئے تھے۔ کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی تھی۔ پیچش نے

ہلکان کر رکھا تھا۔ انھیں چوکی پر بیٹھنے میں بھی ہفت خواں طے کرنا پڑتی تھی۔"

کیفی علیل تو تھے ہی، ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس پر آنکھوں کی تکلیف مستزاد تھی۔ وہ اگست 1954ء میں آنکھوں کا آپریشن کرانے علی گڑھ گئے۔ آپریشن بہت کامیاب رہا اور آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی، لیکن جسمانی طور پر وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، چونکہ اتنی کمزوری کی حالت میں کیفی تنہا نہیں رہ سکتے تھے اس لیے آنکھوں کے آپریشن کے بعد جب پٹی کھلی تو دہلی جانے کے بجائے وہ چند دنوں کے لیے غازی آباد میں اپنے بھتیجے پنڈت اومکار ناتھ کے ہاں رک گئے جو وہاں وکالت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گھر میں رہنے اور مناسب دیکھ بھال اور آرام سے جب طبیعت ذرا سنبھل جائے گی تو دہلی چلے جائیں گے لیکن یہاں بیماریوں نے انھیں ایسا آن دبوچا کہ ذرا بھی مہلت نہ ملی۔ ان کے عزیزوں نے ان کے علاج اور دیکھ بھال میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی لیکن افسوس کہ ان کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی بالآخر وہ یکم نومبر 1955ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اب دہلی کبھی نہیں جا سکیں گے اور ان کی یہ خواہش کہ "جس دہلی کی خاک سے اٹھا ہوں اُسی میں یہ خاک پھر سما جائے گی" کبھی پوری نہ ہوگی۔ انتقال کے وقت کیفی کی عمر 89 سال کی تھی اگر وہ 13 دسمبر 1956ء تک اور جیتے تو زندگی کی 90 بہاریں دیکھتے۔

(2)

کیفی کا تعلق اگرچہ برہمنوں کے خاندان سے تھا جو اپنے عقائد میں قدرے کٹر اور مذہبی معاملات میں کسی حد تک سخت گیر ہوتے ہیں، لیکن کیفی اپنے مذہبی عقائد کے معاملے میں نہایت لبرل اور روشن خیال واقع ہوئے تھے۔ وہ مذہبی جلسے جلوسوں سے عملاً دور رہتے تھے اور بظاہر پوجا پاٹ یا دان دھرم کی بات نہیں کرتے تھے، لیکن وہ کرشن جی کے سچے شیدائی تھے۔ انھوں نے کرشن جی کی شان میں جو نظمیں لکھی ہیں وہ اسی عقیدت کی مظہر ہیں۔

کیفی نہایت وضع دار انسان تھے۔ وہ انتہائی خلیق اور ملنسار بھی تھے۔ خودداری کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ احباب سے مل کر بہت خوش ہوتے اور ان کا بڑے تپاک

سے خیر مقدم کرتے۔ ایک دفعہ دوستی ہو جانے پر زندگی بھر اسے نبھاتے۔ چھوٹوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد اکثر انھیں اپنی شعری تخلیقات اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ گھر پر بھی لوگ ان سے مشورۂ سخن کرنے حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ جو بھی ان سے رجوع کرتا اس کی وہ ہر ممکن مدد کرتے۔ انھوں نے کتنے ہی مصنفوں اور شاعروں کی کتابوں پر مقدمے، دیباچے اور تبصرے لکھے۔ ان کا درِ فیض ہر ایک کے لیے کھلا رہتا تھا۔

کیفی بہت بڑے عالم تھے لیکن تمکنت، پندار یا نام و نمود ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ کیفی رجائیت کے قائل تھے۔ زندگی میں مایوسیوں کا شکار ہونے اور سخت غم گینی کی کیفیت میں بھی انھوں نے قنوطیت کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ وہ دوسروں کو بھی قنوطی اور یاس پرست ہونے سے منع کرتے تھے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کو اپنے ایک خط مورخہ 24 نومبر 1949ء میں لکھتے ہیں:

> ''بڑھاپا چھا جانے کا غم نہ کیجیے، دل جوان رکھیے، ایک شخص بوڑھا ہو گیا تو کیا ہوا اور کچھ دن میں اس کے بچے جوان ہوں گے، اس کا بڑھاپا دنیا کے جوانوں میں ایزادی کرے گا۔''

اس خط میں وہ ڈاکٹر دیوانہ کو مزید لکھتے ہیں:

> ''آپ کے وہ دونوں شعر لاجواب ہیں، لیکن معاف کیجیے، مجھے پسند نہیں کیونکہ وہ سخت یاس اور قنوطیت سے گراں بار ہیں۔''

کیفی بہت پڑھے لکھے انسان تھے، ان کی تمام تر زندگی ادبی کاموں اور علمی مصروفیتوں میں گذری تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بقول مالک رام: ''انھیں پڑھنے لکھنے کا گویا جنون تھا۔'' انھوں نے علم اور حصولِ علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ مطالعے کا شوق اور کتابوں کا خبط انھیں آخرِ عمر تک رہا۔ وہ بیک وقت اردو، فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی جانتے تھے۔ اردو کے تو خیر وہ مسلم الثبوت ادیب اور عالم تھے ہی۔ فارسی کے بھی وہ منتہی تھے۔ فارسی انھوں نے پہلے مکتب کے 'میاں جی' سے پڑھی پھر اپنے نانا سے اس کی تکمیل کی۔

انگریزی کے بھی وہ سند یافتہ تھے۔ اسی طرح عربی اور سنسکرت کا ان کا علم بھی محدود نہ تھا۔ کیفی کا اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ کلاسیکی شعرا کے سینکڑوں اردو اور فارسی اشعار انھیں زبانی یاد تھے اور وہ انھیں برمحل استعمال بھی کرتے تھے۔ وہ شعر نہایت روانی اور صحیح متن و تلفظ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اپنے لکچرز اور تحریر و تقریر میں وہ اردو فارسی کے اشعار جا بجا پیش کرتے تھے۔ اس سے حافظے پر ان کی قدرت اور مطالعے کی وسعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے دماغ میں ادبی و علمی معلومات کا بے پناہ ذخیرہ چھپا ہوا تھا۔ اردو کے لسانی مسائل و مباحث سے بھی ان کی دلچسپی بہت گہری تھی۔ علاوہ ازیں حالاتِ حاضرہ اور دیگر علوم پر بھی وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر بڑے اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ اس لیے لوگ انھیں اکثر 'انسائی کلوپیڈیا' کہہ دیا کرتے تھے۔

کیفی کی ماڈل ٹاؤن، لاہور والی کوٹھی میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا جو تقسیمِ ملک کے ہنگامے میں تباہ ہو گیا۔ جب انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی رفتہ رفتہ کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا، لیکن وقتاً فوقتاً انھوں نے بہت سی کتابیں مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کو دے ڈالیں۔ کچھ کتابیں پنجاب یونیورسٹی، لاہور کو دیں، کچھ بنارس ہندو یونیورسٹی کو دیں اور انتقال سے کچھ عرصہ قبل انگریزی کی بہت سی کتابیں دہلی یونیورسٹی کو دے دیں۔ نایاب کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ انھوں نے انجمن ترقیِ اردو (ہند) کو بھی دیا۔ دہلی میں ان کے نام پر ایک کیفی لائبریری قائم ہوئی تھی۔ چنانچہ کچھ کتابیں کیفی نے اسے بھی نذر کیں۔

کیفی کو اس بات کا بے حد قلق رہا کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی تصانیفِ نثر و نظم اور مضامین و مسودات، نیز خطوط اور روزنامچوں کا کیا ہوگا جنھیں وہ چھپوانا چاہتے تھے یا ان میں سے جو چیزیں پہلے چھپ چکی تھیں انھیں دوبارہ چھپوانا چاہتے تھے اور بہت سی چیزوں کو وہ از سرِ نو ترتیب دینا چاہتے تھے۔ ان کے اہلِ کنبہ میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جسے یہ ذمہ داری سونپی جاتی۔ چنانچہ اس کام کے لیے ان کی نظرِ انتخاب مالک رام پر پڑی جو ان دنوں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بغداد میں مقیم تھے۔ حالاں کہ مالک رام سے نہ تو ان کی کبھی ملاقات

ہوئی تھی اور نہ ہی خط و کتابت تھی۔ البتہ مالک رام کی کچھ چیزیں انھوں نے رسائل وغیرہ میں ضرور پڑھی تھیں۔ مالک رام کا پتا حاصل کر کے کیفی نے انھیں بغداد خط لکھا اور اپنی ادبی جائداد کی وصیت کا ان سے ذکر کیا۔ مالک رام جب ہندوستان واپس آئے تو کیفی سے ملے لیکن وصیت کا معاملہ کچھ طے نہ ہوسکا۔ معلوم نہیں اس معاملے میں مالک رام کی طرف سے کچھ ڈھیل ہوئی یا کیفی نے وصیت کا اپنا ارادہ بدل دیا۔ بہر حال کیفی نے پھر شوکت سبزواری کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ شوکت سبزواری ڈھاکہ سے جب ہندوستان آئے تو دہلی میں کیفی سے ملے۔ پھر ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے۔ بیماری کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اور انھیں فرصت ہی نہ ملی کہ وہ اس کام کی طرف توجہ دیتے۔ اس دوران میں کیفی کا انتقال ہو گیا۔

کیفی کو اردو سے بے پناہ محبت اور گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ اُردو سے ان کی محبت دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ وہ تمام عمر اردو کے لیے جیے اور اسی کے لیے کام کرتے رہے۔ علمی و ادبی کاوشوں کے علاوہ اردو کے فروغ اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے بھی دل سے کوشاں رہے۔ اردو کی لگن اور اس زبان سے والہانہ شیفتگی نے انھیں ضعیفی اور پیرانہ سالی میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور وہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے وسیلے سے مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر اپنی بساط بھر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ بہ قول مالک رام ''انھیں سوتے جاگتے ایک ہی دُھن تھی کہ اردو کا ملک میں کیا حال ہے، اس کے خلاف کیا کیا چالیں چلی جارہی ہیں اور کن کن ذرائع سے اس کی بقا اور ترقی کا سامان مہیا ہوسکتا ہے۔'' شاہد احمد دہلوی نے کیفی کو اردو کا ''کٹر عاشق'' کہا ہے۔ کائستھوں کی اردو فارسی کا اکثر مذاق اڑایا گیا ہے۔ بعض من چلے تو یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ ہندوؤں کو تو اردو آ ہی نہیں سکتی۔ کیفی اس کے جواب میں کہتے کہ مسلمان اردو کیا جانیں، اردو تو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوؤں ہی کی زبان ہے۔

اردو کو کیفی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث سمجھتے تھے۔ وہ اسے دونوں قوموں کی ملی جلی کوششوں اور اتحاد کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ بقول کیفی:

''اردو کیا ہے؟ دو مختلف معاشرتوں، دو مختلف مذہبوں، دو مختلف کلچروں کے

شیر وشکر ہونے اور ارتباط کی یادگار ہے۔"

کیفی کے زمانے میں اردو دشمن طاقتیں پوری طرح سر اٹھا رہی تھیں۔ انھیں ان سب باتوں کا بے حد افسوس اور دلی رنج تھا۔ وہ اس رجحان کو ملک وقوم اور اس کے تمدن کے لیے سخت خطرہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا:

> "مجھ کو رونا ہے تو یہ کہ اردو کی مخالفت جس جوش وخروش کے ساتھ اب شروع ہوئی اور جو منافقانہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس کا زہریلا اثر وطنیت اور صدیوں کی بنائی ہوئی کلچر کو ملیامیٹ کر دے گا اور ہمارے ہندوستانی تمدن اور وجاہت کا خون اپنی گردن پر لے گا۔"

(3)

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو ادب کے ساتھ ساتھ علم السنہ بالخصوص اردو کے لسانی پہلوؤں سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ کیفی نے لسانی تحقیق میں اگرچہ کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا اور نہ ہی لسانیاتی موضوع پر کوئی مربوط تصنیف یادگار چھوڑی، تاہم اپنی بساط بھر وہ اردو کے لسانی مسائل پر غور وخوض کرتے رہے۔ اسی طرح اگرچہ انھوں نے اردو کے آغاز وارتقا کا کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا لیکن اس کے تاریخی ارتقا اور لسانی مزاج ومنہاج کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اردو میں لسانیاتی مطالعے کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ حافظ محمود خاں شیرانی 1928ء میں 'پنجاب میں اردو' تصنیف کر چکے تھے۔ اس کے دو سال بعد 1930ء میں سید محی الدین قادری زور کی 'ہندوستانی صوتیات' *(Hindustani Phonetics)* شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کے دو سال بعد ان کی ایک دوسری اہم کتاب 'ہندوستانی لسانیات' منظرِ عام پر آئی تھی۔ محمود شیرانی اور زور کے علاوہ وحید الدین سلیم، شمس اللہ قادری، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، عبدالستار صدیقی اور سید مسعود حسن رضوی ادیب جیسے علماء بھی اردو کے لسانی مسائل ومباحث میں دلچسپی لے رہے تھے۔ کیفی کو دورِ گذشتہ میں خان آرزو، انشاء اللہ خاں

انشا اور مولانا محمد حسین آزاد کی لسانی موشگافیوں کا بھی پورا علم تھا۔ اس کے علاوہ پچھلی صدی کے دوران میں قواعدِ زبان، فرہنگ امثال، مصلحاتِ روز مرّہ، تذکیر و تانیث، متروکات، اصطلاحِ زبان اور رسمِ خط نیز املا کے مسائل پر جو کثیر لسانی سرمایہ معرضِ وجود میں آچکا تھا اس تک بھی ان کی رسائی تھی۔ غالباً انھیں امور نے لسانی موضوعات کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ اپنے ایک توسیعی لکچر میں جو انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد میں 1931ء میں دیا تھا، فرماتے ہیں:

''اردو نے قدیم اور متوسط زمانوں میں کیا لسانی ترقی کی اور اس اعتبار سے اب اس کی کیا حالت ہے، اس کا مجمل تذکرہ آج کیا جائے گا۔ تحقیق اس امر کی منظور ہے کہ عہدِ حاضر میں اردو لسانیاتی اعتبار سے کس درجہ کو پہنچتی ہے اور یہ کہ وہ حالت اطمینان کے قابل ہے یا نہیں؟ یہ تحقیق نہ صرف اس (شخص) یا اس جماعت بلکہ ہر شخص کا فرض ہے جو اردو کو اپنی زبان کہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔''

کیفی کی اردو لسانیات سے دلچسپی کے کئی پہلو ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل سے لے کر الفاظ و مرکبات، محاورات و ضرب الامثال، تذکیر و تانیث، متروکات، روز مرّہ اور اردو رسم خط اور املا نیز صوتیات اور تاریخی لسانیات کے مسائل تک سے بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ قواعدِ زبان، بیان و بلاغت اور اسلوب کے مسائل پر بھی غور و فکر سے کام لیا ہے۔ لیکن ان تمام امور کے باوصف بہ قول مسعود حسین خاں:

''ان کی تحریروں میں ہند آریائی تحقیق کے دیوزادوں، جان بیمز، گریرسن، ژول بلاک اور چٹرجی کی تصانیف سے استفادے کا ثبوت نہیں ملتا۔ جہاں تک کہ توضیحی لسانیات کا تعلق ہے تو یہ علم اس وقت تک اپنے عہدِ طفولیت میں تھا۔'' (مقدمہ، 'کیفیہ'، ص 16-15)

کیفی نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اگرچہ سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے لیکن اس مسئلے پر ان کی معلومات تشنہ ہیں۔ وہ اس امر پر دوسرے محققین سے اتفاق کرتے

ہیں کہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی لیکن یہ مسئلہ ان کے لیے غور طلب ہے کہ اردو ہندوستان کے کس حصے میں پیدا ہوئی۔ اردو کب اور کہاں پیدا ہوئی کی گتھی کو سلجھانے کے لیے وہ سب سے پہلے چند تاریخی حقائق اور واقعات پر غور کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے سے پہلے فارسی سے واقفیت کی یہاں کیا حالت تھی اور اس وقت کی دیسی زبانوں میں فارسی اور عربی الفاظ کس حد تک داخل ہو چکے تھے۔ پھر وہ اس امر پر غور کرتے ہیں کہ اردو کی پیدائش کے وقت شمال اور شمال مغربی ہند میں کون کون سی زبانیں رائج تھیں۔

مختلف تاریخی اور تحقیقی حوالوں سے کیفی نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے سے قبل فارسی یہاں پہنچ چکی تھی اور فارسی کے توسط سے عربی الفاظ بھی یہاں کی زبانوں میں داخل ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو تاریخی حقائق پیش کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے ('کیفیہ'، ص 101):

- ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط سے قبل سفارتی اور ملک داری کے معاملات سے متعلق جو مراسلے ہندو راجاؤں کے دربار سے اسلامی حکومتوں کو بھیجے جاتے تھے وہ فارسی زبان میں ہوتے تھے۔ ہندو درباروں کے یہ مراسلہ نویس معتبر ہندو منشی ہی ہو سکتے تھے نہ کہ کوئی غیر ملکی، کیوں کہ سیاسی معاملات سے متعلق صیغۂ راز کے کام کسی غیر ملکی کے سپرد نہیں کیے جا سکتے۔ اسی لیے پہلے پہل انھیں ہندو منشیوں نے یہ فارسی زبان سیکھی ہوگی۔
- محمود غزنوی کے زمانے میں ہندی زبان کے ترجمان کی ایک جماعت غزنی میں مقیم تھی جس میں تلک نامی شخص کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس کی فارسی دانی نیز بہادری اور انتظامی امور میں بے پناہ قابلیت کا ذکر فارسی تاریخوں میں بہت آیا ہے۔ تلک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غزنی کی ہندوؤں کی فوج کی جو محمود غزنوی نے قائم کی تھی، کمان سنبھالے ہوئے تھا۔
- چندر بردائی نے جو لاہور کا رہنے والا تھا اور مہاراجہ پرتھوی راج چوہان کے دربار کا

ملک الشعرا تھا، ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام' پرتھوی راج راسو' ہے۔ اس کتاب میں فارسی اور عربی کے بے شمار الفاظ پائے جاتے ہیں۔

- پرتھوی راج چوہان اور شہاب الدین غوری کے درمیان آخری لڑائی 1192ء میں ترائن کے مقام پر ہوئی تھی۔ اس جنگ میں پرتھوی راج چوہان کی بہن راج کماری پرتھابائی کے شوہر راول سمر سنگھ بھی شریک ہوئے تھے جو مارے گئے تھے۔ پرتھابائی نے ستی ہونے سے قبل اپنے بیٹے کو جو ان دنوں چتوڑ میں تھا، ایک خط لکھا تھا جس میں عربی فارسی کے متعدد الفاظ ہیں۔
- 1192ء سے بہت پہلے بدھ مذہب کے زمانے میں بھی فارسی الفاظ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں مستعمل تھے۔

اردو کی پیدائش کے سلسلے میں کیفی شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں میں عربی فارسی الفاظ کی شمولیت اور پنجاب کے سیاسی واقعات کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور بالآخر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ" اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔ ایک جگہ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہندوستان میں اسلامی حملوں اور فتوحات سے پیشتر اردو کی داغ بیل پڑ جانا قرینِ قیاس ہے۔"

پنجاب میں مسلمانوں کی آمد امیر سبکتگین کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ امیر سبکتگین غزنی کے ترک بادشاہ الپتگین کا بیٹا تھا اور 977ء میں الپتگین کی وفات کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا تھا۔ بیس سال تک حکومت کرنے کے بعد 997ء میں جب سبکتگین کا انتقال ہوا تو پنجاب کا ایک بڑا حصہ اس کے زیر تسلط تھا۔ امیر سبکتگین کی موت کے بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی اس کا جانشین مقرر ہوا جس نے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر پے در پے حملے کیے جس کے نتیجے میں پنجاب حکومتِ غزنی کا ایک صوبہ بن گیا۔ محمود غزنوی کی وفات 1030ء کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود تخت پر بیٹھا تو اس کی یورشوں کا سلسلہ پنجاب سے باہر ہانسی اور سونی پت تک پھیل گیا۔

ان فتوحات کا اثر وہاں کی زبان پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوؤں کی ایک فوج قائم کی تھی جو غزنی میں رہتی تھی اور شورشوں کا سر

کھلنے کے لیے اکثر پنجاب بھیجی جاتی تھی۔ چنانچہ سلطان مسعود کے زمانہ میں جب پنجاب کے ایک صوبے دار نے بغاوت کی تو اس کی سرکوبی کے لیے تلک کو جس کے ہاتھ میں غزنی کی ہندوستانی فوج کی کمان تھی، غزنی سے پنجاب بھیجا گیا۔ ان تاریخی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ غزنی کی ہندوستانی فوج یا چھاؤنی زبردست سیاسی اہمیت رکھتی تھی۔ چنانچہ کیفی لکھتے ہیں:

> ''ظنِ غالب یہ ہے کہ اس فوج کی مع افسروں کے پنجاب میں بھرتی ہوئی ہوگی اور سب سے پہلے یہی لوگ شعبۂ ترجمہ اور پھر اردو کی پیدائش کے ذمہ دار رہے ہوں گے۔'' ('کیفیہ'، ص 4)

پھر وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''قیاس یہ ہے کہ اوّل اوّل ایک چوں چوں کے مربے کی سی ادھ کچری کھچڑی بولی پنجاب میں شروع ہوئی ہوگی۔ پھر پنجاب سے شمال مغربی ہند میں پھیلی۔'' (ایضاً)

پنجاب کے شہر لاہور کو کیفی اس ''نئی زبان'' اور ''مخلوط کلچر'' کا ابتدائی مرکز قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو 'پرتھوی راج راسو' کا فرہنگ بھی ایسا نہ ہوتا جیسا کہ وہ ہے اور نہ پرتھابائی کے خط میں اتنے عربی فارسی الفاظ آتے۔

اس امر کا ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا کہ اردو زبان کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ در اصل کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ کیفی سے پہلے محمود شیرانی بہت تفصیل کے ساتھ اس نظریے کو اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' (1928ء) میں پیش کر چکے تھے۔ درحقیقت یہ نظریہ محمود شیرانی کا بھی کوئی اپنا نیا نظریہ نہیں، بلکہ ان سے پہلے شیر علی سرخوش نے اس نظریے کو اپنے تذکرے 'اعجازِ سخن' (1923ء) میں پیش کیا تھا جس کا اعتراف شیرانی نے 'پنجاب میں اردو' میں ''عرضِ حال'' کے تحت کیا ہے۔ اس کے علاوہ گریہم بیلی نے بھی اس نقطۂ نظر کی تائید اپنی تصنیف 'اے ہسٹری آف دی اردو لٹریچر' (1932ء) میں کی ہے اور جارج گریرسن نے بھی اردو کے ''پنجابی پن'' پر زور دیا ہے۔

کیفی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ جس وقت اردو پیدا ہوئی، سنسکرت بول چال کی

زبان نہیں تھی لہٰذا اُردو کا براہ راست سنسکرت سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو کے تاریخی مطالعے کے لیے وہ پراکرت اور اپ بھرنش کے بارے میں واقفیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں دہلی اور متھرا کے ارد گرد اور ملک کے شمال مغربی حصوں میں جو پراکرت مروّج تھی وہ شورسینی پراکرت تھی۔ جب اس نے ادبی شکل اختیار کر لی تو عوام سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا اور مقامی اختلافات کی بنیاد پر شورسینی پراکرت سے بہت سی زبانیں اور بولیاں پیدا ہو گئیں، جیسے کھڑی بولی، بانگڑو (ہریانی)، برج بھاشا، پنجابی، لہندا وغیرہ۔ ان بولیوں کو وہ اپ بھرنش کہتے ہیں اور اردو کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

اپنے ایک مضمون ''اردو لسانیات'' میں انھوں نے اردو کا ارتقا ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''بہر حال کامل تحقیق اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے قریب شورسینی اپ بھرنش سے مغربی ہندی نکلی جس کے میل سے دوآبۂ گنجینہ (گنگا اور جمنا) میں ایک نئی زبان پیدا ہوئی، اسے مستشرق اور لسان ہندوستانی کہتے ہیں۔ پھر اس کی دو شاخیں ہندی اور اردو بنیں۔''

مغربی ہندی کا یہ تصور سب سے پہلے جارج گریرسن نے پیش کیا تھا۔ اس نے ہندوستانی زبانوں کی گروہ بندی بیرونی، وسطی، اندرونی اور پہاڑی گروہوں میں کی ہے۔ اندرونی گروہ کی زبانوں میں اس زبان کو جس کا علاقہ ''مدھیہ دیشہ'' کہلاتا ہے اور جو مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک پھیلا ہوا ہے گریرسن نے ''مغربی ہندی'' کا نام دیا ہے۔ مغربی ہندی 1000ء کے لگ بھگ اپ بھرنش سے پیدا ہوئی اور پانچ بولیوں پر مشتمل ہے: کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی۔ کھڑی بولی کو گریرسن ''ہندوستانی'' کا نام دیتا ہے اور ادبی ہندوستان کو 'اردو' کہتا ہے۔

کیفی اردو کی پیدائش کو شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں میں عربی فارسی الفاظ کے امتزاج اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاط اور میل جول کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ کیفی کے مطابق ان دونوں قوموں کے درمیان باہمی اختلاط پنجاب سے باہر غزنی میں شروع ہوا، چنانچہ عربی فارسی الفاظ بھی سب سے پہلے پنجاب میں بولی جانے والی زبان میں داخل ہونا

شروع ہوئے اور کیفی کے نزدیک یہی قومی اختلاط اور لسانی امتزاج اردو کی پیدائش کا باعث ہوا۔ اپنے لکچروں اور تحریروں میں انھوں نے اس امر کی بار بار صراحت کی ہے۔ یہاں ان کی تصنیف 'ہماری زبان' (1936ء) سے چند اقتباسات نقل کرنا بے جا نہ ہوگا:

- ''اسلامی تسلط کے قریب بلکہ اس سے پہلے ہندو فارسی سے واقفیت رکھتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ہندو ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں سے مل کر اردو کی تدوین کی۔''
- ''ہماری اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔''
- ''جو فارسی اور عربی لفظ نئی زبان میں آسمائے وہ کام ہے زیادہ تر ان بزرگوں کا جو اُدھر عربی اور فارسی جانتے تھے اور ادھر پراکرت اور اپ بھرنش سے واقف تھے۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔''
- ''اردو کیا ہے؟ دو مختلف معاشرتوں، دو مختلف مذہبوں، دو مختلف کلچروں کے شیر و شکر ہونے اور ارتباط کی یادگار۔ وہ عرب کے مذہب اور ایران کے کلچر کا دنیا کے سب سے قدیم کلچر یعنی آرین تہذیب سے تصادم نہیں، اختلاط ہے اور یہ سب کچھ اپنے آپ ہوا۔ جس وقت ہندوؤں نے فارسی پڑھنا اور اردو کی نیو رکھنا شروع کیا تھا اس وقت اسلامی حکومت نے میکالے کے تاریخی مِنٹ کا سا کوئی فرمان جاری نہیں کیا تھا بلکہ جو کچھ ہوا بالطبع ہوا۔''

مولوی عبدالحق کو بھی اس نظریے سے اتفاق ہے۔ وہ بھی اُردو کو دونوں قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلاط و اتحاد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں مولوی عبدالحق کے ایک خطبے کا اقتباس نقل کرنا بیجا نہ ہوگا جو 'خطباتِ عبدالحق'، حصۂ دوم میں شامل ہے:

> ''ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ بدیسی زبان ہے یا مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ سراسر غلط اور لغو ہے اور جان بوجھ کر آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔ مسلمان اسے کہاں سے لائے تھے یہ خاص ہندوستان کی پیداوار ہے اور دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمانوں کے لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے،

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو ہیں۔''

کیفی نے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی، کیونکہ جیسا کہ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' کیفی اس نظریے کی تردید میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ مسلمانوں کا دخل و عمل ملک پنجاب اور اٹک پار سے داخلے کے بہت پہلے سندھ میں ہوا لیکن سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان نہیں پیدا ہوئی۔'' ('کیفیہ'، ص9)۔

سندھ اور پنجاب کے بعد تیسری بار مسلمانوں نے دہلی کا رخ کیا۔ فتحِ دہلی (1193ء) اور اس کے بعد جو مسلمان ہندوستان آئے وہ یہیں رہ پڑے جس سے دو قوموں کے درمیان یگانگت، یک جہتی، نیز آپسی میل جول اور لین دین کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ شہر دہلی اور اس کے نواح میں پروان چڑھنے والی بعض بولیوں کا سہارا پا کر زبان کی ایک نئی شکل معرضِ وجود میں آئی جو بعد میں 'اردو' کہلائی۔ یہی اردو دہلی سے نکل کر دور دراز کے علاقوں میں پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ کیفی کا خیال ہے کہ اردو اگرچہ پنجاب میں پیدا ہوئی لیکن اس کی ''تدوین اور تنظیم دہلی میں ہوئی اور وہیں اس کو ادبی حیثیت ملی۔''

شمالی ہند میں اردو کے ادبی ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے کیفی، امیر خسروؔ کو اردو کا پہلا شاعر اور شاہ جہاں کے عہد کے ایک ہندو شاعر پنڈت چندر بھان برہمن کی مندرجہ ذیل غزل کو اردو کی اولین غزل قرار دیتے ہیں:

خدا جانے ہمن کوں کس شہر میں لا کے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے، نہ سمرن ہے، نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں

نہ دونا ہے، نہ مروا ہے، نہ سوسن ہے، نہ لالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے، نہ جمنا ہے، نہ ندی ہے، نہ نالا ہے

محض ایک غزل کی بنیاد پر جس کا ماخذ بھی انھوں نے نہیں بتایا، کیفی برہمن کو ولی پر فوقیت دیتے ہیں، اور برہمن سے قبل دکنی شعرا کی غزلوں کو وہ یکسر نظرانداز کر جاتے ہیں۔

دکن میں اردو کے ارتقا کے بارے میں بعض عالموں نے بڑے بے بنیاد نظریات پیش کیے ہیں لیکن کیفی کی رائے اس سلسلے میں وہی ہے جو اکثریت کی رائے ہے۔ کیفی اس بات پر متفق ہیں کہ اردو شمالی ہند سے دکن پہنچتی ہے۔ پہلے پہل علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ، پھر محمد بن تغلق کی تبدیلیِ آبادی کی وجہ سے۔ کیفی اس خیال کی صراحت ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''یہ قضیہ استدلال اور مزید شہادت سے مستغنی ہے کہ جسے 'دکنی اردو' کہا جاتا ہے اور جس میں نصرتی، وجہی اور نشاطی وغیرہ کا کلام تصنیف ہوا وہ زبان دکن والوں کی پیدا کی ہوئی نہیں، بلکہ دہلی کے لوگوں کی زبان ہے۔ مقامی حیثیت اور مرکز سے دور افتادگی کی وجہ سے جو خصوصیتیں پیدا ہونی لابد تھیں وہ ہوئیں، آس پڑوس کے کچھ الفاظ آملے اور بس۔'' ('کیفیہ'، ص 22)۔

کیفی نے دکن کے علاوہ گجرات میں بھی اردو کے ارتقا کا ذکر کیا ہے اور صوفیائے کرام کی اردو خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے، لیکن وہ 'معراج العاشقین' کو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف قرار دیتے ہیں، جب کہ حالیہ تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ 'معراج العاشقین' حضرت بندہ نواز کی تصنیف نہیں، بلکہ بہت بعد کے ایک صوفی بزرگ شاہ مخدوم حسینی کے رسالہ 'وحدت الوجود' کی تلخیص ہے۔

کیفی اردو کو ایک مستقل، مربوط اور باقاعدہ زبان قرار دیتے ہیں جو قدیم زمانے سے رائج ہے جس کی اپنی تاریخ ہے، جس کا وافر ذخیرۂ ادب ہے اور جو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ 'ہندوستانی' اس کا دوسرا نام ہے۔ اردو اور ہندوستانی کو وہ دو زبانیں تسلیم نہیں کرتے بلکہ

ایک ہی زبان کے دو نام قرار دیتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے کئی مغربی مصنفین کے حوالے بھی پیش کیے ہیں جنھوں نے ہندوستانی کا لفظ اردو کے مترادف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کیفی اردو کے ناموں کی تمام بحث کے بعد لکھتے ہیں:

> ''یہ قضیہ صاف ہوگیا کہ ناموں کی گڑبڑ سے استدلال فضول ہے۔ ہندوستانی، ریختہ اور اردو وغیرہ ایک ہی زبان کے نام ہیں۔''

لیکن ایک دوسری جگہ ''ہندوستانی'' کی اصطلاح کو وہ وسیع لسانی مفہوم میں بھی استعمال کرتے ہیں اور اردو اور ہندی کو اس کی شاخیں بتاتے ہیں۔ ہندوستانی کا یہ تصور انھوں نے جارج گریرسن سے لیا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ کیفی اردو کو دو قوموں کے میل جول اور دیسی اور بدیسی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی زمانے میں یہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث سمجھی جاتی تھی۔ بعد میں بھی ہندو اسے اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ ہندو مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے بھی اس زبان سے کام لیا گیا۔ بقولِ کیفی ہندو مذہب کی تمام مقدس کتابیں مثلاً 'مہابھارت'، 'راماین'، 'گیتا'، 'شِو پُران' اور 'گنیشی پُران' وغیرہ اردو میں تصنیف و ترجمہ کی گئیں۔ آریہ سماج کا تمام مذہبی لٹریچر بھی اسی زبان میں شائع ہوا، لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ اس زبان کو دیوناگری رسم خط میں لکھا جانے لگا اور 'ہندی' نام دیا گیا۔ چنانچہ کیفی لکھتے ہیں:

> ''...جسے آپ اردو کہتے ہیں، یہ زبان دیوناگری حروف میں لکھی گئی تو ہندی کہلانے لگی۔'' ('ہماری زبان'، ص 7)۔

اس خیال کا اظہار وہ ایک جگہ ذرا ترش لہجے میں کرتے ہیں:

> ''اگر کسی زبان کو ہندی رسم الخط کا جامہ پہنانے میں کامیابی ہوگئی تو یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ زمین پر پاؤں نہ رکھا جائے۔'' (ایضاً، ص 22)۔

کیفی نے بڑی تلاش و جستجو اور تحقیق کے بعد اردو کے تمام نام اپنی تصنیف 'کیفیہ' میں جمع کردیے ہیں، لیکن یہاں بھی ان کی معلومات تشنہ اور ان کی تحقیق ادھوری ہے۔ کیفی نے

اردو کے جو نام گنائے ہیں وہ یہ ہیں، ان ناموں کی ترتیب بھی انھیں کی ہے:

''دہلوی، زبانِ ہندوستان، ہندوی، ہندی، ریختی اور ہندوستانی وغیرہ۔''

بعد میں انھوں نے ریختہ اور دکنی کا بھی ذکر کیا ہے۔ کیفی نے اس بحث یا تحقیق سے قطعاً احتراز کیا ہے کہ کون سا نام سب سے پہلے اختیار کیا گیا لیکن اردو کے آغاز و ارتقا پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اردو کے سب سے قدیم دو نام ''ہندوی'' اور ''ہندی'' ہیں۔ باقی تمام نام بعد میں رکھے گئے یا پڑ گئے۔

اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کے ملفوظات اور کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان صوفیا کے ہاں ہندی اور ہندوی دونوں ناموں کا استعمال ملتا ہے۔ امیر خسروؔ نے بھی ہندی اور ہندوی دونوں کا استعمال کیا ہے۔ فارسی تذکروں میں بھی اردو کے لیے یہ دونوں نام استعمال ہوئے ہیں۔ اردو جب دکن پہنچی تو وہاں بھی ہندی اور ہندوی کہلائی۔ اس کے علاوہ اسے ''دکنی'' بھی کہا گیا، ملا وجہی نے اسے ''زبانِ ہندوستان'' کے نام سے بھی موسوم کیا ہے۔ بعد میں ہندوی کا لفظ متروک ہو جاتا ہے اور صرف ہندی کا استعمال باقی رہتا ہے۔ چنانچہ غالب اور سر سید تک لفظِ ہندی، اردو کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اقبال نے اپنی فارسی مثنوی ''اسرارِ خودی (1915ء) میں بھی اردو کے لیے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ''دہلوی'' یا ''زبانِ دہلی'' بھی اردو کا پرانا نام رہا ہے۔ پندرھویں صدی کے ایک بزرگ شیخ بہاء الدین باجن کے یہاں ''دہلوی'' کا استعمال ملتا ہے۔ اس سے پہلے امیر خسرو اردو کے لیے ''زبانِ دہلی'' استعمال کر چکے تھے۔

لفظ ''اردو'' یا ''اردوے معلیٰ'' کے استعمال کے بارے میں کیفی نے کوئی خیال نہیں پیش کیا لیکن اب تک کی تحقیق سے یہی پتا چلتا ہے کہ تنہا ''اردو'' لفظ زبان کے معنی میں سب سے پہلے مصحفی نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں استعمال کیا، لیکن مصحفی سے قبل سعد اللہ گلشن اور میر تقی میر ''اردوے معلیٰ شاہ جہاں آباد'' اور قائم چاند پوری ''اردوے معلیٰ'' کی ترکیب استعمال کر چکے تھے۔

کیفی کی ایک دلچسپ تحقیق یہ ہے کہ غالبؔ نے اپنے اردو اشعار میں صرف ''ریختہ''

کا لفظ استعمال کیا ہے اور فارسی کلام میں لفظِ ''اردو''، نیز اپنے خطوں میں وہ اردو کلام کو ہندی کلام کا نام دیتے ہیں۔ کیفی کا یہ بیان مکمل صحیح نہیں ہے، کیوں کہ غالبؔ نے خطوں میں اپنے اردو کلام کو ''اردو'' بھی کہا ہے۔ مثلاً میرزا علاء الدین خاں کو اپنے خط مورخہ 21 جون 1868ء میں لکھتے ہیں (بحوالہ 'مرقعِ غالب'، مرتبہ پرتھوی چند):

> ''اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ کر دیتا ہوں کہ فنِ اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو، چاہیے کہ میرے جاننے والے تم کو میری جگہ جانیں۔''

(4)

کیفی نے اردو کے آغاز و ارتقا کی تحقیق کے علاوہ بعض دوسرے مسائل کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے، مثلاً، انھوں نے اردو میں تذکیر و تانیث کے مسئلے پر اپنے ایک مضمون میں کافی تفصیل سے بحث کی ہے لیکن تذکیر و تانیث سے متعلق ان کی یہ تمام تر بحث سماجی، تہذیبی اور تاریخی تناظر میں کی گئی ہے۔ لسانیاتی مباحث اس میں بہت کم پیدا ہو سکے ہیں۔ انھوں نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے اور مضمون کے شروع ہی میں لکھ دیا ہے کہ ''قواعد کی کتابوں میں جو کچھ درج ہے وہ یہاں نہیں دہرایا جائے گا جس کا ذہن نشین ہونا فرض کر لیا گیا ہے۔'' کیفی نے تذکیر و تانیث پر بحث کرتے وقت مذکر و مونث اسما کی نہ تو کوئی طویل فہرست دی ہے اور نہ ایسے قاعدے پیش کیے ہیں جن کے ساتھ مستثنیات بھی شامل ہوں، بلکہ انھوں نے اس امر کی تحقیق کی ہے کہ اردو کے متقدمین کے سامنے اور اسی طرح دوسری زبان والوں کے سامنے تذکیر و تانیث سے متعلق آیا کوئی نظریہ یا نظریے تھے کہ انھوں نے فلاں لفظ کو مذکر اور فلاں لفظ کو مونث قرار دے دیا اور فلاں قاعدہ تذکیر و تانیث کا کیوں وضع کیا۔

کیفی کے خیال میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ صرف اردو ہی کے ساتھ نہیں بلکہ کسی نہ کسی حد تک دوسری زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیفی کہتے ہیں کہ اردو ایک ''غیر صرفی'' اور ''پیچ میل'' زبان ہے۔ لہٰذا جنس کے بارے میں اردو میں جو دقت پیش آتی ہے وہ ان کلمات سے متعلق ہے جو غیر ذی روح اشیاء کے نام ہیں اور عربی یا سنسکرت جیسی صرفی زبانوں سے آئے

ہیں۔ اردو میں ذی روح اشیاء کے ناموں کی تذکیر و تانیث کا مسئلہ اتنا الجھا ہوا نہیں ہے کیونکہ ان میں عموماً مذکر سے مونث بنانے کا رجحان پایا جاتا ہے لیکن اردو میں دو یا تین مذکر ایسے بھی ہیں جو مونث سے بنتے ہیں۔ مثلاً رنڈوا (رانڈ سے) اور بھینسا (بھینس سے) وغیرہ۔ رانڈ سے رنڈوا کیسے بنا اور بھینس سے بھینسا کب ہوا اس کی وہ پوری سماجی اور تہذیبی تاریخ بیان کرتے ہیں جس کا قواعدِ زبان سے کوئی علاقہ نہیں۔ ان کے خیال میں انسانی معاشرے میں کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ رانڈ کا لفظ پہلے بنا اس کے بعد مذکر کی عام شناخت الف آخرِ کلمہ لگا کر رنڈوا بنا لیا گیا۔ یہی حال بھینسا کا ہے۔ اردو میں پہلے سے مونث لفظ بھینس موجود تھا اس کے آخر میں الف کا اضافہ کیا گیا جس سے بھینسا بنا۔ اردو میں لفظ بھینس پہلے سے کیوں کر موجود تھا اور بھینس کی تشکیل کس طرح ہوئی، کیفی نے اس کا جو استدلال پیش کیا ہے وہ بے حد دلچسپ اور مضحکہ خیز بھی ہے جسے یہاں نقل کرنا بے جا نہ ہوگا:

> ''اب بھینس کو لیجیے۔ گھر میں دودھ کی ضرورت ہوئی۔ ایک جانور لایا گیا جس کو دیکھا تھا کہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ اس کا دودھ نکالا گیا اور مزے سے استعمال ہونے لگا۔ اس دودھیل جانور کی آواز 'بھیں بھیں' کے سوا کچھ نہ تھی لہٰذا اسے بھینس کہنے لگے۔ بھینس دودھ دیتی گئی۔ رفتہ رفتہ دودھ کم ہوتا گیا اور بچہ بڑا ہوتا گیا۔ وہ بچہ نر تھا۔ معلوم ہوا اس کے دودھ سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیے۔ خیر چوں کہ مذکر کی عام شناخت الف آخرِ کلمہ تھا، اس لیے اسے بھینسا کہنے لگے۔'' ('منشورات'، ص 68)۔

لفظِ بھینس جیسا کہ کیفی نے لکھا ہے کہ بھیں بھیں کرنے سے بنا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کا ماخذ سنسکرت لفظ مہشی ہے اور یہ سنسکرت کے لفظ مہش سے بنا ہے جس کے معنی ہیں، بھینسا۔ لہٰذا کیفی کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ لفظ بھینسا (مذکر) پہلے سے موجود لفظ بھینس (مونث) سے بنا ہے۔ اردو کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ اس کے کسی بھی لفظ کا آخری حرف متحرک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کے آخرِ لفظ متحرک حرف کی حرکت اردو میں طویل مصوتے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سنسکرت لفظ مہش کا آخری حرف ش

متحرک بالفتح ہے۔ زبر کی یہ حرکت جو صوتیاتی اعتبار سے ایک مختصر مصوتہ ہے، اردو میں طویل مصوتے الف [ا] میں تبدیل ہو جاتی ہے اور لفظ مَہش صوتی تبدیلی کے بعد مہشا اور پھر بھینسا بن جاتا ہے۔ یہ بھی نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سنسکرت کے بعض الفاظ کی تانیث لفظ کے آخر میں قواعدی علامت ''ی'' لگا کر بنائی جاتی ہے۔ مثلاً پتر (بیٹا)، پُتری (بیٹی)۔ سنسکرت قواعد کی اسی رو سے لفظ مَہش سے اسم مونث مَہشی بنا۔ حیرت ہے کہ سنسکرت سے کما حقہ واقفیت کے باوجود کیفی کا ذہن ان لسانی باریکیوں کی طرف نہیں گیا۔

کیفی نے لفظ رانڈ اور رنڈوا کی کہانی بھی اسی قسم کے سماجی اور تہذیبی سیاق وسباق میں رکھ کر بیان کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لسانیات یا قواعدِ زبان میں اس قسم کے استدلال سے کام نہیں لیا جا سکتا اور اسما کی تذکیر و تانیث کے تعین کے لیے سماجی توجیہات بروئے کار نہیں لائی جا سکتیں بلکہ اس میں الفاظ کی ساخت اور توضیحی تجزیے سے بحث کی جاتی ہے، نیز روایت اور چلن کو دیکھا جاتا ہے۔ صرف اردو ہی کیا بلکہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اسما کو بہ لحاظ تشکیلِ جنس دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(1)　قواعدی جنس　(Grammatical Gender)

(2)　فطری جنس　(Natural Gender)

قواعدی جنس وہ جنس ہے جس میں اسما کی تذکیر و تانیث کے تعین کے لیے کوئی نہ کوئی لسانیاتی ہیئت مقرر کی جاتی ہے اور مذکر و مونث کی شناخت اسی لسانی ہیئت کے ذریعے سے کی جاتی ہے، مثلاً شاعر/ شاعرہ، لڑکا/ لڑکی، دھوبی/ دھوبن۔ ان الفاظ کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں علی الترتیب ہ، ی اور ن کو علاماتِ تانیث کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جنھیں لسانیاتی ہیئتیں (Linguistic forms) کہتے ہیں اور جو پابند روپ (Bound forms) کا درجہ رکھتی ہیں۔ فطری جنس میں یہ بات نہیں۔ اس میں الفاظ خواہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، تذکیر و تانیث کے اظہار کے لیے کسی لسانیاتی ہیئت کا استعمال نہیں کیا جاتا، مثلاً مرد/ عورت، ماں/ باپ، بھائی/ بہن، دال/ چاول، رات/ دن وغیرہ۔ اردو ذی روح اشیاء کی فطری جنس میں کوئی گڑبڑ نہیں پائی جاتی۔ مثلاً عورت، ماں، بہن وغیرہ الفاظ

مونث ہی کہے جائیں گے اگر چہ ان میں علاماتِ تانیث کے طور پر کسی لسانیاتی ہیئت کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، لیکن چوں کہ یہ اسما جن ذی روح اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں وہ بہ اعتبارِ جنس مونث ہیں لہٰذا یہ الفاظ بھی مونث ہوئے لیکن غیر ذی روح اشیاء کے لیے استعمال ہونے والے اسما تذکیر و تانیث کے معاملے میں روایت اور چلن کے پابند ہوتے ہیں اور یہ معاملہ بالکل خود اختیاری (Arbitrary) ہوتا ہے اس میں کسی قسم کی Logic یا توجیہہ و استدلال اور منطق کو دخل نہیں ہوتا اور اِس ضمن میں اہلِ زبان (Native speakers) کی پیروی کی جاتی ہے، مثلاً اردو میں چاند، سورج، دن، بادل، پانی وغیرہ مذکر اور رات، صبح، دال، روٹی وغیرہ مونث بولے جاتے ہیں۔ اس کی کوئی لسانیاتی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ ان الفاظ کو اردو میں مذکر یا مونث بولنے کی روایت چلی آرہی ہے اس لیے ہر اہلِ زبان کو اس روایت کا پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اس ضمن میں کیفی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غیر ذی روح اشیاء کے لیے استعمال ہونے والے اسماء کی تذکیر و تانیث کے تعین کے مسئلے کو محض روایت اور چلن پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کا ایک اصول پیش کیا، وہ اصول یہ ہے:

> ''ایک لفظ جو کسی زبان سے خواہ سنسکرت یا عربی سے ہماری زبان میں داخل ہوا اس کی جنس اس کے مترادف یا قریب المعنی لفظ کی جنس کے موافق ہوگی جو پہلے سے ہمیں معلوم ہے۔'' (ایضاً، ص 96)۔

کیفی نے اس قسم کی کئی مثالیں پیش کی ہیں جن میں عربی اور سنسکرت سے مستعار لفظ کی جنس اس کے مترادف یا قریب المعنی لفظ کی جنس کے موافق ہوتی ہے جو اردو میں پہلے سے رائج ہے۔ مثلاً شمس اگر چہ عربی میں مونث ہے لیکن اردو میں یہ مذکر بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں شمس کا مترادف لفظ سورج ہے جو پہلے سے موجود ہے، مذکر ہے اس لیے معنی میں مطابقت ہونے کی وجہ سے شمس کو بھی مذکر بولا جاتا ہے۔ اس طرح لفظ آتما سنسکرت میں مذکر ہے لیکن چوں کہ یہ روح کا مترادف ہے اور روح کو اردو میں مونث بولتے ہیں اس لیے آتما بھی مونث بولا جانے لگا۔ لیکن کیفی نے یہ نہیں بتایا کہ اردو میں سورج کو مذکر اور روح کو

مونث کیوں بولتے ہیں۔ یہاں پھر روایت اور چلن کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کیفی کے اس اصول کا اطلاق صرف ان الفاظ پر ہوتا ہے جو عربی اور سنسکرت سے مستعار لیے گئے ہیں۔ لیکن اردو میں ایک کثیر تعداد ایسے الفاظ کی ہے جو اردو کے اپنے الفاظ ہیں اور مقامی مآخذ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ایک دوسرا اصول یہ بتایا ہے کہ:

''جو لفظ اردو میں بالاتفاق مذکر یا مونث ہیں انھیں بالکل نہ چھیڑا جائے۔''

کیفی کے پیشِ نظر مختلف فیہ الفاظ بھی تھے جنھیں کچھ لوگ مذکر اور کچھ مونث بولتے ہیں۔ ایسے مختلف فیہ اور نو وارد الفاظ کے لیے کیفی نے یہ اصول بنایا کہ ''اسموں میں جمال کے اوصاف پائے جائیں یا جن کے معنی میں آسودگی کا عنصر ہو انھیں مونث قرار دیا جائے (اور) جن اسموں کے معنی رعب، دہشت اور تشدد پر دلالت کریں انھیں مذکر جنس دی جائے۔''

قلم کے بارے میں کیفی لکھتے ہیں کہ جلال لکھنوی نے اسے مختلف فیہ بتایا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی اسے مختلف فیہ بتایا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، کیوں کہ غالب نے اپنے ایک خط میں اسے مونث لکھا ہے۔ ذوق نے بھی اپنے ایک شعر میں اسے مونث باندھا ہے، اور جگہ یہ مذکر استعمال ہوا ہے لیکن کیفی اس لفظ کو مونث مانتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جب پودے کی قلم لگانے میں یا کنپٹی پر بالوں کی قلم تراشنے میں قلم کا استعمال بہ طورِ مونث کیا جاتا ہے اور لکھنے کی آلے کی صورت میں اسے کبھی مونث اور کبھی مذکر استعمال کیا جاتا ہے تو کیوں نہ اسے مختلف فیہ کے بجائے مونث ہی مان لیا جائے۔ کیفی لکھتے ہیں کہ یہ استدلال اگر قابلِ قبول نہ ہو تو اسے معقولیت پر رکھ کر دیکھا جائے۔ کیفی کے خیال میں پنسل جو لکھنے کا ایک دوسرا آلہ ہے بالاتفاق مونث ہے تو قلم کو بھی کیوں نہ بالاتفاق مونث مان لیا جائے۔ معقولیت کے نام پر کیفی ایک نہایت بھونڈی بات کہہ گئے ہیں کہ:

''قلم کو کسی طرح الٹ پلٹ کر دیکھیے غلبہ اور شدید غلبہ اس کی تانیث کے حق میں ہے۔''

مختلف فیہ اسماء کی جنسیت کے تعین میں کیفی کے اس قسم کے ''استدلال'' یا ''معقولیت'' کو ایجادِ بندہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ قواعد و لسانیات سے اس کا دور کا بھی سروکار نہیں۔ کیفی نے

تذکیروتانیث کے ان تمام مباحث کو اپنی تصنیف منشورات (1936ء) میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کیفی کی لسانی دلچسپی کا ایک اہم پہلو مطالعۂ متروکات بھی ہے۔ کیفی نے اردو متروکات کا مطالعہ بھی وسعتِ نظر اور معقولیت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے لیے انھیں ولی اور شاہ حاتم سے لے کر بیسویں صدی کے ربعِ اوّل تک کے تمام مستند شعرا کے کلام اور دواوین کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ قدیم تذکروں، لغات اور اصلاحِ زبان سے متعلق رسالوں اور کتابچوں پر بھی ان کی گہری نظر رہی ہے۔ کیفی متروکات کو زبان کی تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کا عمل تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا کی تمام نئی زبانوں میں اخذ اور ترک کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، تاہم کیفی نے اکثر فصحاء اور مصلحین کے متروکاتِ بیجا کی سخت نکتہ چینی کی ہے اور ٹھیٹھ اور مانوس ہندی الاصل الفاظ کی جگہ غیر مانوس عربی فارسی الفاظ کے استعمال کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اردو کے متقدمین اور متوسطین شعرا نے متروکات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، کیفی کے خیال میں اس کے کچھ خاص مقاصد رہے ہوں گے۔ پہلا مقصد تو ان کے نزدیک یہ رہا ہوگا کہ ''اردو زبان کا ذاتی تشخص اور اپنی جگہ اس کی ایک مستقل ہستی قائم کی جائے۔'' پھر اس میں ''لطافت، ترنم اور سلاست'' پیدا کی جائے۔

اردو میں متروکات کا سلسلہ شاہ حاتم سے شروع ہوتا ہے جو بہ قول کیفی وؔلی کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے بہت سے ہندی اور دکنی الفاظ جو ولی کے کلام کی زینت تھے، ان کی جگہ فارسی اور عربی کے الفاظ داخل کیے۔ اس سے زبان کی اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا جو بعد کے دور تک لکھنؤ میں جاری رہا۔ شاہ حاتم کے علاوہ میر، سودا، انشا، مصحفی، مومن و غالب اور آتش و ناسخ کے اپنے متروکات ہیں۔ مثلاً غالب کا اردو دیوان جب تیسری بار چھپا تو انھوں نے اس کے خاتمے کی عبارت میں لکھا:

> ''ایک لفظ جو بار بار چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا۔ ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا، یعنی 'کسو'۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں البتہ فصیح نہیں۔ قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح 'کسی' ہے۔''

(بحوالہ 'منشورات، ص 103)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ متروکات کے سلسلے میں غالب کا کیا رویہ تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعد میں آنے والے ہر شاعر نے اپنے ماقبل کے شاعروں کے اکثر مستعملہ الفاظ ترک کردیے۔ ولی و شاہ حاتم کے بہت سے الفاظ میر و سودا نے ترک کیے۔ میر و سودا کے بہت سے الفاظ مومن و غالب اور آتش و ناسخ نے ترک کیے۔ اسی طرح استاد شاعروں کے بہت سے الفاظ ان کے تلامذہ نے ترک کردیے۔

متروکات کی بحث کے سلسلے میں ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ تاہم 'آبِ حیات' (مولانا محمد حسین آزاد)، 'اصلاح مع ایضاح' (شوق نیموی)، 'تسہیل البلاغت' (محمد سجاد مرزا بیگ)، 'قرار المحاورات و قرار المتروکات' (سید نقی حسین)، 'اصلاحِ زبانِ اردو' (عشرت لکھنوی) اور 'نور اللغات' (نور الحسن نیر کاکوروی) وغیرہ میں بھی متروکات کی لسانی بحثیں پائی جاتی ہیں جن میں متروکات کی فہرستیں بھی دی ہوئی ہیں۔ 2,970 الفاظ کی سب سے بڑی فہرست 'نور اللغات' میں ملتی ہے۔ اس میں متروکات کے اصولوں سے بھی بحث کی گئی ہے لیکن بہ قولِ کیفی ''ان میں صرف ہدایتیں ہیں وجہ اور علت کا ذکر کہیں بھی نہیں آیا کہ فلاں لفظ کیوں متروک سمجھا جائے؟''

کیفی نے متروکات پر کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے اور بعض ایسے نکات بیان کیے ہیں جن پر اس سے پہلے کبھی غور نہیں کیا گیا۔ کیفی نے سب سے پہلا یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ ایک لفظ جو مدت سے اردو میں مستعمل تھا اب اگر اسے ترک کیا جاتا ہے تو کس بنا پر۔ اس کے خلاف کون سی ایسی نئی بات پیدا ہوگئی اور اس معنی اور موقع کا کون سا نیا اور بہتر لفظ مل گیا جو اسے متروک الاستعمال قرار دے دیا گیا، نیز یہ کہ داغ اور امیر، غالب اور مومن یا شاہ نصیر اور ناسخ نے چند اردو الفاظ کو متروک قرار دے دیا تو کیا وہ دوبارہ اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیفی نے اس امر کی بھی تحقیق کی ہے کہ جو الفاظ متروک قرار دیے گئے آیا وہ اردو زبان سے نکال دیے گئے یا صرف شاعری میں ان کا استعمال متروک قرار دیا گیا۔

کیفی کا خیال ہے کہ اب تک جو الفاظ اردو میں متروک قرار دیے گئے ان کی نسبت یہ

نہیں کہا گیا کہ یہ کس وجہ سے یا کس اصول کے تحت متروک قرار دیے گئے، بلکہ ''بدعنوانی'' اور ''بدعت'' کے طور چھانٹ کر ٹھیٹھ اردو الفاظ جو زبان میں مدتوں سے رچے بسے تھے'' کان پکڑ کر'' باہر کر دیے گئے اور ان کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ داخل کیے گئے۔ کیفی کے خیال میں وہ الفاظ اور ترکیبیں جنھیں ترک کر دیا گیا ہے ان سب پر نظر ثانی اور ترمیم کی ضرورت ہے۔ اساتذہ اور مشاہیر شعرا کے تازہ ترین کلام کے مطالعے سے انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ الفاظ جو پہلے متروک قرار دیے گئے تھے اب پھر زبان میں داخل ہو رہے ہیں۔ داغ اور امیر کو ایک حد مقرر کرتے ہوئے انھوں نے ایسے بہت سے الفاظ سے بحث کی ہے جو ان شعراء کے ہاں یا ان کے عہد میں متروک قرار دیے گئے لیکن خود انھیں شعرا کے آخری مطبوعہ دیوان میں اور ان کی وفات کے بعد مشاہیر شعرا کے ہاں برابر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ کیفی نے اس قسم کے متروکات کی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے صرف چند متروکات کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

(1) پہ بمعنی پر: عشرت لکھنوی 'اصلاحِ زبانِ اردو' میں لکھتے ہیں کہ پہ کا استعمال اب اکثر فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ اس کے بدلے پر بولتے ہیں۔ آخر میں داغ اور جلال نے بھی اسے ترک کر دیا، لیکن کیفی نے داغ اور امیر کے ایسے اشعار پیش کیے ہیں جن میں پہ کا استعمال ملتا ہے۔ ان کے علاوہ کیفی نے شاد عظیم آبادی، نظم طباطبائی، جلیل مانک پوری، سائل دہلوی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، برق دہلوی، چکبست لکھنوی اور بہت سے دوسرے شعرا کے ہاں بھی پہ کے استعمال کی مثالیں پیش کی ہیں۔

(2) پر بمعنی مگر، لیکن: شوق نیموی لکھتے ہیں کہ پر بمعنی لیکن، بعض فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ عشرت لکھنوی لکھتے ہیں کہ آخر میں داغ اور جلال نے بھی ترک کر دیا تھا، لیکن کیفی نے امیر مینائی، صفی لکھنوی اور دیگر فصحا کے کلام سے ایسی کئی مثالیں پیش کی ہیں جن میں پر بمعنی لیکن استعمال ہوا ہے، مثلاً:

اس قدر ہے دراز ہجر کی رات		پر تڑپنے سے جی نہیں بھرتا

(امیر مینائی)

لب پر ایک موجِ تبسم ہاتھ میں ہلکی سی تیغ نیم بسمل سیکڑوں پر نیم جاں کوئی نہیں
(صفی لکھنوی)

کیفی لکھتے ہیں:

''اس لفظ میں نہ کوئی ثقالت ہے نہ ذم کا پہلو اور پھر اتنا مختصر۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے ترک کیا جائے۔

(3) شوق نیموی کے قول کے مطابق تلک کا استعمال اکثر خواص نے ترک کر دیا ہے۔ صاحب 'نور اللغات' کے بقول خاص خاص شعرا نے اسے ترک کر دیا ہے۔ کیفی نے متروکات کا جو عہد قائم کیا اس میں اس کے استعمال کی انھیں صرف تین نظیریں ملتی ہیں۔ آخری دور میں اقبال نے کب تلک کا استعمال ردیف کے طور پر کیا ہے:

ہم نشیں افسانۂ بیداریِ جمہور چھیڑ قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

کیفی لکھتے ہیں کہ:

''اگر یہ لفظ ترک کر دینے کے قابل ہے تو اس کی وجہ کیوں نہیں بتائی جاتی۔ مانا کہ 'تک'، اس کا مرادف اور اس سے مختصر لفظ موجود ہے۔ جب نظم میں قافیہ کی قید لازمی ہے تو تلک اور فلک کا ایسا بولتا ہوا قافیہ کیوں لغات سے خارج کیا جاتا ہے۔''

کیفی متروکات کے خلاف نہیں تھے لیکن وہ من مانے طور پر الفاظ کے اخراج کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ''اب تک کوئی اصول اور قاعدہ الفاظ اور ترکیبوں کے ترک کرنے کا اردو میں وضع نہیں کیا گیا۔'' کیفی نے پہلی بار متروکات کے چند اصول وضع کیے۔ ان کے نزدیک کسی لفظ یا مرکب کو متروک قرار دینے سے پہلے ذیل کے اصولوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

- جو لفظ کریہہ الصوت ہو یا ثقیل التلفظ ہو جب کہ اس کا مترادف موجود ہو۔
- جس میں بالذات دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر ذم کا پہلو نکلتا ہو۔
- ایسے الفاظ اور ترکیبیں جن کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے عربی یا فارسی لغات دیکھنے کی

ضرورت پڑے، یعنی اردو کو عربیرانی نہ بنایا جائے۔ (عرب اور ایران کی زبان سے ماخوذ)۔

- جو الفاظ سلاست، فصاحت اور ترنم کے منافی ہوں اور اردو کی شخصیت کے قیام میں حارج ہوں۔

متروکات کے سلسلے میں ان اصولوں کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کیفی کے دور میں تھی۔ گوپی چند نارنگ نے ''منشورات'' کے مقدمے میں یہ بجا فرمایا ہے کہ:

> ''کیفی کے زمانے میں متروکات کا مسئلہ بھی پیر تسمہ پا بنا ہوا تھا۔ کیفی نے اردو زبان کو اس کے جبر سے رہا کرانے کی جو کوشش کی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔''

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا شمار بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کی ممتاز ترین علمی و ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت میں صرف ہوا۔ وہ اردو کے 'سچے عاشق' اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ فارسی کے بھی منتہی تھے۔ انشاء کی 'دریائے لطافت' کا ترجمہ ان کا ایک یادگار علمی کارنامہ ہے۔ وہ شاعر، ناول نگار اور ڈرامہ نویس ہونے کے علاوہ لسانی محقق بھی تھے۔ زمانہ انھیں تا دیر یاد رکھے گا۔

کتابیات

1- پرتھوی چند (مرتب)، 'مرقعِ غالب' (دہلی: 1969ء)۔

2- پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، 'کیفیہ' (بمبئی: دانش کدہ پبلی کیشن، س ن)۔

3- پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، 'ہماری زبان' (علی گڑھ: شروانی پرنٹنگ پریس 1936)۔

4- پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ''اردو لسانیات''، مشمولہ 'منشورات'، مرتبہ گوپی چند نارنگ (دہلی: انجمن ترقی اردو، 1968ء)۔

5- گوپی چند نارنگ، ''مقدمہ'' 'منشورات' (دہلی: انجمن ترقی اردو، 1968ء)۔

6- مرزا خلیل احمد بیگ، 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی'، پہلا ایڈیشن (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 1989ء)۔

7- مسعود حسین خاں، ''مقدمہ''، 'کیفیہ' از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (دہلی: انجمن ترقی اردو [ہند]، 1975ء)۔

ترقیمہ (Colophon)

یہ مضمون راقم السطور کی کتاب 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی' سے (جو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی سے 1989ء میں شائع ہوئی) ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ میں نے بصد خلوص و احترام استاذی پروفیسر مسعود حسین خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ چند روز بعد ان کا مکتوب مرقومہ 28 اگست 1989ء مجھے موصول ہوا جس میں انھوں نے از راہِ کرم لکھا:

''مجی، کل اتوار کی فرصت میں آپ کا تازہ تحفہ 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی' پڑھ ڈالا۔ آپ نے یہ مونوگراف حسبِ معمول بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ لکھا ہے، بلکہ ایک طرح سے اسے ریسرچ مونوگراف بنادیا ہے — حوالہ جات اور کتابیات سے بھرپور... آپ نے کیفی مرحوم کی زندگی یا ادبی و علمی خدمات کا کوئی گوشہ تاریک نہیں چھوڑا ہے۔ خاص طور پر ان کی لسانی اور اردو زبان کے متعلق تحریرات کا بہت متوازن اور جامع جائزہ لیا ہے۔ بعض مقامات پر خود میرے علم میں اضافہ ہوا ہے... آپ کا طرزِ انشا بہت سے انشا پردازوں سے بہتر پایا۔ مجھے امید ہے آپ کے اس مونوگراف کی علمی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔ آپ کے زورِ قلم کے لیے دعا گو، آپ کا مسعود حسین خاں''۔ (بحوالہ 'مکاتیبِ مسعود'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ [دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2017ء]، ص 73)۔

●●●

قاضی عبدالغفار اور اردو تحریک

قاضی عبدالغفار نہ صرف ایک ادیب، انشا پرداز، سوانح نگار، صحافی اور خطوط و ڈائری نویس تھے، بلکہ اردو تحریک کے ایک فعال قلم کار اور اس کے علم بردار بھی تھے۔ وہ تقسیم ملک کے بعد سے تادمِ آخر اردو تحریک کی باگ ڈور سنبھالے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی عبدالحق پاکستان جا چکے تھے، انجمن ترقیِ اردو (ہند) کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اردو دنیا پر مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور اردو زبان کی راہ میں بے حد مشکلات تھیں۔ اردو کے مخالفین نے اس زبان کو مٹانے اور نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اسے 'غیر ملکی' کہنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا۔ اربابِ حکومت کا بھی رویّہ اردو کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا، بالخصوص اتر پردیش میں اردو زبان کے مسئلے کو بے حد الجھا دیا گیا تھا اور اس کی ترقی کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جارہی تھیں۔ یہاں کے سرکاری و غیر سرکاری حلقوں میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ ''اردو اس ریاست کی زبان نہ ہے اور نہ کبھی تھی۔'' ماتحت افسرانِ تعلیم کے متعصّبانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اردو زبان کے مسئلے نے اور بھی زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی اور اس معاملے میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی مسلمہ پالیسیوں کی اعلانیہ خلاف ورزی کی جارہی تھی۔ تعلیمی اداروں سے اردو کو یکسر کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔ عدالتوں، دفتروں اور کاروباری حلقوں سے بھی اردو کے اخراج کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔

قاضی عبدالغفار تقسیمِ ملک کے بعد انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے پہلے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ اس منصب کے تحت وہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے ترجمان پندرہ روزہ

'ہماری زبان' کے ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے جس کی ادارت کے فرائض وہ تادمِ آخر انجام دیتے رہے۔ انجمن سے ان کی جب تک وابستگی رہی وہ اردو کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے جدو جہد میں مصروف رہے۔ انھوں نے ہر محاذ پر اردو کی لڑائی لڑی اور اس کے آئینی و جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے ہر ممکن تدبیریں اور کوششیں کیں۔ انھوں نے فرقہ پرستوں سے لوہا بھی لیا اور متعصب سیاسی رہنماؤں اور ایوانِ حکومت کے تنگ نظر وزیروں سے آئینی جنگ بھی لڑی۔ ساتھ ہی انھوں نے اہل اردو کے دلوں کو بھی گرمایا اور ان میں حرکتِ عمل پیدا کی۔

تقسیم ملک کے بعد کے بدلے ہوئے حالات میں قاضی صاحب کے نزدیک زبان کی خدمت اور ترقی سے زیادہ اس کے وجود کا تحفظ ضروری تھا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کا رُخ بھی اسی سمت موڑ دیا، اور فرمایا کہ 'اردو کی ترقی کے بجائے اب اس کے تحفظ کا سوال انجمن کے سامنے ہے۔'' ایک اور موقع پر انھوں نے کہا کہ ''مرکزی انجمن ترقیِ اردو کو اس طرح کے حالات نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے خاموش علمی مشاغل سے قطع نظر کر کے اردو زبان کی حفاظت کے میدان میں قدم بڑھائے۔'' 23/دسمبر 1951ء کو علاقائی زبان کے لکھنؤ کنونشن میں اسی بات کا اعادہ کرتے ہوئے اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ ''انجمن کو حکومت کے طرزِ عمل نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اب اردو زبان کو حکومت اور بعض نام نہاد کانگریسی لیڈروں کے پیدا کیے ہوئے خطروں سے بچانے کے لیے جدو جہد کرے۔'' اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن کے پلیٹ فارم سے انھوں نے یہ جدو جہد اپنی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھی۔

(2)

قاضی عبدالغفار اردو کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی میراث اور قومی اتحاد کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اردو کا مسئلہ صرف زبان کا ہی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی اتحاد کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ اس مسئلے کو تن دہی کے ساتھ حل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اردو کی حمایت میں نہ تو فرقہ پرستی کے جذبات سے کام لیا اور نہ ہندی کی

مخالفت کی، اور نہ ہی انھوں نے اپنی پوری اردو تحریک کے دوران حکومت مخالف رویہ اپنایا۔ وہ ہندی کی سرکاری اور قومی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے اور اس کا سیکھنا قوم کے نوجوانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ 'ہماری زبان' کے یکم فروری 1951ء کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

''ہندی راج بھاشا ہے اور اس کا یہ مقام ہمیں تسلیم ہے، بلکہ ہم تمام اُن لوگوں سے جن کی مادری زبان اردو یا ہندوستانی ہے بار بار کہتے رہے ہیں کہ راج بھاشا کا سیکھنا ان کا فرض ہے۔''

لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ: ''ملک کی تمام زبانوں کو جنھیں ہمارے دستور نے تسلیم کیا ہے آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا حق حاصل ہے اور ہونا چاہیے۔ کسی زبان کو خواہ وہ راج بھاشا ہی کیوں نہ ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی ترقی کے لیے دوسری زبانوں کی ترقی کا راستہ روکے... ہر زبان کو ہمارے دستور نے اپنے طریقے پر ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا حق دیا ہے۔''

قاضی صاحب گاندھی جی کی ''مشترکہ زبان'' کی پالیسی سے مکمل اتفاق کرتے تھے۔ وہ ''ہندوستانی'' کو اردو ہی کا ایک روپ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ''اگر مہاتما جی کی تجویز کے مطابق دونوں رسم الخط جائز رکھے جاتے تو یہ فتنہ پیدا ہی نہ ہوسکتا تھا۔'' قاضی صاحب ہندی کو ایک ایسی زبان سمجھتے تھے جو از سر نو بنائی جارہی تھی اور جس کا نیا سانچا اور ڈھانچا تیار کیا جارہا تھا، تاہم وہ اس کے سرکاری زبان بنائے جانے پر دل شکن نہیں تھے۔ دل شکن تو وہ اس بات پر تھے کہ بعض نافہم اور تنگ نظر سیاسی رہنماؤں اور وزیروں نے سرکاری زبان کی ترقی کے لیے اردو کی بربادی کو ضروری سمجھ رکھا تھا۔ کبھی وہ اسے ''غیر ملکی زبان'' کہتے تھے تو کبھی اس کی حقیقت ہی سے انکار کرتے تھے اور کبھی یہ کہتے تھے کہ اردو اتر پردیش کی نہ علاقائی زبان ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ ان نامساعد حالات کے باوجود قاضی صاحب کو اردو کی بقا اور اس کی ترقی کا پورا یقین تھا۔ وہ دوسروں کو بھی اردو کے معاملے میں قنوطی ہونے سے روکتے تھے۔ 'ہماری زبان' کے یکم جنوری 1951ء کے اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

''پہلا سال گذرنے کے بعد اب گذشتہ تجربوں نے دوسرے سال کے لیے

ہمارے ارادوں اور حوصلوں میں اضافہ کیا ہے اور ہمارے اس گمان نے اس عقیدے کی قوت حاصل کر لی ہے کہ اردو زبان یعنی ہندوستان کی مشترکہ زبان مر نہیں سکتی، بلکہ وہ ترقی کرے گی اور اس کی راہیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے وہ شکست اور فرار کے غیر فطری اور نامعقول احساسات کو اپنے دلوں سے نکال دیں اور اس عقیدے کی پرورش کریں کہ ان کی زبان ملک کی مشترکہ زبان ہے، خالص ملکی زبان ہے، فرقوں اور مذہبوں کے اختلافات سے بالاتر ہے اور اس لیے زندہ رہے گی۔"

قاضی عبدالغفار اردو کے بارے میں اگرچہ رجائی انداز رکھتے تھے لیکن انھیں اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ اردو اپنے ہی گھر میں بے گھر ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دہلی اور اتر پردیش کی ریاست اردو زبان کا وطن ہے لیکن اردو زبان اس وقت اپنے وطن ہی میں بہت زیادہ بے وطن ہو رہی ہے۔"

قاضی عبدالغفار پنجاب کے لسانی مسئلے سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ اردو کے مسئلے کو پنجابی زبان کے مسئلے سے بالکل مختلف نوعیت کا مسئلہ تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک پنجابی زبان کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ تھا جس کی جڑیں ایک علاحدہ ریاست کے قیام تک پہنچتی تھیں۔ نیز پنجابی زبان کی تحریک میں ہندی کی مخالفت کا عنصر شامل تھا۔ جب کہ اردو تحریک ایک بالکل غیر سیاسی تحریک تھی اور ہندی سے اس کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ یکم اپریل 1951ء کے 'ہماری زبان' کے اداریے میں وہ انھیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"درحقیقت پنجاب اور اتر پردیش کے معاملوں میں ایک بڑا فرق ہے جس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ پنجاب کے اس قضیے کی بنیاد سیاسی ہے اس لیے کہ سکھ اور پنجابی اپنی ایک ریاست علاحدہ چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ زبان کے معاملے میں ہندی کے خلاف پنجابی زبان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اتر پردیش میں اردو کی حفاظت کا مسئلہ سیاسی نہیں ہے۔ یہاں تو صرف اتنا

ہی معاملہ ہے کہ اردو کو (جو اس صوبے کی عام زبان ہے اور تھی) اب اس علاقے کی زبان تسلیم نہیں کیا جاتا... پنجاب میں پنجابی زبان کے حامیوں نے ہندی والوں کے خلاف ایک زبردست محاذ بنالیا ہے، لیکن اتر پردیش میں اردو اور ہندی کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اردو والے نہ تو کوئی لسانی ریاست بنانا چاہتے ہیں نہ وہ ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور نہ انھیں ہندی پڑھنا اور اپنے بچوں کو پڑھانا ناگوار ہے، بلکہ وہ سرکاری زبان کی ترقی میں ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ ہیں۔ البتہ وہ اردو زبان کو جس میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ محفوظ ہے ایک علاقہ واری زبان کی حیثیت سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور اس کے جائز حقوق پر اصرار کرتے ہیں جو ملک کی باقی تیرہ زبانوں کو حاصل ہیں۔''

(3)

تقسیمِ ملک کے بعد جب انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی از سرِ نو شیرازہ بندی کی گئی اور قاضی عبدالغفار اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تو انھوں نے لسانی حالات کا بہ غور جائزہ لیا اور اردو زبان کی تعلیم کے اعتبار سے سب سے خراب حالت یوپی کی دیکھی۔ یہاں کے پچاس ہزار سے زیادہ اسکولوں میں سے بہت سے اسکولوں میں کسی نہ کسی بہانے اردو کی تعلیم کا انتظام ختم کردیا گیا تھا۔ جن بچوں کی مادری زبان اردو تھی وہ اور ان کے والدین اور سرپرست اس صورتِ حال سے سخت آزردہ اور پریشان تھے۔ مرکزی انجمن اور اس کی شاخوں کو آئے دن اس قسم کی شکایتیں موصول ہوتی رہتی تھیں اور انھیں دور کرنے کی تدابیر بھی کی جاتی تھیں لیکن ان سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ پانی سر سے اونچا ہوتا ہوا اس وقت نظر آیا جب یوپی میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کے سرکل مصاحب گنج کے ڈیڑھ سو سے زیادہ طلبہ جن کی مادری زبان اردو تھی اور جو اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے انھیں اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے یہ کہہ

کر داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ یہاں اردو کے ذریعے تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ان طلبا کے سرپرست میونسپل حکام سے ملے لیکن کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا۔ اس کے بعد وزیر تعلیم سے درخواست کی لیکن جواب موصول نہیں ہوا اس لیے قاضی عبدالغفار نے اس مسئلے کو ''اجتماعی محاذ'' پر حل کرنے کی جدوجہد کا اعلان کیا۔ یہ اُردو کی حمایت میں شروع کی جانے والی پہلی عوامی تحریک کا اعلان تھا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کے لیے مادری زبان میں بنیادی تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے قاضی عبدالغفار نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ لکھنؤ کی مدد سے ان والدین اور سرپرستوں کے جو اپنے بچوں کو اردو کے ذریعہ تعلیم دلانا چاہتے ہیں، دس ہزار دستخط ایک محضر نامے پر حاصل کرنے کی تحریک شروع کی۔ یہ دستخطی مہم اس لیے شروع کی گئی تھی کہ یو پی کے افسرانِ تعلیم حکومتِ ہند کی اس لسانی پالیسی کی خلاف ورزی کر رہے تھے جس کی رو سے اردو بولنے والے طلبہ کو مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا تھا۔

حکومتِ ہند کی قرارداد شائع کردہ محکمہ تعلیم نمبر ڈی 3791/48 مورخہ 10 اگست 1948ء میں بنیادی اسکولوں میں تعلیم کے متعلق سرکاری پالیسی ان الفاظ میں واضح کی گئی تھی:

> ''جونیر بنیادی مرحلے میں ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان مادری زبان ہوگا اور جہاں مادری زبان علاقائی یا سرکاری زبان سے مختلف ہو وہاں مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے اور کم از کم ایک ٹیچر رکھا جائے۔ اس صورت میں کہ اس زبان کے بولنے والے طلبہ کی تعداد تمام اسکولوں میں ۴۰ سے کم تر نہ ہو — یا کلاس میں کم از کم دس طلبہ ہوں۔ مادری زبان وہ ہوگی جس کا اعلان والدین یا سرپرست کی طرف سے کیا جائے گا۔''

اس قرارداد میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ حکومتِ ہند کی رائے یہی ہے کہ تمام صوبائی اور ریاستی حکومتیں مذکورہ بالا پالیسی پر کاربند ہوں۔

لیکن اس کے باوجود شری آر۔ ایس۔ سنہا نے جو جبری تعلیم کے اسپیشل آفیسر تھے

میونسپل بورڈوں کے چیرمینوں کو حسب ذیل تحریر بھیجی تھی:

''مجھے یہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے کہ حکومت کا حکم یہ ہے کہ تمام ابتدائی مدرسوں میں ہندی کو لازمی مضمون ہونا چاہیے۔ اردو کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اگر اردو کو پڑھانا چاہیں تو وہ ایک اختیاری مضمون ہو۔ لہٰذا تمام طلبہ پر بلالحاظِ ذات اور قوم لازم ہوگا کہ وہ ہندی پڑھیں۔ وہی نصاب کے دوسرے مضمونوں کو پڑھانے کا ذریعہ ہو۔''

یہ تحریر سراسر حکومتِ ہند کی ہدایات کی خلاف ورزی تھی۔ اس کے جاری ہوتے ہی اردو تمام میونسپل اسکولوں سے خارج ہوگئی۔ اُسی زمانے میں ان اسکولوں میں بھی جو ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ماتحت تھے، اردو کی تعلیم روک دی گئی اور باوجود بار بار یاددہانی کرانے کے ریاستی حکومت اس بے انصافی کو رفع نہ کرسکی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو تھی اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہوگئے۔ صرف یہی نہیں ہوا بلکہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت سے بچوں کی مادری زبان جو کل تک ان اسکولوں میں اردو لکھی ہوئی تھی بچوں کے سرپرستوں کے مشورے کے بغیر ہندی ہوگئی۔ مرکزی انجمن نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرکے اس کی چھان بین کرائی تو بات صحیح نکلی۔ اس لیے انجمن کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ دس ہزار دستخطوں سے وزیرِ تعلیم سے وفد کی شکل میں ملا جائے۔

دستخطی مہم کا کام بہت تیزی کے ساتھ شروع کیا گیا اور شہرِ لکھنؤ کے صرف ایک حصے سے دس ہزار دستخط حاصل کیے گئے لیکن یہ طے پایا کہ اگر ضروری ہوا تو صوبے سے لاکھوں والدین کے دستخط حاصل کیے جائیں گے جن کے بچے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جب دستخطی مہم کا کام مکمل ہوگیا تو 22 مئی 1951ء کو انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے اراکین پر مشتمل ایک وفد نے ڈاکٹر ذاکر حسین صدرِ انجمن کی قیادت میں عزت مآب ڈاکٹر سمپورنا نند، وزیرِ تعلیم، حکومتِ اتر پردیش سے ملاقات کی اور انجمن کی طرف سے ایک عرض داشت اُن کی خدمت میں پیش کی جس کے الفاظ یہ تھے:

''اس وفد کے اراکین جو انجمن ترقیِ اردو (ہند) اور یوپی میں اس کی

شاخوں کے نمائندے ہیں اس صوبے میں اردو بولنے والوں کی شکایات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ .... ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ:

(1) مادری زبان کی حیثیت میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق سرکاری پالیسی از سرِ نو واضح کی جائے۔ (2) واضح الفاظ میں یہ اعلان کردیا جائے کہ جہاں معقول مطالبہ ہو وہاں اسکول اردو کے ذریعے تعلیم دینے کا انتظام کریں گے۔ (3) متعلقہ اداروں اور شخصوں کے نام ہدایت جاری کردی جائے کہ طالب علم کی مادری زبان کا تعین اس کے والدین یا سرپرست کریں گے۔ کوئی افسر یا ہیڈ ماسٹر مطلق العنان طور پر نہ کرے۔
(4) طلبہ کو اردو نصاب کی کتابیں بہم پہنچتی رہیں۔"

وفد نے وزیرِ تعلیم کی خدمت میں دس ہزار والدین اور سرپرستوں کے دستخط بھی پیش کیے جن کے بچے اردو میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ وزیرِ تعلیم نے وعدہ کیا کہ وہ وفد کی شکایت پر توجہ فرمائیں گے لیکن ان شکایات کو رفع کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا گیا اور انجمن کی اس جدو جہد کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے 'ہماری زبان' کی یکم ستمبر 1951ء کی اشاعت میں یہ اعلان کیا کہ "اتر پردیش میں جہاں وہ سب سے زیادہ خطرے میں ہے اردو کی حفاظت کا یہ قدم، آخری قدم نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک بنیادی مسئلے کے متعلق اہم تر اقدامات کا راستہ صاف کرنا ہے اور مرکزی انجمن چاہتی ہے کہ اس کی تمام شاخیں اس کام کے لیے میدان تیار کریں۔" یہ دراصل اعلان تھا اس زبردست عوامی تحریک کا جس نے ایوانِ حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا یعنی صدرِ جمہوریۂ ہند کی خدمت میں پیش کیے جانے والے محضرنامے پر بیس لاکھ محبانِ اردو کے دستخط۔

(4)

سنہ 1951ء میں یوپی کی صوبائی اسمبلی میں زبان کے قانون پر مباحثہ ہوا جس میں وزیر تعلیم سمپورنانند نے کھل کر اردو کی مخالفت کی۔ انھوں نے فرمایا:

''اب یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہندی اس ریاست کے باشندوں کی زبان ہے۔''

مباحثہ کا جواب دیتے ہوئے اور اس مطالبے کو کہ اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کیا جائے، وزیر تعلیم نے فرمایا:

''یوپی کا کوئی علاقہ بھی ایسا نہیں جہاں اردو بولی جاتی ہو۔ اردو تو صرف ہندی کی ایک دوسری شکل ہے... اردو تو ہندوستان کے کسی حصے کی بھی علاقائی زبان نہیں ہے... اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

وزیر تعلیم کے ان بیانات سے اردو والوں میں تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ایک نئی نہج اور ایک نئی تنظیم کے ساتھ اردو تحریک کو چلانے کا عزم کیا۔

رشید احمد صدیقی نے جو انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے ایک رکن تھے بہار ریاستی اردو کانفرنس کے پٹنہ اجلاس میں 12 مئی 1951ء کو اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پہلی بار محبانِ اردو کی توجہ حکومتِ ہند کے دستور کی دفعہ 347 کی طرف مبذول کرائی کہ جن صوبوں میں اردو بولنے اور جاننے والوں کی تعداد کافی ہے وہاں اردو کو دفعہ 347 کے ماتحت صدرِ جمہوریہ کی ہدایت پر علاقہ داری زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

''اس مطالبے کے پیش ہونے کے بعد اگر صدر کو اطمینان ہو جائے کہ کسی ریاست کی آبادی کا کوئی معقول حصہ کسی زبان کے متعلق جسے وہ بولتا ہے یہ چاہتا ہے کہ اس کو ریاست تسلیم کرلے تو صدر کو اختیار ہوگا کہ وہ اس بات کی ہدایت کریں کہ تمام ریاست میں یا اس کے کسی حصے میں ایسی اغراض کے

لیے جن کی وہ صراحت کریں، یہ زبان سرکاری طور پر تسلیم کی جائے۔"

یہیں سے آئین کی دفعہ 347 کا سہارا لے کر جمہوری و دستوری طور پر اردو کے حق کو منوانے کی کوششوں کا آغاز ہوا جس نے ایک بہت بڑی عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

قاضی عبدالغفار نے اس مقصد کے لیے 23 دسمبر 1951ء کو لکھنؤ میں ایک علاقائی زبان کنونشن منعقد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر انجمن ترقی اردو (ہند) نے فرمائی۔ علاقائی زبان کی تحریک کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریر میں یہ واضح کر دیا تھا کہ "ہماری تحریک قطعاً غیر سیاسی اور محض دستوری اور آئینی ہے۔ یہ کوئی سیاسی شورش نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی دستوری مطالبہ ہے جو ایک محضر کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔" محبانِ اردو یہ مان کر چلے تھے کہ اتر پردیش کی سرکاری زبان ہندی ہے، لیکن اگر صدرِ جمہوریہ کو اس بات کا اطمینان دلا دیا جائے کہ یہاں کی آبادی کا کافی حصہ اردو بھی بولتا ہے اور اس کے موافق بھی ہے تو اردو بھی سرکاری طور پر یہاں کی زبان مان لی جائے گی۔ اردو والوں کے سامنے اب سوال صرف ثبوت بہم پہنچانے اور صدرِ جمہوریہ کے اطمینان کرنے کا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے کہا کہ "ہم نے بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم اردو کے حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے ایک دستوری محاذ قائم کریں۔ اس مطالبے کو ایک محضر کے ذریعے جس پر بیس لاکھ دستخط ہوں پیش کیا جائے گا۔" ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ "میں اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اردو کا مسئلہ ہندی اردو رقابت کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم سرکاری زبان کو دل سے قبول کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اردو بولنے والے بھی ہندی سے محبت کریں اور اس زبان میں قابلیت حاصل کرنا اپنے لیے قابلِ فخر سمجھیں۔ اس طرح یہ مسئلہ نہ تو سیاسی ہے اور نہ فرقہ پرستی کے ادنیٰ جذبے پر مبنی ہے۔"

اس کام کو کرنے کے لیے یعنی لاکھوں دستخط حاصل کرنے کے لیے تمام ضلعوں میں، پھر ان ضلعوں کے قصبوں اور دیہاتوں میں سینکڑوں مراکز قائم کیے گئے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ہزارہا کارکن رکھے گئے۔ نشر و اشاعت کا سلسلہ بھی تمام صوبے میں جاری رکھا گیا۔ لاکھوں کی تعداد میں فارم چھپوائے گئے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے سرمایے

کی فراہمی کا بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ چناں چہ مرکزی انجمن کے تحت ایک سینٹرل فنڈ قائم کیا گیا جس کے لیے صوبے کے اضلاع اور غیر صوبوں سے رقمیں حاصل کی گئیں۔ لکھنؤ کے 23 دسمبر 1951ء کے علاقائی زبان کنونشن میں شامل تمام صوبے کے نمائندوں سے قاضی صاحب نے اپیل کی کہ وہ تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پوری کوشش کریں۔ اس تحریک کی چند حلقوں کی جانب سے مخالفت بھی ہوئی جس کا قاضی صاحب نے منہ توڑ جواب دیا۔

تقریباً سوا سال کی لگاتار محنت کے بعد 20 لاکھ دستخط جمع کر لیے گئے۔ اس کے بعد دستخطی مہم روک دی گئی اور اب دستخط شدہ فارموں کی جانچ اور ترتیب کا کام شروع ہوا۔ 26 جولائی 1953ء کو لکھنؤ میں ورکرس کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر انجمن ترقیِ اردو (ہند) نے فرمائی، لیکن اس کے روحِ رواں قاضی صاحب تھے۔ اس کانفرنس میں ذیل کی قرارداد منظور ہوئی:

> ''یہ جلسہ دسمبر 1951ء کے کنونشن کی قرارداد کے مطابق انجمن ترقیِ اردو (ہند) کو مجاز کرتا ہے کہ وہ صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں ایک وفد لے جائے اور ایک عرض داشت کے ساتھ یہ دستخط پیش کر کے درخواست کرے کہ جمہوریہ ہند کے دستورِ اساسی کی دفعہ 347 کے مطابق اردو بولنے اور لکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد کے پیشِ نظر ہندی کے علاوہ اردو زبان اور رسم الخط کو بھی اس صوبے میں تمام عوامی ضروریات کے لیے سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔''

انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے وفد نے جس میں قاضی عبدالغفار بھی شامل تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی قیادت میں 15 فروری 1954ء کو 5 بجے شام صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجیندر پرشاد سے ملاقات کی اور بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ اپنی عرضداشت پیش کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے وفد کے لیڈر کی حیثیت سے تمہید کے طور پر انجمن کے مطالبات پیش کیے اور ان شکایات پر زور دیا جو عرض داشت میں درج تھیں۔ قاضی عبدالغفار اور دیگر اراکینِ وفد نے بھی مختلف امور کی توضیح کی۔ صدرِ جمہوریہ نے بہت توجہ اور ہمدردی کے ساتھ تمام گفتگو سن کر فرمایا کہ یہ مطالبات ایسے ہیں جنھیں اصولی طور پر حکومت

پہلے ہی تسلیم کر چکی ہے، لیکن ان پر عمل درآمد کا سوال یقیناً قابلِ توجہ ہے اور میں مرکزی حکومت نیز ریاستی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد طے کروں گا کہ جن اصولوں کا نفاذ نہیں ہو سکا ان کا نفاذ کس طرح کیا جائے۔ یہ ملاقات 50 منٹ تک جاری رہی اور جس فضا میں گفتگو ہوئی وہ ممبرانِ وفد کے خیال میں یقیناً امید افزا تھی، لیکن جیسا کہ محبانِ اردو جانتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوا، اور قاضی صاحب صدرِ جمہوریۂ ہند کے فیصلے کا انتظار کرتے کرتے 16 جنوری 1956ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

(5)

قاضی عبدالغفار کی اس اردو تحریک کا ایک مثبت اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ یہ ایک سیکولر تحریک تھی اور فرقہ واریت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کوئی سیاسی تحریک بھی نہیں تھی۔ یہ تحریک ہندی کے خلاف بھی نہ تھی۔ قاضی صاحب نے اپنی تقریروں میں جگہ جگہ یہ بات دہرائی ہے۔ انھوں نے اس تحریک کو فرقہ واریت اور سیاسی جھگڑوں سے پوری طرح محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بعض فرقہ پرستوں نے جب اس تحریک کو اردو ہندی تنازعے کا رنگ دینے کی کوشش کی تو قاضی صاحب نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں ہندی کی سرکاری حیثیت تسلیم تھی اور اس کی ترقی کے وہ دل سے خواہاں تھے۔ ان کی اردو تحریک کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اردو بولنے والوں کو ان کا جمہوری و دستوری حق مل جائے جس سے وہ محروم کر دیے گئے ہیں۔ اردو کے اس حق کو منوانے کے لیے انھوں نے وسیع پیمانے پر جو تحریک شروع کی تھی اور جس دستخطی مہم کا آغاز کیا تھا اسے ہندوؤں کی بھی زبردست تائید حاصل تھی۔ اس کے باوجود اس تحریک کی مخالفت ہندو مہا سبھا کے 'نیتاؤں' کی جانب سے بڑی شد و مد کے ساتھ ہوئی تھی۔ اخبارات میں آئے دن ان کے بیانات شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان نیتاؤں نے اپنی تحریر و تقریر میں اس تحریک کے خلاف زہر اگلنا اور جھوٹا پروپیگنڈا کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ وہ ہندوؤں کو تلقین کرتے تھے کہ وہ اردو کی حمایت میں دستخط نہ کریں، ''کیوں کہ یہ پاکستانی ذہنیت کے مسلمانوں کی، ہندی کو ختم کرنے کی ایک گہری

سازش ہے جس سے ہر ہندو کو ہوشیار رہنا چاہیے۔'' ہندو مہا سبھائی نیتا یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے کہ ''اردو کی حمایت کرنا ہندو دھرم اور ہندی بھاشا کی مخالفت کرنا اور اس کی جڑوں پر کلہاڑا چلانا ہے جس سے ہر ہندو کو بچنا چاہیے۔'' ہندو مہا سبھا کے نیتاؤں کے ان بیانات کا عام ہندوؤں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، کیوں کہ اردو تحریک اور دستخطی مہم کی تائید میں جو بیانات مختلف اضلاع سے قاضی عبدالغفار کے پاس آتے تھے ان پر 20 فی صد سے زیادہ ہندو بھائیوں کے دستخط ہوتے تھے۔ ہندو مہا سبھائی نیتاؤں کے علاوہ ہندی ساہتیہ سمیلن بھی اس تحریک کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ وہ اردو کی اس تحریک پر فرقہ پرستی کا لیبل لگا کر غیر مسلم اکثریت کو اس کے خلاف بھڑکانا چاہتا تھا۔

قاضی عبدالغفار نے جب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالا تو اس کے فوراً بعد ہی ہندوستان میں 1951ء کی مردم شماری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ قاضی صاحب کو یہ معلوم تھا کہ مردم شماری کا عملہ اردو کے اندراجات کے سلسلے میں کس طرح دھاندلی کرتا ہے اور اس کی کرشمہ سازیوں سے مردم شماری کے اعداد و شمار کس طرح زیروزبر ہو جاتے ہیں، چنانچہ انھوں نے اس اہم مسئلے کو بھی اپنی اردو تحریک کا جزو بنالیا۔ جیسے ہی مردم شماری کا آغاز ہوا اردو والوں کی جانب سے شکایتیں موصول ہونا شروع ہوگئیں کہ زبان کے غلط اندراجات ہو رہے ہیں۔ قاضی صاحب نے ایک تحریک کے طور پر اس بات کی کوشش کی کہ زبان کے اندراجات میں بدعنوانی نہ ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو بولنے والوں کو جرأت اور ہمت سے کام لینے اور دشواریوں پر قابو پانے کی ترغیب دی اور دوسری طرف متعلقہ حکام اور افسران سے بھی رابطہ پیدا کر کے ان شکایات کو دور کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور مردم شماری کا عملہ زبان کے اندراجات کے سلسلے میں اسی طرح بدعنوانی کا مرتکب ہوتا رہا۔ قاضی صاحب نے اس کے لیے ایک مؤثر تنظیم کی ضرورت پر زور دیا۔

قاضی صاحب کے خیال میں زبان کے خانے میں غلط اندراجات لسانی تعصب کی بنیاد پر کیے جا رہے تھے اور اردو بولنے والوں کی تعداد کو گھٹانے کی یہ ایک مذموم کوشش اور سازش تھی تاکہ وہ اپنے دستوری و جمہوری حقوق کا مطالبہ نہ کرسکیں۔ اس میں فرقہ پرست

ذہنیت رکھنے والے سیاسی لیڈروں کی بھی سازش شامل تھی، کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جب اردو کے اعداد وشمار کم ہوں گے تو وہ بآسانی یہ کہہ سکیں گے کہ یہاں کی عام زبان تو ہندی ہے اور اردو تو کوئی بھی نہیں بولتا، اور اس کی سند کے طور پر وہ مردم شماری کے اعداد وشمار پیش کردیں گے۔ ''ہماری زبان'' کے 15 مارچ 1951ء کے اداریے میں قاضی صاحب نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے:

> ''مردم شماری میں زبان کے غلط اندراجات کی شکایات ہماری رائے میں 90 فی صد صحیح ہیں اور ماتحت افسروں نے مردم شماری کو اردو زبان کی بیخ کنی کا ذریعہ بنالیا ہے۔ ان لوگوں کو جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اتر پردیش کی عام زبان ہندی ہے اردو نہیں ہے، اپنے اس دعوے پر جس سند کی ضرورت تھی وہ ان کو مردم شماری کے کارپردازوں کی مہربانی سے حاصل ہوجائے گی اور جس وقت مردم شماری کے اعداد شائع ہوں گے تو یہ حضرات ہم سے فرمائیں گے کہ اب دیکھ لیجیے کہ اردو کی حیثیت کیا ہے۔ اردو کے خلاف مردم شماری کے ذریعہ سے ان لوگوں نے بلاشبہ ایک داؤں جیتا ہے۔''

مردم شماری میں زبان کے غلط اندراجات کی شکایات آج بھی اتنی ہی عام ہیں جتنی کہ قاضی صاحب کے زمانے میں تھیں۔ اکثر یہ سننے میں آیا ہے کہ مردم شماری کا عملہ زبان کے بارے میں کچھ پوچھتا ہی نہیں، اور زبان کے خانے میں من مانے طور پر زبان کا اندراج کردیتا ہے جو ظاہر ہے اردو کی موافقت میں نہیں ہوتا ہے۔

الغرض اردو تحریک کے علمبردار اور محافظِ اردو کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار نے جو کارنامے انجام دیے ہیں انھیں ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ قاضی صاحب نے جس زمانے میں انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی باگ ڈور سنبھالی تھی وہ سیاسی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے بڑا نازک دور تھا۔ ملک تقسیم ہوچکا تھا، یہاں کے بچے کھچے مسلمانوں کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جارہا تھا۔ اردو کی حیثیت یک لخت بدل کر رہ گئی تھی۔ ہندو فرقہ پرست عناصر اسے نیست و نابود کرنے کے درپے تھے۔ اس کے علی الرغم ہندی جمہوریۂ ہند کی سرکاری زبان (جسے قومی

زبان بھی کہا جانے لگا تھا) کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔ قاضی صاحب نے سب سے پہلے ہندی کے بارے میں اپنا موقف واضح کیا۔ وہ بلا چون و چرا ہندی کو ملک کی قومی زبان تسلیم کرتے تھے جس کا ذکر انھوں نے مختلف موقعوں پر 'ہماری زبان' کے اداریوں میں کیا ہے۔ اردو والوں سے بھی وہ اسی بات کے خواہاں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو والوں کو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی بھی سیکھنی چاہیے۔ تحفظِ اردو کے سلسلے میں انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ 1951ء کی مردم شماری میں مادری زبان کے خانے میں اردو کے اندراج کے لیے انھوں نے باقاعدہ مہم شروع کی اور جب بھی اس سلسلے میں انھیں بدعنوانیوں کی شکایات موصول ہوتیں ان کے ازالے کے لیے وہ حکام سے رابطہ قائم کرتے۔ اسی طرح دستورِ ہند کے آرٹیکل 347 کے تحت اردو کو اتر پردیش کی علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لیے بڑے پیمانے پر دستخطی مہم کا آغاز کیا جس نے جلد ہی ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ڈاکٹر سمپورنانند کے دورِ اقتدار میں زبان کے مسئلے پر یو پی اسمبلی کی بحث سے پیدا شدہ مسائل کا قاضی صاحب نے بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا اور جن بچوں کی مادری زبان اردو تھی انھیں اپنی زبان میں تعلیم کا حق دلوانے کے لیے بھرپور سعی کی۔ فرقہ پرستوں کے اردو دشمن پروپیگنڈے کا بھی قاضی صاحب نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس طرح قاضی صاحب نے اپنی پوری زندگی اردو تحریک اور تحفظِ اردو کے لیے وقف کر دی تھی۔ اردو تحریک کے فعال قلم کار اور اس کے بیباک علم بردار کی حیثیت سے اردو زبان کی تاریخ میں ان کا نام تادیر زندہ رہے گا۔

کتابیات

1- امیر عارفی، 'قاضی عبدالغفار: شخصیت اور فن' (دہلی، 1996ء)۔

2- خاں، مسعود حسین، 'اردو کا المیہ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1973ء)۔

3- خلیق انجم (مدیر)، سہ ماہی 'اردو ادب' (قاضی عبدالغفار نمبر)، انجمن ترقیِ اردو (ہند)، نئی دہلی، شمارہ 3 اور 4، بابت 1995ء۔

4- سرور، آل احمد، 'اردو تحریک' (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1999ء)۔

5- عبدالغفار، قاضی، اداریے، پندرہ روزہ 'ہماری زبان'، انجمن ترقی اردو (ہند)، بابت جنوری، فروری، مارچ، اپریل 1951ء)۔

●●●

محمود خاں شیرانی اور لسانی تاریخ نویسی

(' پنجاب میں اردو ' کے حوالے سے)

جس طرح تہذیبیں کروٹیں بدلتی ہیں اسی طرح زبانیں بھی تبدیلی کے عمل سے گذرتی ہیں۔ ہر زندہ زبان میں عہد بہ عہد مختلف النوع لسانی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جن کے زیر اثر زبان کی ہیئت مسلسل بدلتی رہتی ہے، اور رفتہ رفتہ اس کا ڈھانچا اور کینڈا اس حد تک تبدیل ہو جاتا ہے کہ ایک دوسری زبان کی نمایاں شکل نمودار ہو جاتی ہے جسے ہم 'نئی زبان' یا 'جدید زبان' سے تعبیر کرتے ہیں، اور جس کی سلسلہ وار تاریخ کو 'لسانی تاریخ' کا نام دیتے ہیں۔

لسانی تاریخ نویسی کے اب تک کوئی اصول مرتب نہیں کیے گئے ہیں۔ مسعود حسین خاں (1919-2010ء) نے اردو زبان کی تاریخ ضرور لکھی، لیکن انھوں نے لسانی تاریخ نویسی کے اصول مرتب نہیں کیے۔ یہی حال دوسرے عالموں کا بھی ہے۔ شوکت سبزواری (1908-1973ء) نے بھی اردو زبان کی تاریخ مرتب کی، لیکن تاریخ مرتب کرنے کے اصول مرتب نہیں کیے۔ گیان چند جین (1923-2007ء) اور عبدالستار دلوی نے ہر چند کہ اردو زبان کی تاریخ پر باضابطہ طور پر کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن لسانیاتی موضوعات پر مضامین و مقالات ضرور قلم بند کیے، مگر انھیں بھی لسانی تاریخ نویسی کے اصول مرتب کرنے کا خیال نہیں آیا۔ سید محی الدین قادری زور (1904-1962ء) نے مغرب کی دانش گاہوں میں لسانیات

جدید کی اعلیٰ تربیت حاصل کی تھی، اور انگریزی اور اردو میں اس موضوع پر ان کی دو کتابیں بھی یادگار ہیں، لیکن انھوں نے بھی لسانی تاریخ نویسی کے اصول مرتب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ حافظ محمود خاں شیرانی (1880-1946ء) نے جب 'پنجاب میں اردو' (1928ء) تصنیف کی تو اس وقت ان کے پیشِ نظر لسانی تاریخ نویسی کے اصول نہ تھے، اور انھوں نے بھی وضع نہیں کیے، اسی لیے ان کی یہ کتاب تاریخ نویسی کے اصولوں کے لحاظ سے مکمل کتاب نہیں ہے۔

راقم السطور کی ناچیز رائے میں کسی زبان کی لسانی تاریخ موٹے طور پر پانچ اصولوں پر کاربند ہوتی ہے جو درج ذیل ہیں:

1- متعلقہ زبان کے لسانی خاندان یا خاندانِ السنہ (Language family) کا تعین، یعنی اس امر کا تعین کہ نسبی اعتبار سے (Geneologically) اس زبان کا تعلق کس لسانی خاندان سے ہے اور اس خاندان کا پس منظر کیا ہے۔

2- متعلقہ زبان کا ہم رشتہ زبانوں سے تقابل اور ان کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں اور اختلافات کا جائزہ۔

3- اس زبان کی ابتدا یا پیدائش کے نظریے کی تشکیل، یعنی اس بات کا تعین کہ متعلقہ زبان کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟

4- اس زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ اور اس کے مختلف ادوار — قدیم، وسطی اور جدید دور کا تعین۔

5- زبان کے دستیاب شدہ نمونوں اور مواد کا جائزہ اور ہر دور میں زبان کی ہیئت و ساخت میں تبدیلی کے عمل کا مطالعہ — صوتی، صرفی، نحوی، قواعدی اور معنیاتی تبدیلیاں۔

اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ لسانی تاریخ نویسی کے لیے لسانیات (Linguistics) بالخصوص تاریخی و تقابلی لسانیات (Historical and Comparative Linguistics) سے کماحقہ واقفیت نہایت ضروری ہے، تبھی ایک لسانی مؤرخ لسانی تاریخ نویسی کے اصولوں پر کاربند رہ سکتا ہے۔ شومیِ قسمت کہ اردو کے جن عالموں نے اس

موضوع پر قلم اٹھایا ہے، ان میں سے بیشتر لسانیات (جو ایک جدید علم ہے) کی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی کا شمار انہی اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ بیشک وہ ایک اعلیٰ پایے کے ماہرِ السنہ (Philologist) کہے جاسکتے ہیں، لیکن ماہرِ لسانیات (Linguist) نہیں۔

اردو زبان کی مربوط و مدلل اور مکمل تاریخ جس میں لسانی تاریخ نویسی کے تمام اصولوں کی پابندی کی گئی ہو اور جو تحقیق کے تقاضوں کو بھی بدرجۂ اتم پوری کرتی ہو، بہت کم لکھی گئی ہے۔

(2)

یہاں اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ اردو کی بعض قدیم کتابوں میں اور اکثر عصری تحریروں میں بھی اردو کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق کچھ ''منتشر'' خیالات اور ''سطحی'' باتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں، مثلاً اردو کو کھچڑی زبان بتایا گیا۔ اردو کے بارے میں کہا گیا کہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اردو کی جائے پیدائش صوبۂ سندھ بتائی گئی، اور یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی۔ اردو کی ابتدا کو پالی اور پراکرت سے بھی جوڑا گیا۔ اردو کو لشکری زبان کہنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں ہمارے اکابرین کی قیاس آرائیوں کا نتیجہ تھیں جن کی زمانۂ مابعد میں تردید کی گئی، لیکن جب حافظ محمود خاں شیرانی نے اردو کی ابتدا کو اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' (1928ء) میں پنجاب سے منسوب کیا تو بعض لوگوں کو اس میں کچھ سچائی نظر آئی۔ لیکن اس کے بیس سال بعد مسعود حسین خاں نے، جو ایک مستند ماہرِ لسانیات تھے، 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' (1948ء) لکھ کر شیرانی کے اس نقطۂ نظر کو کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی، تمام و کمال خارج کر دیا۔[1]

شیرانی کی 'پنجاب میں اردو' ایک تحقیقی تصنیف ہے جو بنیادی طور پر اس لسانی نظریے کی تائید میں لکھی گئی ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ یہ اصلاً محمود خاں شیرانی کا نظریہ نہیں، بلکہ ان سے قبل شیر علی خاں سرخوش اس نظریے کو اپنے تذکرے 'اعجازِ سخن' (1923ء) میں پیش کر چکے تھے۔ چونکہ شیرانی نے اپنی متذکرہ کتاب میں اس نظریے کو تاریخی

ولسانی استدلال کے ساتھ نہایت تحقیقی انداز سے پیش کیا ہے، اس لیے اہلِ علم کی اکثریت اسے انھی کا نظریہ سمجھتی ہے۔ شیرانی نے اس کتاب کے "انتساب" ہی میں یہ بات واضح کردی ہے کہ یہ کتاب "از اول تا آخر پنجاب اور اردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے۔" اس کے بعد انھوں نے صاف طور پر اپنا موقف واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔"(2)

شیرانی یہ بھی لکھتے ہیں:

"اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں؟"(3)

شیرانی نے مسلمانوں کے پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی جانے کے سلسلے میں بغیر کسی ثبوت کے محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے۔ وہ خود بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اس نظریے کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں۔"(4)

اس قیاسی تاریخی استدلال کے علاوہ محمود شیرانی نے لسانی شہادتیں بھی پیش کی ہیں، اور کہا ہے کہ "پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں"(5)، لیکن مسعود حسین خاں جیسے محتاط محقق اور ماہرِ لسانیات کو اس بات سے اتفاق نہیں۔ انھوں نے اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے محمود خاں شیرانی کے نظریے کی اپنی کتاب 'مقدمہ' تاریخِ زبانِ اردو' (1948ء) میں تردید تو کی ہی ہے، شیرانی کی اس دلیل کو بھی خارج کردیا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانیں لسانی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مضمون "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ" میں ان لسانی اختلافات کی نشاندہی کی ہے جو پنجابی اور جدید وقدیم اردو میں پائے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو اور پنجابی کے اختلافات کے صرف چند نمونے دیے گئے ہیں ورنہ صوتیاتی

اور صرفی ونحوی سطحات پر دونوں زبانوں کے اختلافات اس قدر واضح ہیں کہ دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے مشتق بتانا صریح طور پر غلط ہے۔''(6)

(3)

محمود خاں شیرانی کی متذکرہ کتاب لسانی تاریخ نویسی کے ان پانچ اصولوں پر پوری نہیں اترتی جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ شیرانی نے اردو کے ہند آریائی پس منظر سے پورے طور پر صرف نظر کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے یا اس کا تعلق ہند آریائی خاندانِ السنہ سے ہے۔ شیرانی کی لسانی تحقیق کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کے ''مقدمہ'' میں صرف ایک مقام پر ''مغربی ہندی'' کا ذکر کیا جسے ''قدیم پراکرت سوراسینی [شورسینی] کی یادگار'' بتایا ہے، لیکن مغربی ہندی میں انھوں نے ''برج بھاشا''، ''ہریانی'' (= ہریانوی) اور ''اردو'' کے ساتھ ''راجستھانی'' اور ''پنجابی'' کو بھی شامل کرلیا ہے جو ہرگز صحیح نہیں ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیاں کھڑی بولی (یعنی اردو اور ہندی)، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی ہیں جن میں نہ راجستھانی شامل ہے اور نہ پنجابی۔ پنجابی مغربی ہندی سے باہر کی زبان ہے۔ اسے مغربی ہندی کی ''شاخ'' نہیں کہا جاسکتا۔ جارج گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر اندرونی اور بیرونی زبانوں میں تقسیم کیا ہے۔ مغربی ہندی، پنجابی اور راجستھانی کا شمار اندرونی زبانوں میں ہوتا ہے۔ جس طرح اردو (= کھڑی بولی)، مغربی ہندی کی شاخ ہونے کی وجہ سے راجستھانی سے مختلف ہے اسی طرح اردو پنجابی سے بھی مختلف زبان ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کھڑی بولی (یعنی اردو) اور ہریانوی میں جو لسانی قربت ہے وہ اردو اور پنجابی میں نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو (= کھڑی بولی) اور ہریانوی مغربی ہندی کی دو ملتی جلتی شاخیں ہیں۔ خود شیرانی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ''اس میں [ہریانوی میں] اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔(7)

شیرانی نے لسانی تاریخ نویسی کے دوسرے اصول کے تحت اردو کا تقابل پنجابی سے کرنے کے علاوہ ملتانی سے بھی کیا ہے جسے لہندا بھی کہتے ہیں۔ سندھی کی طرح ملتانی (لہندا) کا تعلق بھی شمال مغربی اپ بھرنش سے ہے، جب کہ پنجابی (جسے مشرقی پنجابی بھی کہتے ہیں)، مغربی ہندی اور راجستھانی کی طرح شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے۔ مشرقی پنجابی کو لاہوری بھی کہتے ہیں، کیوں کہ یہ لاہور اور اس کے نواحی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہی پنجابی ہندوستانی صوبے پنجاب کی بھی زبان ہے۔ شمال مغربی اپ بھرنش دو زمروں میں منقسم ہے: 1) براچڈ اپ بھرنش، اور 2) کیکیئی اپ بھرنش۔ براچڈ اپ بھرنش کا ارتقا سندھ کے علاقے میں ہوا اور اس سے سندھی زبان پیدا ہوئی۔ کیکیئی اپ بھرنش سے مغربی پنجابی پیدا ہوئی جسے لہندا کہتے ہیں۔ ملتانی بھی اسی کا نام ہے۔ سندھی اور لہندا (یا ملتانی) میں گہرا لسانیاتی رشتہ پایا جاتا ہے۔ شیرانی مغربی پنجابی اور مشرقی پنجابی کے درمیان فرق کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ انھوں نے اس تقسیم کو ''ناجائز'' بتایا ہے۔[8] چنانچہ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ شیرانی، ہر چند کہ ایک جید عالم تھے، لیکن ہند آریائی لسانیات بالخصوص جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا سے متعلق ان کا علم ''محدود'' تھا۔

لسانی تاریخ نویسی کا تیسرا اصول متعلقہ زبان کے آغاز و ارتقا کے نظریے کی تشکیل ہے۔ شیرانی نے بہ حیثیتِ لسانی مؤرخ اردو کے آغاز و ارتقا کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی رو سے اردو عہدِ غزنوی میں پنجاب میں پیدا ہوتی ہے، پھر ایک سو ستر سال بعد غوریوں کے عہد میں لاہور سے دہلی ہجرت کر جاتی ہے، پھر وہاں سے گجرات اور دکن کا رخ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں شیرانی نے پنجابی اور قدیم اردو (دکنی اردو) کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ان دونوں زبانوں کے درمیان لسانی اشتراک اور قربت کی وجہ سے اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ تشکیل دیا ہے۔ لیکن انھوں نے تقابلی مطالعہ ان دونوں زبانوں کے درمیان صرف چند مماثلتوں ہی کو مدِ نظر رکھ کر کیا ہے، اور اختلافات کو وہ تمام و کمال نظر انداز کر گئے ہیں۔ ایک محقق کی حیثیت سے انھیں ان دونوں زبانوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر بھی نظر رکھنی چاہیے تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا جس کی وجہ سے ان کی یہ تحقیق عدمِ توازن اور نا

ہمواری (Lopsidedness) کا شکار ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ مسعود حسین خاں کو یہ کہنا پڑا کہ

''پنجابی اور اردو میں بعض ایسے اہم ختلافات تا حال موجود ہیں جن کی بنیاد پر اردو کا پنجابی سے ماخوذ ہونا کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔'' (9)

اردو کے آغاز وارتقا کی نظریہ سازی کرتے وقت شیرانی جیسے بالغ نظر محقق سے ایک سہو یہ بھی ہوا کہ انھوں نے پنجابی کو اہمیت دینے کے پیشِ نظر کھڑی بولی اور ہریانوی کو یکسر نظرا نداز کر دیا۔ یہ دونوں مغربی ہندی کی 'الف' پر ختم ہونے والی بولیاں ہیں، اور ان کا ارتقا 1000 سنہ عیسوی کے بعد دہلی ونواحِ دہلی میں شورسینی اپ بھرنش سے ہوا ہے۔ ان بولیوں کے ارتقا کا زمانہ وہی ہے جو پنجابی کے ارتقا کا ہے۔ جس زمانے میں پنجاب میں شورسینی اپ بھرنش سے پنجابی ارتقا پا رہی تھی تقریباً اسی زمانے میں دہلی ونواحِ دہلی میں کھڑی بولی، ہریانوی اور بعض دوسری بولیاں بھی نمو پذیر ہو رہی تھیں۔ ہریانوی ہریانہ کے علاوہ دہلی کے شمال مغرب کی بھی بولی ہے۔ اسی طرح کھڑی بولی مغربی اتر پردیش (یو پی) کے علاوہ شمال مشرقی دہلی میں بھی بولی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ دہلی کے جنوب میں ذرا دوری پر مغربی ہندی کی ایک اور بولی برج بھا شامل جاتی ہے۔ اسی طرح دہلی کے جنوب مغرب میں راجستھانی کی بولی میواتی کا چلن پایا جاتا ہے۔ یہ چاروں بولیاں نواحِ دہلی کی بولیاں ہیں اور دہلی ان کا سنگم ہے۔ اردو کے آغاز وارتقا میں ان بولیوں کا اہم کردار رہا ہے۔ بقول مسعود حسین خاں ''نواحِ دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں، اور حضرتِ دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا۔'' (10)

آغازِ اردو کے نظریے کی تشکیل میں امیر خسرو کی لسانی شہادت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ امیر خسرو نے اپنی فارسی مثنوی ''نہ سپہر'' (1318ء) میں ہندوستان میں اپنے عہد میں بولی جانے والی بارہ زبانوں کا سلسلہ وار ذکر کیا ہے جن میں بارھویں زبان ''دہلی و پیرامنش'' ہے جس سے مراد دہلی ونواحِ دہلی میں رائج بولیاں ہیں۔ خسرو نے ان بولیوں کے نام نہیں گنائے ہیں، لیکن یہ وہی بولیاں ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، یعنی کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا اور میواتی۔ یہ بولیاں مسلمانوں کے داخلۂ دہلی (1193ء) سے قبل ارتقا پا چکی تھیں۔ جب ان نو وارد مسلمانوں نے دہلی کو اپنا مستقر بنایا تو

انھی بولیوں کی بنیاد پر دہلی میں ایک نیا محاورہ وجود میں آیا جسے انھی مسلمانوں نے ''ہندوی'' اور ''ہندی'' کا نام دیا۔ یہ نیا محاورہ بنیادی طور پر کھڑی بولی کا تھا، لیکن اس پر نواحِ دہلی کی دوسری بولی ہریانوی کے بھی گہرے اثرات پڑے تھے۔

امیر خسرو کی ''دہلی و پیرامنش'' کی شناخت کے باوصف، شیرانی کا یہ کہنا کہ ''یہ تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے اس وقت علاقہ میں کیا زبان بولی جاتی تھی''، (11) باعثِ حیرت واستعجاب ہے۔ شیرانی نے یا تو مثنوی ''نہ سپہر'' دیکھی ہی نہیں، اور اگر دیکھی ہے تو خسرو کے متذکرہ لسانی بیان سے صرفِ نظر کیا ہے۔ آگے چل کر شیرانی پھر وہی سوال دہراتے ہیں: ''اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کون سی زبان بولی جاتی تھی؟'' وہ قیاس کی بنیاد پر خود ہی کہتے ہیں: ''یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج!'' (12) انتہائی حیرت کی بات ہے کہ شیرانی نے برج بھاشا کو تین صدی قبل دوآبہ گنگ وجمن میں رائج زبان بتایا ہے۔ اس سے بڑھ کر بے سروپا بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ آج دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے، لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔'' (13)

شیرانی کی یہ بھی دلیل ہے کہ جب اردو مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے دہلی آئی تو اس نے ''ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے۔'' (14) شیرانی کے ان مفروضات کو بھلا کون تسلیم کرے گا۔ اس سے پہلے وہ یہ بھی کہہ چکے تھے کہ ''راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔'' (15) نواحِ دہلی کی بولیوں کے وجود سے انکار کے بعد شیرانی کے لیے یہ ثابت کرنا آسان ہوگیا کہ ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے،'' جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

جب امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں ''لاہوری'' (= پنجابی) اور ''دہلی'' (= نواحِ دہلی کی بولیاں) کی شناخت علیحدہ طور پر قائم کردی تو شیرانی یہ دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ خسرو کی شہادت کے مطابق اردو دہلی میں، دہلی ونواحِ دہلی کی

بولیوں کے خمیر سے پیدا ہوئی، اور پنجابی جسے خسرو نے ''لاہوری'' کہا ہے، وہ پنجاب میں پیدا ہوئی۔ اگر اردو پنجاب میں پیدا ہوئی ہے (جیسا کہ محمود شیرانی کی دلیل ہے)، تو پنجاب کے لوگ آج اپنی مادری زبان کے طور پر اردو کیوں نہیں بولتے؟

حقیقتِ حال یہ ہے کہ شیرانی قدیم اردو یا دکنی اردو کی جن لسانیاتی خصوصیات کو پنجابی زبان سے منسوب کرتے ہیں وہ تمام خصوصیات ہریانوی اور کھڑی بولی میں بھی پائی جاتی ہیں، اور یہ دونوں دہلی ونواحِ دہلی کی بولیاں ہیں۔ اس بات کا واضح اشارہ خسرو کی فارسی مثنوی ''نہ سپہر'' میں موجود ہے۔ اردو کا ڈھانچا انھی بولیوں سے مل کر تیار ہوا ہے۔ ابتدا میں اردو جب سیال حالت میں تھی تو ہریانوی کے اثرات اس پر زیادہ نمایاں تھے۔ چونکہ جغرافیائی اعتبار سے ہریانہ (جہاں کی بولی ہریانوی ہے) بہ جانب مغرب پنجاب سے متصل ہے، اس لیے دکنی اردو پر ہریانوی کے اثرات کو شیرانی پنجابی کے اثرات سمجھ بیٹھے۔ مسعود حسین خاں نے دکنی اردو پر ان اثرات کو ہریانوی سے منسوب کیا ہے جو دہلی کے شمال مغرب کی ایک بولی ہے۔ ہریانہ کی حد بھی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ شیرانی نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ قدیم اردو ہریانوی سے قریب ہے، پھر بھی وہ دکنی اردو پر ہریانوی کے اثرات کے منکر ہیں، اور ان اثرات کو وہ پنجابی سے منسوب کرتے ہیں۔ شیرانی کو دکنی اردو میں جو 'پنجابی پن' نظر آتا ہے وہ درحقیقت اس کا ''ہریانوی پن'' ہے، کیونکہ جغرافیائی اعتبار سے دہلی سے ہریانہ قریب ہے، پنجاب نہیں۔ اس لیے دہلی میں نمو پذیر ہونے والی زبان پر ہریانوی کا اثر پڑنا فطری اور لازمی امر ہے۔ اس سلسلے میں مسعود حسین خاں کا یہ نقطۂ نظر کافی حقیقت پسندانہ ہے کہ ''قدیم اردو کا پنجابی پن کھڑی/ہریانی کے اثرات کی وجہ سے تھا نہ کہ براہِ راست مسلمانوں کے پنجاب سے دہلی ہجرت کرنے کی وجہ سے۔''(16) انھوں نے بہ حیثیت ماہرِ لسانیات نہایت وثوق کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ''دکنی اردو کی کوئی بھی صوتیاتی، صرفی یا نحوی خصوصیت ایسی نہیں جس کی لسانیاتی توجیہ نواحِ دہلی کی دو بولیوں کھڑی اور ہریانی سے نہ کی جا سکے۔''(17) اس واضح لسانی بیان سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جسے شیرانی ''پنجابی اور اردو کا اشتراک'' کہتے ہیں وہ اصلاً ہریانوی اور اردو کا اشتراک ہے، اور ہریانوی نواحِ دہلی کی بولی ہے نہ کہ پنجاب

کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیرانی ہریانوی کو ''پرانی اردو'' کہتے ہیں، لیکن ہریانوی کی لسانیاتی خصوصیات کو جو پرانی اردو میں نفوذ کر گئی ہیں، تسلیم نہیں کرتے۔ اگر وہ ہریانوی کے جائز مقام اور اس کی لسانیاتی خصوصیات کو تسلیم کر لیں تو 'پنجابی' کا سارا تنازع ختم ہو سکتا ہے۔

(4)

علاوہ ان باتوں کے جن کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے، شیرانی کی متذکرہ کتاب تضادات کا بھی شکار ہو گئی ہے۔ ان کے چند متضاد بیانات کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

1- شیرانی ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ''ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے''، دوسری جانب وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''وہ پرانی اردو ہے۔'' (ص 18)

2- شیرانی ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ ''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے'' (ص 19)، لیکن ہریانوی کے حوالے سے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''وہ پرانی اردو ہے، یعنی وہی اردو ہے جو گیارھویں صدی عیسوی میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی۔'' (ص 18)۔ جب اردو بقولِ شیرانی دہلی کی قدیم زبان نہیں تو یہ گیارھویں صدی عیسوی میں دہلی میں کیونکر بولی جاتی تھی؟

3- شیرانی کا ایک طرف یہ نقطۂ نظر کہ ''وہ [اردو] مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں!'' (ص 19)، لیکن دوسری طرف ان کا یہ کہنا کہ ''بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان [اردو] اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے'' (ص 18)، متضاد باتیں ہیں۔

4- شیرانی کہتے ہیں کہ ''اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔'' (ص 99)۔ دوسری جانب وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے، نہ ہریانی، اور نہ قنوجی ہے۔ وہ زبان ہے جو صرف دہلی

اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔'' (ص18)۔ جب اردو کی پنجابی کے ساتھ ہی پنجاب میں ''ولادت'' ہو جاتی ہے تو پھر اس کا دہلی اور میرٹھ میں بولی جانے والی زبان سے پیدا ہونے کے کیا معنی؟ کیا ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں؟

یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ محمود خاں شیرانی نے اردو کی ابتدا سے متعلق جس نظریے کی تشکیل کی ہے اس کے داخلی و خارجی شواہد اور دلائل نہایت کمزور اور غیر منطقی ہیں، اس لیے یہ نظریہ کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی، نا قابلِ قبول اور قابلِ رَد ہے!

(5)

لسانی تاریخ نویسی کے چوتھے اصول کے تحت متعلقہ زبان کے ارتقا کے مختلف ادوار کا تعین کیا جاتا ہے اور پورے دور کو زمانی اعتبار سے قدیم، وسطی اور جدید دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شیرانی کی کتاب میں اردو کے مختلف ادوار کی زمانی اعتبار سے صراحت موجود نہیں ہے، یعنی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اردو کا قدیم دور کب سے کب تک ہے، وسطی دور کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہو جاتا ہے، اور جدید دور کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ شیرانی کی اس کتاب میں اردو کے قدیم دور کا حوالہ تو ملتا ہے، لیکن یہ دور کب سے کب تک کا ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شیرانی قدیم اردو کو دکنی اردو بھی کہتے ہیں اور اس کا موازنہ پنجابی سے کرتے ہیں۔ اردو کی ابتدا کو مسعود حسین خاں مسلمانوں کی فتحِ دہلی (1193ء) سے مانتے ہیں، لیکن شیرانی لکھتے ہیں:

> ''اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے، جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں توطن اختیار کر لیا ہے۔''(18)

اردو کی ابتدا کو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے نسبت دینا ایک گمراہ کن نظریہ ہے۔ اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس کی ابتدا کے لیے شورسینی اپ بھرنش کے دور آخر کی لسانی تبدیلیوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ انھی تبدیلیوں کے زیر اثر مدھیہ دیشہ

(Midland) کی جدید ہند آریائی زبانوں کے سوتے پھوٹے۔ اردو انہی جدید ہند آریائی زبانوں میں سے ایک ہے۔ مسلمانوں کی 1000 سنہ عیسوی کے قریب ہندوستان میں آمد سے جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا میں تیزی ضرور آئی، لیکن انھوں نے یہاں آ کر کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا۔ اگر بعض اہلِ علم یہ سوچتے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لائے ہوئے چند عربی فارسی الفاظ سے اردو بن گئی تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ زبانیں مفرد الفاظ سے نہیں بنا کرتی ہیں، خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، بلکہ یہ قواعدی ڈھانچوں اور قواعدی اصولوں کی بنیاد پر تشکیل پذیر ہوتی ہیں۔ اردو کا تمام تر قواعدی ڈھانچا اور کینڈا انڈک (Indic) یعنی ہندوستانی الاصل ہے، نیز قواعد کے اصول اور بنیادی الفاظ بھی ہندوستانی نژاد ہیں، اور قدیم دکنی اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا تو معتد بہ حصہ تتسم (سنسکرت کے خالص الفاظ) اور تدبھو (بدلے ہوئے الفاظ) پر مشتمل تھا۔ ان میں سے بیشتر الفاظ و تراکیب بعد کے دور میں دہلی میں تحریکِ اصلاحِ زبان کے نام پر خارج کر دیے گئے۔

(6)

لسانی تاریخ نویسی کا آخری مرحلہ جس کا ذکر سطورِ بالا میں اس کے پانچویں اصول کے تحت کیا گیا ہے، متعلقہ زبان کے دستیاب شدہ نمونوں اور مواد کا جائزہ اور ان کی بنیاد پر لسانی تبدیلیوں (صوتی، صرفی، نحوی اور قواعدی تبدیلیوں) کا مطالعہ ہے۔

شیرانی نے، اردو زبان میں جو عہد بہ عہد تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، صرف پنجابی اور قدیم اردو (دکنی اردو) کی لسانی مماثلتوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے اور دکنی اردو کے لسانی امتیازات کو (جو در حقیقت ہریانوی کے اثرات کا نتیجہ ہیں) پنجابی کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پنجابی اور اردو اپنی صرف و نحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔''(19)

لیکن یہی بات وہ ہریانوی اور اردو کے لیے بھی کہہ چکے ہیں، ملاحظہ ہو یہ بیان:

''اس میں [ہریانوی میں] اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔''(20)

ہریانوی اور اردو کے بارے میں ان کا یہ قول بھی ملاحظہ ہو:

''ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے۔'' (21)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شیرانی ہریانوی اور قدیم اردو میں قربت دیکھتے ہیں، بلکہ ہریانوی ہی کو ''اردو'' یا ''پرانی اردو'' تسلیم کرتے ہیں تو قدیم اردو کی لسانی خصوصیات کو ہریانوی کی لسانی خصوصیات کیوں نہیں مان لیتے؟ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پنجابی، اردو اور ہریانوی کے باہمی رشتوں کے بارے میں خاصی الجھن (Confusion) میں مبتلا ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ پنجابی ایک علیٰحدہ زبان ہے اور اردو اس سے ایک علیٰحدہ زبان۔ نہ تو پنجابی سے اردو پیدا ہوئی ہے اور نہ اردو سے پنجابی۔ اور ہریانوی نواحِ دہلی کی ایک بولی ہے جس کا شمار کھڑی بولی کی طرح مغربی ہندی کی 'الف' پر ختم ہونے والی بولیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے قدیم اردو کو جب کہ وہ سیال حالت میں تھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ شیرانی دکنی اردو کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس پر پنجابی کے اثرات ہیں اور فوراً یہ نظریہ قائم کرلیا کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی، لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ شیرانی اس لسانی حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی (971-1030ء) کے عہد میں اور اس کے بعد بھی پنجاب میں شورسینی اپ بھرنش سے جس ہند آریائی زبان کی تشکیل عمل میں آرہی تھی وہ پنجابی تھی، نہ کہ اردو۔ یہی وجہ ہے کہ آج پنجاب کا بچہ بچہ پنجابی ہی بولتا ہے جو ایک فطری عمل ہے۔

شیرانی کی متذکرہ تصنیف میں اردو زبان میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں کے عمل کا جائزہ نہیں ملتا۔ کہیں کہیں انھوں نے صوتی وصرفی تبدیلیوں سے مبہم انداز میں بحث کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ پنجابی اور دکنی میں الفاظ کی صورت یوں تھی اور بعد کے دور میں یوں ہوگئی۔ پنجابی اور اردو میں جو لسانی فرق پایا جاتا ہے اسے وہ ''اختلاف'' کا نام دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''ان زبانوں [پنجابی اور اردو] میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعراء اور تعلیم یافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔'' (22)

ان کا یہ بیان بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ ان دونوں زبانوں میں اختلافات تو شروع ہی سے تھے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ محمود خاں شیرانی نے اپنی معرکہ آرا تصنیف 'پنجاب میں اردو' میں دو زبانوں، پنجابی اور دکنی اردو کے تقابلی مطالعے کی جو کوشش کی ہے وہ یقیناً لائقِ تحسین ہے، لیکن اس سے انھوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ کئی وجوہ سے ماہرینِ لسانیات کے نزدیک مشکوک اور نا قابلِ قبول ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شیرانی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ پنجاب اور ہریانہ کے قدیم اردو کے نمونوں کو تلاش کیا ہے اور ان تصانیفِ نثر و نظم کو ڈھونڈ نکالا ہے جن کی اردو زبان کے تاریخی مطالعے میں بیحد اہمیت ہے۔ شیرانی کے آغازِ زبانِ اردو کے نظریے کی کئی محققین اور ماہرینِ لسانیات نے تردید کی ہے جن میں مسعود حسین خاں پیش پیش رہے ہیں۔ اب اس نظریے کی لسانیاتی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ یوں بھی شیرانی کی اس تحقیق کو چند سال بعد پوری ایک صدی کا عرصہ گذر چکا ہوگا اور علمی دنیا جانتی ہے کہ تحقیق میں کوئی بھی چیز مستقل یا حتمی نہیں ہوا کرتی!

حواشی

1- مسعود حسین خاں کی تحقیقی تصنیف 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' پہلی بار 1948ء میں دہلی سے شائع ہوئی، لیکن جب 1987ء میں اس کا ساتواں ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں انھوں نے نئی معلومات کی روشنی میں کچھ ترمیمات اور اضافے کیے اور اس کا تیسرا باب ازسرِ نو لکھا۔ علاوہ ازیں اردو کے ماخذ کے بارے میں ''تھوڑی سی نظریاتی ترمیم'' بھی کی۔

2- حافظ محمود خاں شیرانی، 'پنجاب میں اردو' (لکھنو: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، 1970ء)، ص 99۔

3- ایضاً، ص 19۔

4- ایضاً، ص 19۔

5- ایضاً، ص 84۔

6- مسعود حسین خاں کا پختہ عقیدہ ہے کہ ''پنجابی اور اردو میں بعض ایسے اہم اختلافات تا حال موجود ہیں جن کی بنیاد پر اردو کا پنجابی سے ماخوذ ہونا کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔'' پنجابی اور اردو کے درمیان اسمائے ضمائر کے اختلاف کے سلسلے میں مسعود حسین خاں کا قول ہے کہ ''اردو نے اپنے ارتقا کے مرحلے میں پنجابی ضمائر اَسیں (ہم)، تُسیں (تم)، ساڈا، اَساڈا (ہمارا)، توہاڈا، تساڈا (تمہارا)، استعمال نہیں کیے ہیں۔ اسی طرح ضمائر اشارہ میں پنجابی کا اِنا اور اُنا اردو میں اتنا اور اُتنا رہے ہیں۔ جہاں تک افعال کا تعلق ہے، مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ ''قدیم و جدید اردو اور پنجابی میں بعض ایسے اہم اختلافات پائے جاتے ہیں کہ ایک زبان کا دوسرے سے مشتق ہونا بعید از قیاس ہو جاتا ہے۔ اردو میں حالیہ ناتمام 'تا' آتا ہے، جبکہ پنجابی میں 'دا' لگتا ہے، مثلاً نکلتا (اردو)، نکلدا (پنجابی)... اسی طرح کا، کی، کے، کے لیے پنجابی دا، دی، دے اردو میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ محمود شیرانی نے دکنی اردو اور پنجابی کی بعض مماثلتوں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی، لیکن مسعود حسین خاں کو شیرانی کے اس نظریے سے سخت اختلاف ہے۔ ان کا قول ہے کہ ''دکنی اردو کی کوئی بھی صوتیاتی، صرفی یا نحوی خصوصیت ایسی نہیں ہے جس کی لسانیاتی توجیہ نواحِ دہلی کی دو بولیوں کھڑی [بولی] اور ہریانی سے نہ کی جا سکے۔'' (دیکھیے مسعود حسین کا مضمون، ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ''، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، ص 84 تا 95)۔

7- حافظ محمود خاں شیرانی، محولۂ بالا کتاب، ص 19۔

8- ایضاً، ص 80۔

9- مسعود حسین خاں، ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ''، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، ص 88۔

10- مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'، ساتواں ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء)، ص 262۔

11- حافظ محمود خاں شیرانی، محولۂ بالا کتاب، ص 81۔

12- ایضاً،ص 18۔

13- ایضاً،ص 19۔

14- ایضاً،ص 19۔

15- ایضاً،ص 18۔

16- مسعود حسین خاں، ''اردو کی ابتدا سے متعلق چند مشاہدات'، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، ص 37۔

17- مسعود حسین خاں، ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ''، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ، ص 87۔

18- حافظ محمود خاں شیرانی، محولۂ بالا کتاب، ص 54۔

19- ایضاً،ص 84۔

20- ایضاً،ص 18۔

21- ایضاً،ص 25۔

22- ایضاً،ص 99۔

ترقیمہ

راقم السطور نے اپنے ایک حالیہ مضمون ''اردو اور پنجابی کا لسانی اشتراک و افتراق'' (مشمولہ کتابِ ہٰذا) میں اردو اور پنجابی کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں اور اختلافات کا بالتفصیل جائزہ پیش کیا ہے۔

•••

مسعود حسین خاں کا نظریۂ آغازِ زبانِ اردو

مسعود حسین خاں (1919-2010ء) کے نظریۂ آغازِ زبانِ اردو کو سمجھنے کے لیے ان کی گراں قدر تحقیقی تصنیف 'مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1948ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اس کے متعدد اڈیشنز اور ری پرنٹس شائع ہوئے۔ سنہ 1987ء میں جب یہ کتاب ساتویں بار چھپی تو مسعود حسین خاں نے اس میں بعض ترمیمات کیں۔ اس کے ''پیش لفظ'' میں انھوں نے لکھا کہ ''اب اس ساتویں اشاعت میں نہ صرف پچھلے اٹھائیس سال کی نئی معلومات کی روشنی میں اضافہ و ترمیمات کی گئی ہیں، بلکہ اس کا تیسرا باب از سرِ نو لکھا گیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہی باب اس تحقیقی مقالے کی جان ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے ماخذ کے بارے میں تھوڑی سی نظریاتی ترمیم بھی کی گئی ہے۔''

ہندوستان کی ان تمام یونیورسٹیوں میں جہاں پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، مسعود حسین خاں کی یہ تصنیف داخلِ نصاب ہے۔ یہ اختصاص اور امتیاز اردو کی بہت کم تصانیف کو حاصل رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی 'بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اساتذۂ اردو کا ایک طبقہ مسعود صاحب سے حاسد ہو گیا ہے۔ کیونکہ پچھلے دنوں بعض ایسی تحریریں نظر سے گذری ہیں جن میں معاندانہ انداز سے اس کتاب کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ بحث اگرچہ علمی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی، لیکن بے جا استدلال، غلط استنباط اور غیر ضروری تفصیلات و اندراجات، نیز بے سروپا اقتباسات سے کام لے کر خلطِ مبحث پیدا کیا

گیا ہے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو ان تحریروں کا کتاب کے اصل موضوع سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ ان تحریروں کے مصنّفین بزعم خود ماہر لسانیات ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور لسانی موضوعات پر اکثر خامہ فرسائی بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کی ابجد سے بھی انھیں واقفیت نہیں۔ یہاں ان مہمل تحریروں کا ذکر کر کے اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا مقصود نہیں، بلکہ پروفیسر مسعود حسین خاں کی 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' کو لسانیات کی کسوٹی پر پرکھنا ہے، کیوں کہ بہر حال یہ کتاب اردو کے حوالے سے لسانیاتی مسائل و مباحث اور اس کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔

کسی زبان کے لسانیاتی مطالعے کے دو بنیادی پہلو ہیں: تاریخی اور توضیحی۔ تاریخی لسانیات میں زبانوں کے عہد بہ عہد ارتقا اور ان میں رونما ہونے والی مختلف النوع تبدیلیوں سے بحث کی جاتی ہے۔ زبانوں کا تقابلی مطالعہ بھی تاریخی لسانیات کا ایک اہم پہلو ہے، کیونکہ تقابلی مطالعہ کے ذریعے سے ہی ہم رشتہ زبانوں کا تعین کیا جاتا ہے اور ان کے ماخذ تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ تاریخی لسانیات کی تمام تر بنیاد تحریری آثار پر قائم ہے۔ اس کے برعکس توضیحی لسانیات میں زبانوں کی ساخت کا مطالعہ و تجزیہ کسی ایک وقت میں ان کی تاریخ کے حوالے کے بغیر کیا جاتا ہے۔ مسعود حسین خاں کی 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' تاریخی و تقابلی لسانیات کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کوئی زبان جب معرضِ وجود میں آتی ہے تو وہ زمان و مکان کے حوالے بھی اپنے ساتھ لاتی ہے، نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زبان ایک خاص لسانی عمل کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کا تاریخی مطالعہ کرتے وقت تین سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ یہ زبان کب پیدا ہوئی، کہاں پیدا ہوئی اور کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سوالات دراصل اس زبان کی زمانی و مکانی تعیین، نیز اس کے پیدائشی عمل کی جانب اشارے کرتے ہیں۔ مسعود صاحب کی مذکورہ تصنیف میں اردو کے حوالے سے ان تینوں باتوں کا جواب بڑی وضاحت اور تحقیقی استناد کے ساتھ نہایت مدلل انداز میں دیا گیا ہے اور یہی اس کتاب کا مواد و موضوع بھی ہے۔

اگر چہ یہ تینوں سوالات کہ اردو کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟ باہم مربوط ہیں، تاہم

دوسرے سوال یعنی اردو کہاں پیدا ہوئی کو ہم پہلے لیں گے۔

(2)

اردو کی جائے پیدائش کے تعین کے سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو مصنّفین نے علمی استدلال سے کم اور قیاس آرائیوں سے زیادہ کام لیا ہے۔ کسی نے اردو کا مولد سندھ بتایا تو کسی نے پنجاب، گجرات اور دکن۔ مسعود حسین خاں نے تاریخی لسانیات کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں پورے طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ ''حضرتِ دہلی'' اردو کا حقیقی مولد ومنشا ہے اور زبانِ ''دہلی و پیرامنش'' (امیر خسرو) اس کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس طرح اردو کا رشتہ کھڑی بولی اور نواحِ دہلی کی دوسری بولیوں بالخصوص ہریانوی سے استوار ہو جاتا ہے۔ بقولِ مسعود حسین خاں ''شہر دہلی تین بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔ شمال مشرق میں کھڑی [بولی] اور جنوب میں برج کا علاقہ ہے۔ اردو کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔'' اس کے بعد مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ ''قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔'' انھوں نے یہ بات محض قیاساً نہیں لکھ دی ہے، بلکہ امیر خسرو (1253-1325ء) کے فقرے زبانِ ''دہلی و پیرامنش'' (دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں) سے اشارہ پا کر نواحِ دہلی کی بولیوں کا تقابلی مطالعہ کیا اور دکنی زبان کی خصوصیات کو پنجابی کے بجائے ان بولیوں میں پہچاننے کی کوشش کی اور ایسا کرتے وقت ان بولیوں کے جدید روپ اور دستیاب شدہ قدیم نمونوں کو بھی سامنے رکھا۔ پھر اپنے نظریے کی تشکیل اس طرح کی کہ دوآبہ اور جمنا پار کا علاقہ یعنی دہلی اردو کا مولد ومنشا قرار پایا۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے ''دہلی اور نواحِ دہلی'' کو اردو کی ولادت گاہ تسلیم کیا ہے۔ مسعود حسین خاں نے 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' اور اپنے بعض دیگر مقالات میں اردو کے آغاز وارتقا کے سلسلے میں بجا طور پر کھڑی بولی اور ہریانوی پر زور دیا ہے اور یہ دونوں دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیاں ہیں۔ قدیم وجدید اردو کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ اردو کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم اردو پر ہریانوی

بولی کے اثرات بھی بہت نمایاں ہیں اور دکنی متون سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو کی تشکیل میں مسعود صاحب نے کھڑی بولی کے ساتھ ہریانوی کو بھی ''برابر کی حصہ دار'' بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''امیر خسرو کی ''نہ سپہر'' میں دی ہوئی بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست سے زبانِ ''دہلی و پیرامنش'' (دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں) کو اردو کا سرچشمہ ثابت کیا گیا ہے۔ اس طرح کھڑی بولی کے ساتھ ہریانوی بھی اس میں برابر کی حصہ دار ہوگئی ہے۔''
>
> (''پیش لفظ''، مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، ایڈیشن 1987ء)

لیکن جیسے جیسے اردو معیاری شکل اختیار کرتی گئی ہریانوی کے اثرات زائل ہوتے گئے، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں شمالی ہند میں تحریکِ اصلاحِ زبان کے نام سے شاہ حاتم اور ان کے معاصرین نے ان اثرات کا قلع قمع کر دیا۔

آج کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اردو کی اساس کھڑی بولی پر قائم نہیں ہے۔ جارج گریرسن نے اردو کو کھڑی بولی کا ادبی روپ کہا ہے لیکن حقیقتاً اصل زبان وہ ہوتی ہے جو بول چال کی سطح پر استعمال ہوتی ہے اور زبان کا ادبی روپ اس کا معیاری روپ ہوتا ہے جو بول چال کی زبان سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اردو بول چال کی شکل میں کھڑی بولی ہی کا دوسرا نام ہے جو نواحِ دہلی (بجانب شمال مشرق) اور مغربی یوپی (اتر پردیش) کی بولی ہے اور بالخصوص میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بجنور، مراد آباد اور رام پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو سندھ، پنجاب اور دکن میں پیدا ہوئی انھیں پہلے اس حقیقت سے انکار کرنا ہوگا کہ اردو کھڑی بولی سے نکلی ہے۔ اردو کا کھڑی بولی سے نکلنا ایک ایسی لسانی حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم اردو (دکنی اردو) پر ہریانوی اثرات رہے ہیں۔ کھڑی بولی کی طرح ہریانوی بھی نواحِ دہلی کی ایک بولی ہے جو بجانب شمال مغرب واقع ہے اور دہلی میں کھڑی بولی

کے ساتھ جا کر مل جاتی ہے۔ لہٰذا مسعود حسین خاں کا دہلی اور نواحِ دہلی کو اردو کی جائے پیدائش قرار دینا تاریخی و لسانی اعتبار سے عین مناسب اور قابلِ قبول ہے۔

(3)

اب ہم اس سوال پر غور کریں گے کہ اردو کب پیدا ہوئی؟ اردو مصنفین میں اس امر پر بھی شدید اختلافِ رائے رہا ہے کہ اردو کب پیدا ہوئی۔ کوئی اسے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے زمانے سے منسوب کرتا ہے تو کوئی اس کا سلسلہ امیر خسرو کے عہد سے ملاتا ہے اور کوئی اسے شاہ جہانی عہد کی یادگار سمجھتا ہے۔ مسعود حسین خاں کے خیال میں اردو کے آغاز کی تاریخ فتحِ دہلی (1193ء) کی تاریخ ہے، کیوں کہ اس تاریخ سے عربی و فارسی کے لسانی اثرات ''زبانِ دہلی و پیرامنش'' میں نفوذ کرتے ہیں، اگرچہ اس سے قبل بھی عربی فارسی الفاظ یہاں کی بولیوں میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن یہ اردو کی پیدائش کا سبب نہیں بنے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا، بلکہ جب لسانی اثرات ''زبانِ دہلی و پیرامنش'' میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتحِ دہلی (1193ء) کے بعد۔''
>
> ('مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو، اڈیشن 1987ء، ص 76)

عربی فارسی کے لسانی اثرات کا نفوذ دہلی اور نواحِ دہلی کی جس بولی میں سب سے زیادہ ہوا ہے وہ کھڑی بولی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اردو کا خمیر عربی فارسی عناصر کے ساتھ مل کر کھڑی بولی سے تیار ہوتا ہے اور امیر خسرو کے ہاں پہلی بار اس کا ادبی اظہار ملتا ہے۔ یہی زبان ہریانوی عناصر کی شمولیت کے ساتھ علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ 1294ء میں دکن پہنچتی ہے چوں کہ اردو کی اساس کھڑی بولی پر قائم ہے اس لیے یہ زبان دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی جدید ہندی سے کافی قدیم ہے۔ قدیم و جدید اردو کا تمام

تر سرمایہ کھڑی بولی پر مشتمل ہے، جب کہ قدیم ہندی کے نمونے کھڑی بولی میں بالکل شاذ ہیں۔ یہ دیگر بولیوں مثلاً برج بھاشا اور اودھی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ کھڑی بولی کے انداز پر دیوناگری ہندی 1800ء کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ڈھالی گئی ہے۔ بھارتیندو ہریش چندر (1885-1850ء) اس جدید کھڑی بولی ہندی کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اسے کھڑی بولی کے روپ میں اردو کی طرز پر فروغ دینے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور رسا ان کا تخلص تھا۔

محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی کی آبادی کی نقلِ مکانی (1327ء) کی وجہ سے کھڑی بولی (اردو) باضابطہ طور پر دکن پہنچتی ہے، لیکن اس کے لسانی اثرات دکن کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے خطوں میں بھی محسوس کیے جاتے ہیں مثلاً مہاراشٹر میں نامدیو (1408-1318ء)، پنجاب میں گرونانک (1529-1469ء) اور پورب میں کبیر داس (1515-1440ء) کے کلام سے ان اثرات کی توثیق ہوتی ہے۔ مسعود حسین خاں ان تینوں صوفی سنتوں کے کلام کا لسانی تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''اس وقت تک کھڑی بولی رابطے کی زبان کے طور پر ایک کل ہند حیثیت اختیار کر چکی تھی۔''

اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ کے بارے میں مسعود حسین خاں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''پنجاب پر غوریوں کے حملے 1168ء سے شروع ہو جاتے ہیں۔ 1193ء میں بالآخر ایک شکست کھانے کے بعد شہاب الدین غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قابض ہو جاتا ہے جہاں اس کا سپہ سالار قطب الدین ایبک اس کے انتقال کے بعد 1206ء میں سلطنت غلاماں کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ اس کے بعد ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً، ص: 78-77)

(4)

اب رہا تیسرا سوال کہ اردو کیسے پیدا ہوئی؟ یہ اردو کی پیدائش کے لسانی عمل (Linguistic process) کی جانب اشارہ ہے۔ مسعود حسین خاں نے 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' میں اس گتھی کو بھی سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اردو کی پیدائش دراصل شمالی ہند میں رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ اردو کا تعلق چونکہ ہند آریائی خاندانِ السنہ سے ہے، لہٰذا مسعود صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''اردو زبان کی تاریخ وسیع تر معنوں میں ہند آریائی کی تاریخ ہے جسے قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہند آریائی لسانی تبدیلی کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد جب اپ بھرنش یعنی وسطی ہند آریائی کے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو اس میں 'نکھار' پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہی نکھار دراصل اردو کا 'ابھار' ہے۔ اپ بھرنش کے آخری دور کے نمونوں میں اردو کے ابتدائی نقوش کی جھلک صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ نمونے مشہور جین عالم ہیم چندر (1088-1172ء) کی قواعد 'ہیم چندر شبد انوشاسن' میں نقل شدہ دوہوں پر مشتمل ہیں جن میں سے ایک دوہا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بھلا ہُوا جُ ماریا، بہنی مہارا کنت/
لجّے جّام تُ وَ سِیاہ، جَی بھگّا گھرُ اِنت

[= بھلا ہوا بہن جو میرا کنت (= پیارا، سوامی، شوہر) مارا گیا، جو بھاگا گھر آتا تو ویاس پاؤں (ہم عمر سہیلیوں) میں مجھے لاج آتی۔'']

بقول مسعود حسین خاں:

''اس دوہے کا پورا کینڈا قدیم کھڑی [بولی] کا ہے جس کے قواعد کی کئی شکلیں اس میں دیکھی جاسکتی ہیں۔'' (ایضاً، ص 73)

اپ بھرنش کے آخری دور کے کچھ نمونے اس دور کی طویل رزمیہ نظموں میں بھی ملتے ہیں جنھیں ''راسو'' کہتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور ''پرتھوی راج راسو'' ہے جس کا مصنف چندر بردائی ہے۔ راسو کے علاوہ اپ بھرنش کے آخری دور کے کچھ ادبی نمونے بدھ سدھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے بھی منسوب ہیں۔ اپ بھرنش کے ان تمام ادبی نمونوں میں مسعود

صاحب نے اردو کے کھڑی بولی روپ کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً:

(1) قدیم اردو کی ماضی کی شکلیں: کہیا، پوچھیا، ماریا، بوجھیا وغیرہ۔

(2) صفتیں (جو آ پر ختم ہوتی ہیں): بھلا (بھلا) وغیرہ۔

(3) ضمیریں (جو آ پر ختم ہوتی ہیں) مہارا (میرا) وغیرہ۔

(4) افعال کی مستقبل کی شکلیں: ہووے گا، دیوے گا، آویں گے، وغیرہ۔

(5) حروف: جو، سو، جاب (جب تک)، تاب (تب تک) وغیرہ۔

مسعود حسین خاں اردو کو محض ایک 'کھچڑی' یا 'ملواں' زبان تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اردو محض دو زبانوں کا باہم اختلاط یا 'خلاملا' بھی نہیں، بلکہ اردو کی ایک اساس ہے، جس سے اس کی تشکیل ہوئی ہے اور ارتقا عمل میں آیا ہے۔ اس کی ایک بنیاد ہے جس پر اس کا ڈھانچا تیار ہوا ہے۔ اردو کی تہ میں جو زبان یا بولی ہے اس کا پتا لگانے کے لیے مسعود صاحب نے پوری کوشش کی ہے اور وہ اپنے مقصد میں بیحد کامیاب رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، مسعود صاحب کی تحقیق کے مطابق اردو کا بنیادی ڈھانچا یا کینڈا کھڑی بولی کا ہے اور یہی اس زبان کی اصل و اساس ہے، ہر چند کہ قدیم دور میں اس پر ہریانوی کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ لسانیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ زبان اپنی اصل و اساس، اپنی ساخت و بنیاد نیز اپنے اصول قواعد سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ اپنے سرمایۂ الفاظ سے۔ کسی زبان میں غیر زبانوں کے الفاظ کی موجودگی سے اس زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اردو کی پیدائش پر غور کرتے وقت مسعود صاحب کی نظر اردو کے سرمایۂ الفاظ سے قطع نظر، اس کی اصل و اساس، اس کے اجزائے ترکیبی، اس کے اصول و قواعد اور اس کے بنیادی ڈھانچے یا کینڈے پر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو کی پیدائش کا نہ تو مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور نہ اسے کھچڑی زبان تصور کرتے ہیں بلکہ ''دہلی و پیرامنش''، یعنی دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں کے لسانی تجزیے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ:

''قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔'' (ایضاً، ص 236)

شمالی ہند میں کھڑی بولی کے ادبی نمونوں کا فقدان ہے۔ بقولِ مسعود حسین خاں:

''شمالی ہند میں بجز امیر خسرو کی غیر مستند ہندی شاعری، صوفیائے کرام کے ملفوظات میں جا بجا بکھرے ہوئے ہندی کے فقرے اور فارسی فرہنگوں میں ہندی نژاد الفاظ کے سوا محمد افضل افضل (متوفی 1625ء) کی 'بکٹ کہانی' (بارہ ماسہ) تک کوئی مسلسل اور وافر نمونہ نظم و نثر کا نہیں ملتا۔''

(ایضاً،ص 248)

کھڑی بولی میں ادبی نمونے اس وقت سے ملنا شروع ہوتے ہیں جب یہ زبان دکن پہنچتی ہے۔ چنانچہ مسعود صاحب لکھتے ہیں:

''کھڑی بولی کے ادبی نمونے اردو کی شکل میں اور اردو رسم خط میں سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں۔ فخر دین نظامی بیدری کی تصنیف ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' (1421ء اور 1435ء کے درمیان) اس کا پہلا نقش ہے۔''

(ایضاً،ص 248)

مسعود حسین خاں کے تتبع میں گیان چند جین بھی کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیتے ہیں اور اردو کے پنجابی سے نکلنے کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔ کھڑی بولی دہلی اور مغربی یوپی کی بولی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ یہ پنجاب کی زبان پنجابی کی اولاد ہے۔ اگر کھڑی بولی پنجابی سے نہیں نکلی تو اردو بھی پنجابی سے نہیں نکلی۔'' (''اردو کے آغاز کے نظریے''، مطبوعہ 'ہندوستانی زبان'، بمبئی، نمبر 4-3، بابت جولائی تا اکتوبر 1977ء)

مسعود حسین خاں کی گراں مایہ تحقیقی تصنیف 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' کے مطالعہ سے ہمیں ان تینوں سوالوں کے جوابات مل جاتے ہیں کہ اردو کب پیدا ہوئی، کہاں پیدا ہوئی اور کیسے پیدا ہوئی؟

اردو کے آغاز و ارتقا اور اس کی سلسلہ وار تاریخ کو پیشِ نظر رکھ کر تاریخی و تقابلی

لسانیات کی روشنی میں تحقیقی نقطۂ نظر سے لکھی گئی یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کی ہم پایہ کوئی دوسری تصنیف تا حال منظرِ عام پر نہ آ سکی۔

کتابیات

1- بیگ، مرزا خلیل احمد، 'اردو کی لسانی تشکیل' چوتھا ایڈیشن، ری پرنٹ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2011ء)۔

2- بیگ، مرزا خلیل احمد (مرتب)، 'اردو زبان کی تاریخ'، ری پرنٹ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2007ء)، پہلا ایڈیشن، 1995ء۔

3- جین، گیان چند، 'لسانی مطالعے' (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 1973ء)۔

4- خاں، مسعود حسین، 'مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو'، ساتواں ایڈیشن، 1987ء)۔

5- خاں، مسعود حسین، ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ''، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ۔

6- شیرانی، محمود خاں، 'پنجاب میں اردو' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1970ء)، پہلا ایڈیشن 1928ء)۔

●●●

گیان چند جین اور اسلوبیاتی نظریۂ تنقید

گیان چند جین (1923-2007ء) کا شمار اردو کے نہایت اہم اور معتبر محققین میں ہوتا ہے۔ ان کی تحقیق کے دو پہلو ہیں: ادبی تحقیق اور لسانیاتی تحقیق۔ جین صاحب بنیادی طور پر ادبی محقق ہیں، لیکن چونکہ انھوں نے لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی، اس لیے لسانیاتی مسائل و مباحث پر بھی ان کی نظر بہت گہری تھی اور لسانیاتی تحقیق سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ ان کی ادبی تحقیق قدیم شعروادب، غالب و اقبال، تدوینِ متن، دکنیات اور تاریخِ ادبِ اردو کا احاطہ کرتی ہے، اور لسانیاتی تحقیق، صوتیات، رسم خط، اردو کے آغاز وارتقا کے مسائل اور دیگر لسانی موضوعات پر اظہارِ خیال اور چھان بین سے عبارت ہے۔

جین صاحب تحقیقی مسائل و موضوعات پر گذشتہ کئی دہوں سے مسلسل لکھتے آرہے تھے۔ ان کا سب سے پہلا تحقیقی کارنامہ 'اردو کی نثری داستانیں' 1954ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے چھوٹے بڑے کئی علمی و تحقیقی معرکے سر کیے اور نہایت محنت اور لگن کے ساتھ مسلسل کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو محققین کی صفِ اوّل میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی تھی۔

'پرکھ اور پہچان' گیان چند جین کے تحقیقی نوعیت کے ادبی و لسانی مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے 1990ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل تیس مضامین شامل ہیں جو اس سے پہلے مختلف کتب و رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

'پرکھ اور پہچان' میں ادبی موشگافیاں بھی ہیں اور لسانی بحثیں بھی۔ بعض مضامین میں انھوں نے ہم عصر محققین کے تحقیقی کارناموں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے بعض اکابرینِ ادب سے اپنے ذاتی مراسم کا ذکر کیا ہے اور بہ سبیلِ تذکرہ بعض تحقیقی مسائل بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ بعض مضامین خالص تحقیقی نوعیت کے ہیں اور بعض محض فرمائشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ الغرض اس مجموعۂ مضامین میں ہر مذاق کی چیز موجود ہے۔

یہاں میرا مقصد گیان چند جین کی کتاب 'پرکھ اور پہچان' کے ایک مضمون ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر'' کا جائزہ پیش کرنا ہے۔ یہ مضمون سب سے پہلے ماہنامہ 'نیا دور' (لکھنؤ) کے اکتوبر 1984ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا جس کا میں نے بھرپور جواب اپنے ایک خط نما مضمون کے ذریعے دیا تھا جو اسی رسالے میں اپریل تا نومبر 1986ء کی اشاعت میں ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ اس مضمون کا عنوان میں نے ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک ترچھی نظر'' رکھا لیکن بعد میں خیال آیا کہ اس کا عنوان ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک ٹیڑھی نظر'' ہونا چاہیے تھا۔

جین صاحب کا متذکرہ مضمون میں نے نہایت توجہ سے پڑھا تھا۔ اس امر سے بیحد خوشی ہوئی تھی کہ انھوں نے میری ادنیٰ کاوش 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' (1983ء) کو لائقِ اعتنا سمجھا اور اپنے اس متذکرہ مضمون میں اس کا بہ طورِ خاص ذکر کیا اور اس کے مواد و موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا۔ لیکن مضمون کو پڑھ کر میرے ذہن پر جو تاثر قائم ہوا وہ یہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر واضح نہیں ہے بلکہ اسے اگر تنقیصی نقطۂ نظر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ بات مجھے نہایت غیر متوقع معلوم ہوئی اور مجھے سخت تعجب بھی ہوا، کیونکہ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ جین صاحب نے پونا کے لسانیات کے سَمر اسکولوں میں لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ لسانیاتی موضوعات پر اردو میں کتابیں لکھی تھیں اور لسانیاتی مسائل و مباحث میں برابر دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ لہٰذا مجھے جین صاحب سے یہ توقع تھی کہ وہ ادب پر لسانیات کے اطلاق کو بجا قرار دیں گے اور اردو میں اسلوبیات سے متعلق جو کاوشیں ہو رہی ہیں

انھیں بہ نظرِ تحسین دیکھیں گے، لیکن ان کے متذکرہ مضمون کو پڑھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادب پر لسانیات کا اطلاق ابھی اپنے 'عہدِ طفولیت' میں ہے اور اردو میں تو ابھی اس کی صرف ابتدا ہی ہوئی ہے۔ اس کا دائرہ اور اس کی جہات و ابعاد ابھی کافی محدود ہیں اور اس موضوع پر لکھنے والے بھی ابھی صرف چند ہیں۔ لہٰذا اس شعبۂ علم سے ابھی سے بہت ساری توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں، لیکن نہایت وثوق کے ساتھ یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ اسلوبیاتی تنقید کے امکانات اردو میں کافی روشن ہیں اور جیسے جیسے لسانیات کا علم ترقی کرتا جائے گا اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

اس امر کا ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا کہ زبان لسانیات کا مواد و موضوع (Subject-matter) ہے اور یہی زبان ادب کا ذریعۂ اظہار (Medium) بھی ہے لہٰذا لسانیات اور ادب کے درمیان گہرے اور مضبوط رشتے کا پایا جانا امرِ لازمی ہے۔ ادب کے لسانیاتی مطالعے ہی کا نام 'اسلوبیات' ہے۔ اس طرح ایک طرف اسلوبیات کا تعلق لسانیات سے ہے تو دوسری طرف ادب سے بھی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح زبان کا تعلق ایک طرف لسانیات سے ہے تو دوسری طرف ادب سے بھی اس کا رشتہ استوار ہے۔

اطلاقی لسانیات کے شعبے اسلوبیات کو اردو میں فروغ دینے کا مقصد اردو تنقید کو بین العلومی (Interdisciplinary) بنانا بھی ہے۔ موجودہ اردو تنقید، نفسیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، انسانیات، لسانیات اور دیگر سماجی علوم کا سہارا لے کر ہی بین علومی بن سکتی ہے۔ اس ضمن میں لسانیات دیگر سماجی علوم کے مقابلے میں تنقید کی کچھ زیادہ ہی خدمت انجام دے سکتی ہے کیوں کہ ادب اور زبان یا ادب اور لسانیات کے درمیان جو گہرا، مضبوط اور ٹھوس رشتہ پایا جاتا ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تنقید جب نفسیات، فلسفہ، سماجیات اور تاریخ جیسے علوم سے مدد لے سکتی ہے تو لسانیات سے کیوں نہیں لے سکتی، جبکہ ادب اور لسانیات کے درمیان نہایت گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔

میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اسلوبیات، ادبی تنقید کا ہرگز بدل نہیں۔ کسی بھی اسلوبیاتی نقاد

نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے۔ ادبی تنقید کی اپنی اہمیت و حیثیت مسلّم ہے۔ اسلوبیاتی تنقید ادبی تنقید کو کبھی Replace نہیں کر سکتی اور نہ اس کا متبادل قرار پا سکتی ہے، اور نہ ہی اسلوبیاتی تنقید کا یہ مقصد ہے۔

اسلوبیاتی تنقید تو مطالعۂ ادب کے صرف ایک گوشے کو اپنے دائرۂ کار میں لاتی ہے اور وہ ہے ادب میں زبان کا استعمال۔ ادب میں زبان کے جمالیاتی اور تخلیقی استعمال کو Explore کرنا ہی اسلوبیات کا مقصد ہے۔ ادب میں زبان کے استعمال سے متعلق جتنی بھی باتیں ہو سکتی ہیں اسلوبیاتی تنقید ان کا احاطہ کرتی ہے۔

اسلوبیاتی تنقید کا بنیادی مقصد ادب میں زبان کے استعمال کا مطالعہ یا مطالعۂ اسلوب ہے، جب کہ ادبی تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں اسلوب کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو مطالعے کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، مطالعۂ اسلوب اور ادبی زبان کے تجزیہ و تحلیل کا ہی دوسرا نام 'اسلوبیات' ہے۔ اسلوبیاتی نقاد کا طریق کار معروضی ہوتا ہے اور معروضی طریقِ کار اختیار کرنے کے لیے ناپ تول اور گنتی تو بہر حال ضروری ہے۔ اسی لیے اسلوبیاتی تنقید میں آوازوں کا گننا یا زبان کے استعمال اور اس کے تجزیہ و تحلیل سے متعلق دوسرے اعداد و شمار اکٹھا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ تو یہ مطالعہ معروضی ہو سکتا ہے اور نہ سائنسی۔ ورنہ اگر بات صرف اندازے سے کہی جائے یا محض تخیل اور تاثرات کی بنیاد پر رائے قائم کی جائے تو وہ تنقید تاثراتی تنقید ہوگی، معروضی یا سائنسی تنقید کسی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اسلوبیاتی تنقید معروضی تنقید ہے اور اس تعلق سے سائنسی تنقید بھی۔

کچھ لوگ اسلوبیاتی تنقید کے پیچھے بلاوجہ پڑے رہتے ہیں اور اسلوبیاتی نظریۂ تنقید سے خواہ مخواہ چڑتے ہیں۔ معروف اردو ناقد اور ماہرِ اسلوبیات گوپی چند نارنگ نے ذیل کی تحریر میں ایسے لوگوں کے لیے ایک بڑی پر لطف بات کہی تھی جس کا ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا:

> "اردو میں اسلوبیات اب بعض لوگوں کی چڑ بننے لگی ہے۔ اس سے اتنی بات تو ثابت ہے کہ اردو میں اسلوبیات اپنے وجود کی شناخت کرا رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ کشادہ ذہن لوگ ہیں جو اس باخبری کی قدر کرتے ہیں جو

اسلوبیات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور جو جانتے ہیں کہ جس طرح تنقید، فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور عمرانیات سے مدد لیتی ہے اسی طرح لسانیات اور اسلوبیات سے بھی مدد لے سکتی ہے۔ کیونکہ تنقید کی تجزیاتی بنیادیں تو اسلوبیات ہی کی مدد سے حتمی طور پر سامنے آسکتی ہیں۔ دوسری طرف وہ تنگ ذہن لوگ ہیں جو علوم کے نئے آفاق سے ناواقفِ محض ہونے کی وجہ سے اپنے جہل پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں یا ان کو یہ خوف ہے کہ اسلوبیات کے چلن سے ان کی چودھراہٹ ختم ہو جائے گی یا تنقید کی دنیا میں وہ از کار رفتہ ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ اسلوبیات کے خلاف مسلسل کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتے رہتے ہیں۔'' (بہ حوالہ ماہنامہ 'سبقِ اردو'، شمارہ 38، بابت مئی 2016ء)

مجھے یاد آتا ہے کہ جین صاحب نے اپنی تصنیف 'لسانی مطالعے' میں کہیں یہ لکھا ہے کہ اردو میں لسانیات، ہندی میں لسانیات کے فروغ سے تقریباً تیس سال پیچھے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ ارشاد بہت حد تک بجا ہے، لیکن اسلوبیاتی تنقید پر اگر اسی قسم کے اعتراضات ہوتے رہے تو میرے خیال میں اردو میں اسلوبیات اور اسلوبیاتی تنقید، ہندی میں اسلوبیاتی تنقید سے تقریباً پچاس برس پیچھے رہ جائے گی۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اگرچہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کا آغاز آج سے تقریباً نصف صدی قبل مسعود حسین خاں کے مضامین و مقالات سے ہوا تھا، لیکن گذشتہ چند دہوں کے عرصے میں اس شعبۂ علم سے صرف چند لکھنے والے ہی وابستہ ہو سکے ہیں اور ان کا سرمایہ بھی چند مضامین اور ایک آدھ کتاب تک ہی محدود ہے۔ اردو میں یہ صورتِ حال بڑی حد تک غیر اطمینان بخش ہے۔ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کی بات کیوں کیجیے اور دور کیوں جایئے، خود آج ہندی میں سور کی بھاشا، تلسی کی بھاشا، پریم چند کی بھاشا اور دیگر مصنفین کی زبان و اسلوب پر موٹی موٹی کتابیں لائبریریوں کی شلف میں لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس وقت ہمیں اپنی کم مائیگی کا بری طرح احساس ہوتا ہے۔ کیا کسی اردو والے نے میرؔ کی زبان، غالبؔ کی زبان، پریم چند کی زبان یا کسی اور ادیب و شاعر کی زبان و اسلوب کا تفصیلی مطالعہ اسی ژرف بینی اور دقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے جس طرح ہندی والوں نے اپنے شاعروں

اور ادیبوں کا کیا ہے۔ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

ایک آخری بات اور عرض کرنا چاہوں گا۔ راقم الحروف نے یا ان تمام اسلوبیاتی نقادوں نے جن کا ذکر جین صاحب نے اپنے عالمانہ مضمون میں کیا ہے، حوالے کے طور پر اشعار معتبر اور مستند شعراء مثلاً میر، غالب، اقبال، انیس، سودا، فانی، فیض وغیرہ کے کلام سے پیش کیے ہیں۔ لیکن جین صاحب نے اپنے متذکرہ مضمون میں حوالے کے طور پر اشعار یا تو خود موزوں کر کے (بلکہ گھڑ کے) پیش کیے ہیں یا معمولی اور تیسرے درجے کے گھٹیا شاعروں کے اشعار پیش کیے ہیں۔ یہ بات جین صاحب کو کسی بھی طرح زیب نہیں دیتی۔ انھیں ہمارے (یعنی اسلوبیاتی نقادوں) کے دعووں کی تردید میں اشعار انہی شعرا کے کلام سے پیش کرنا چاہیے تھے جن شعراء کے کلام سے اسلوبیاتی نقادوں نے پیش کیے ہیں، یعنی میر، غالب، اقبال، فیض، فانی وغیرہ۔ تبھی کچھ بات بنتی ہوئی نظر آسکتی تھی ورنہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ جین صاحب کا ایک ''خود ساختہ'' مصرعہ ملاحظہ کیجیے:

اَہاہا، اَہاہا، اُہوہو، اُہوہو

یہ بھلا کہاں کی شاعری ہے!

کاش کہ اپنے دعوے کی دلیل میں جین صاحب نے مذکورہ نوع کے اشعار پیش کرنے کے بجائے متذکرہ مستند اور کلاسیکی شعراء کے کلام سے مثالیں پیش کی ہوتیں۔ لیکن انھوں نے اپنے دعوے کی دلیل کے لیے اشعار یا تو خود گھڑے یا ان اشعار کا سہارا لیا جو تیسرے درجے کے شعراء کے گھٹیا اور پوچ اشعار ہیں۔ بعض مقامات پر تو انھوں نے حد کر دی کہ مثالیں فلمی گانوں سے پیش کر دیں۔ ایک علمی مضمون میں فلمی گانوں کا بھلا کیا جواز ہو سکتا ہے!

'نیا دور' (لکھنؤ) کی اپریل تا نومبر 1986ء کی اشاعت میں گیان چند جین کے مضمون ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر'' کے جواب میں جب میرا مضمون چھپا تو اسی شمارے میں صفحہ 7 تا 9 پر جین صاحب کا جواب الجواب بہ عنوان ''اسلوبیاتی تنقید پر دوسری نظر'' بھی شائع ہوا جس کی ابتدائی چند سطریں یہ ہیں:

''اکتوبر 1984ء کے 'نیا دور' میں میرا مضمون ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر'' شائع ہوا۔ اس پر مجھے چار حضرات کے ردِ عمل موصول ہوئے: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ حد سے زیادہ خفا ہوئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے لکھا: ''مضمون مجھے اس قدر اہم معلوم ہوا کہ میں نے اس کا تراشا رکھ لیا ہے۔'' ڈاکٹر سید محمد عقیل نے بھی نفسِ مضمون سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے جواب میں ایڈیٹر 'نیا دور' کے نام مراسلہ لکھ کر مجھے بھیج دیا۔ میں نے خوشی خوشی اس کی اشاعت کی اجازت دی اور اپنی صفائی میں ایک مختصر تحریر لکھنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے نہ صرف اجازت دی بلکہ مجھی سے کہا کہ میں ان کا مراسلہ ایڈیٹر 'نیا دور' کو بھیج دوں۔''

گیان چند جین نے اپنے اس جواب کا خلاصہ اپنی کتاب 'پرکھ اور پہچان' میں شامل اپنے مضمون ''اسلوبیاتی تنقید پر ایک نظر'' کے تتمے کے طور پر درج کیا ہے جو من و عن یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''میری بنیادی Thesis یہ تھی کہ مفرد آوازوں کا کوئی معینہ مزاج نہیں ہوتا۔ میں نے ان مفروضہ خصوصیات کے برعکس مثالیں دے کر ثابت کر دیا۔ اپنے مراسلے میں ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اس مرکزی نکتے کی تردید نہیں کی۔ کہا گیا تھا کہ طویل مصوتے اور 'ھ' حزنیت کے امین ہیں، لیکن اگر 'ہائے، آہ' حزنیہ ہیں تو 'واہ اور اہاہا' نشاطیہ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مفرد آوازوں کا کوئی مزاج نہیں ہوتا۔'' ('پرکھ اور پہچان'، ص 28)۔

کتابیات

1- بیگ، مرزا خلیل احمد، 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات'، دوسرا ایڈیشن (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2011ء)۔

2- بیگ، مرزا خلیل احمد، 'اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2014ء)۔

3- جین، گیان چند، 'پہچان اور پرکھ' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1990ء)۔

4- خاں، مسعود حسین، 'لسانیاتی اسلوبیات'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2019ء)۔

5- نارنگ، گوپی چند، 'ادبی تنقید اور اسلوبیات' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1989ء)۔

6- ماہنامہ 'سبق اردو' (مدیر: دانش الٰہ آبادی)، شمارہ 38، بابت مئی 2016ء۔

•••

امرت رائے اور ہندی-اردو کا مسئلہ

منشی پریم چند کے بیٹے اور ہندی کے نامور ادیب و انشا پرداز امرت رائے (1921-1996ء) سے بھلا کون واقف نہ ہوگا۔ ان کی کتاب 'پریم چند: قلم کا سپاہی' جو منشی پریم چند کی معتبر سوانح عمری ہے، اردو میں اسی طرح مقبول ہے جس طرح کہ ہندی میں۔ امرت رائے تمام عمر نہ صرف ادبی موضوعات پر غور و فکر کرتے اور لکھتے رہے، بلکہ لسانی مسائل سے بھی ان کی دلچسپی برقرار رہی جس کا بین ثبوت ان کی حالیہ تصنیف *A House Divided: The Origin and Development of Hindi/Hindavi* ہے۔ یہ کتاب پہلی بار اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی سے 1984ء میں شائع ہوئی۔ سات سال بعد، 1991ء میں، یہ کتاب دوسری بار بھی اسی پریس سے شائع ہوئی، لیکن اس بار اس کے نام میں معمولی سی تبدیلی کی گئی، لیکن متن جوں کا توں رہا۔ دوسری بار یہ کتاب *A House Divided: The Origin and Development of Hindi-Urdu* کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نام *A House Divided* (=گھر جو تقسیم ہوگیا) سے اس بات کا ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کتاب اردو اور ہندی کے آغاز و ارتقا کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کو اس کا ذیلی عنوان *The Origin and Development of Hindi-Urdu* تجویز کرنا پڑا۔ مصنف کے خیال میں یہ اس کتاب کا زیادہ ''صحیح اور موزوں'' نام ہے۔ ''گھر جو تقسیم ہوگیا'' کا فقرہ استعارتاً (Metaphorically) استعمال کیا گیا ہے

جس سے مصنف کی مراد ایک زبان کی دو زبانوں یعنی ہندی اور اردو میں تقسیم ہے، جس کی ذمہ داری اس نے اہلِ اردو پر ڈالی ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اس کتاب کی تسوید و ترتیب کے کام کو امرت رائے نے منصوبہ بند طریقے سے ایک پروجیکٹ کے طور پر انجام دیا ہے، جس کے لیے انھیں ایک سرکاری تنظیم 'جواہر لعل نہرو میموریل فنڈ' کے تحت دو سال کے لیے خطیر مالی امداد پر مشتمل فیلوشپ جسے 'جواہر لعل نہرو فیلوشپ' کہتے ہیں تفویض ہوئی تھی۔ اس کتاب کو قلم بند کرنے کے دوران میں سنیتی کمار چٹرجی (1977-1880ء) نے امرت رائے کی صمیم قلب سے حوصلہ افزائی کی۔ یہ وہی چٹرجی ہیں جو اپنی کتاب *Indo-Aryan and Hindi* میں اردو کے خلاف بہت کچھ لکھ گئے ہیں۔ چٹرجی کا معاملہ تو محض حوصلہ افزائی تک ہی محدود رہا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ امرت رائے کو ان کی متذکرہ کتاب کی تیاری میں اردو کے معروف محقق اور استاد گیان چند جین (2007-1923ء) نے بھرپور علمی مدد پہنچائی۔ اس کتاب میں امرت رائے نے اردو کے خلاف جو کچھ بھی لکھا ہے اس کے بارے میں مواد و معلومات گیان چند جین ہی سے انھیں حاصل ہوئیں۔ گیان چند جین اگرچہ اردو کے عالم ہیں اور ان کا شمار صفِ اول کے محققین میں ہوتا ہے، لیکن اپنی فرقہ وارانہ آئیڈیالوجی کی وجہ سے وہ اردو سے درپردہ عناد (Inner hatred) رکھتے تھے۔ اردو سے ان کی یہ نفرت آخرِ عمر میں لکھی ہوئی ان کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (2005ء) میں پھوٹ پڑی جس پر اہلِ اردو نے اپنے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔

امرت رائے اپنی متذکرہ کتاب میں گیان چند جین کے علمی تعاون کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

> "For the Urdu part of my study, I depend wholly on well-known Urdu scholar Gyan Chand Jain". (See "Acknowledgments")

جس زمانے میں امرت رائے الٰہ آباد میں بیٹھ کر اپنی یہ کتاب لکھ رہے تھے، اسی زمانے میں گیان چند جین بھی الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد

میں سکونت پذیر تھے۔ امرت رائے اور گیان چند جین کا آپس میں برابر ملنا جلنا رہتا تھا۔ اس زمانے میں گیان چند جین نے امرت رائے کو کتاب لکھنے میں بھرپور تعاون دیا اور ان کی ہر ممکن مدد کی، چنانچہ امرت رائے اسی "Acknowledgments" میں ان کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> "He [Gyan Chand Jain] generously helped me with books journals, ideas and all manner of dependable information on the subject. My discussions with him were extremely fruitful...My cordial thanks to him."
>
> (=انھوں نے [گیان چند جین نے] فراخدلی سے میری مدد کی۔ مجھے کتابیں اور رسالے فراہم کیے اور اپنے خیالات سے نوازا، اور موضوع سے متعلق ہر طرح سے تمام قابلِ اعتماد معلومات مجھے بہم پہنچائیں۔ ان سے میری گفتگو انتہائی نتیجہ خیز ہوتی تھی... میں تہ دل سے ان کا ممنون ہوں۔"

امرت رائے اور گیان چند جین کے درمیان دوستی کے اس رشتے کو بیان کرنے کا میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ امرت رائے نے اپنی متذکرہ کتاب میں اردو کے خلاف جو معاندانہ رویہ اختیار کیا، اس کے پسِ پردہ گیان چند جین ہی ہیں، اور اس سلسلے میں انھی کا تخریبی ذہن کام کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امرت رائے نے یہ کتاب نہایت دقتِ نظر اور کاوش کے ساتھ لکھی ہے اور متعلقہ موضوع سے متعلق تمام اہم مصنفین اور ماہرینِ لسانیات کے اقوال و نظریات اکٹھا کر دیے ہیں اور قدیم متون کے حوالے بھی دیے ہیں اور مثالیں بھی پیش کی ہیں، لیکن ان سب سے انھوں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ کافی حد تک جانبدارانہ اور متعصبانہ ہیں، چنانچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امرت رائے کی اس کتاب میں گیان چند جین کے اردو مخالف نظریات کی پوری چھاپ موجود ہے جس کو انھوں نے [گیان چند جین نے] بیس سال بعد اپنی متنازع فیہ کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں پوری طرح آشکار (Unfold) کر دیا۔

(2)

امرت رائے کی متذکرہ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد راقم السطور جن نتائج پر پہنچا ہے وہ یہ ہیں کہ مصنف نے اردو اور ہندی کے آغاز وارتقا کی صحیح اور سچی تصویر پیش نہیں کی ہے، اس نے جانب داری سے کام لیتے ہوئے اپنا سارا زور اردو پر ہندی کے تقدمِ زمانی کو ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے، نیز وہ اردو کے جائز آئینی حقوق پر بھی معترض ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امرت رائے نے یہ کتاب ایک خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے بارے میں ان کی نیت قطعی صاف نہیں ہے اور وہ لسانی عصبیت کا بری طرح شکار ہیں، اور علمی سطح پر اردو کے خلاف ایک فضا بنانا چاہتے تھے۔ امرت رائے نے اس کتاب میں ایک طرف تو اردو کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور اس پر علیٰحدگی پسندی کا بے جا اور بے بنیاد الزام لگایا ہے اور دوسری جانب اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ اردو کو ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈیول میں کیوں کر جگہ دی گئی۔ یہی نہیں، بلکہ اردو کو آئندہ علاقائی حیثیت دیے جانے پر بھی انھوں نے کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اردو کو مستقبل میں علاقائی زبان کی حیثیت دی گئی تو یہ اقدام ملک کے قومی مفاد کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوگا، کیونکہ اپنے غیر سیکولر کردار اور شدید مذہبی جذبے کی بنا پر یہ زبان (اردو) سیکولرزم اور قومی یک جہتی کے خلاف کام کرے گی۔ (دیکھیے کتابِ مذکورہ کے صفحات 1 تا 35 اور 285 تا 289)۔

غرض کہ یہ کتاب متعصّبانہ نظریات سے پُر ہے اور اس میں اردو کے خلاف کافی زہر افشانی کی گئی ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ اہلِ اردو کی توجہ اب تک اس کتاب کی جانب کیوں مبذول نہیں ہوئی، اور امرت رائے کی اس لسانی ہرزہ گوئی کے خلاف اب تک کوئی صدائے احتجاج کیوں بلند نہیں ہوئی؟

امرت رائے نے اصل کتاب میں ہندی/ہندوی کی ابتدا اور ارتقا کو مطالعے کا موضوع بنایا ہے، اور ان وجوہات کی نشاندہی کی ہے جن کے باعث یہ زبان دو الگ الگ

حصوں میں تقسیم ہوگئی، اور 'جدید ہندی' اور 'جدید اردو' کہلائی۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ امرت رائے نے ہندوی کی اصطلاح قدیم مفہوم میں استعمال کی ہے، لیکن انھیں اس حقیقت سے انکار ہے کہ ہندوی/ ہندی دراصل قدیم الایام میں اردو ہی تھی، اگرچہ اس کا یہ نام (یعنی اردو) بہت بعد میں پڑا۔ وہ ہندوی/ ہندی کو 'اردو' تسلیم نہیں کرتے، اور اردو کو ولی دکنی (1667-1707ء) کے بعد کی اختراع بتاتے ہیں، نیز 'لسانی پھوٹ' اور 'علیٰحدگی پسندی' کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ہندوی/ ہندی کو اردو تسلیم نہ کرنے میں ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہندی (دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی جدید کھڑی بولی ہندی) کی لسانی تاریخ کو کھینچ تان کر چھے سو سال پیچھے لے جاتے ہیں اور اردو (جو بارھویں صدی عیسوی کے آس پاس شمالی ہند میں ارتقا پذیر ہوئی) کی عمر چھے سو سال گھٹا دیتے ہیں، اور ہندی (کھڑی بولی ہندی) پر جو الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ حال کی پیداوار ہے، اسے وہ دھوڈالنا چاہتے ہیں اور آناً فاناً اردو کے تمام تر قدیم ادبی سرمایے کو، جس میں دکنی اردو ادب بھی شامل ہے، ہڑپ کر جاتے ہیں اور اسے ہندی (جدید ہندی زبان) کی تاریخ کا جزوِ لاینفک قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظر میں، اردو پر ہندی کی لسانی قدامت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور برتری بھی۔ اور اردو بے چاری ایک کوتاہ عمر، کم مایہ اور بے وقعت زبان بن کر رہ جاتی ہے۔

متذکرہ کتاب کے 'تعارف' (Introduction) میں امرت رائے نے ''ہندی/ ہندوی'' کا ذکر تو کیا ہے، لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اسی زبان کے قدیم نام ہیں جس کا نام بعد میں 'اردو' پڑا۔ اس لسانی حقیقت کی پردہ پوشی سے عام قاری کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ یہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی جدید ہندی کے قدیم نام ہیں، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

عام قاری کو ہندی/ ہندوی سے بادی النظر میں یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی جدید ہندی ہے جو 'کھڑی بولی ہندی' کہلاتی ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ امیر خسرو نے اپنی جس 'ہندی' شاعری کا حوالہ دیا ہے، نیز مسعود سعد سلمان کے جس 'ہندوی' کلام کا ذکر کیا ہے یا محمد عوفی (1171-1242ء) نے اپنے تذکرے 'لباب الباب'

(1227/28ء) میں مسعود سعد سلمان کے جس ہندوی دیوان کا ذکر کیا ہے اس سے موجودہ ہندی (جدید کھڑی بولی ہندی) ہرگز مراد نہیں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ امرت رائے نے شروع میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ انھوں نے ہندی/ ہندوی کو قدیم مفہوم میں استعمال کیا ہے لیکن وہ ہر جگہ اس پر کاربند نظر نہیں آتے اور نہ وہ ہر جگہ ہندی کے ساتھ ہندوی استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا قاری کو یہ التباس ہوسکتا ہے کہ 'ہندی' سے مراد موجودہ ہندی ہے اور ہندی سے وہ بعض جگہ خود بھی جدید ہندی مراد لیتے ہیں اور قدیم ہندی کو اس جدید ہندی کی قدیم شکل قرار دیتے ہیں، مثلاً وہ اپنی متذکرہ کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''جدید اُردو قدیم ہندی سے نکلی'' (ص 178)۔ یہاں 'ہندی' کا لفظ 'ہندوی' کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ جدید ہندی کی قدیم شکل کے مفہوم میں برتا گیا ہے۔ قدیم تذکروں اور تصانیف میں 'ہندی' اور 'ہندوی' کا لفظ اُردو ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے کیونکہ موجودہ ہندی کا تو اس وقت کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ اُردو کے لیے اب ہندی کا لفظ قطعاً متروک ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہندی سے اب خالصۃً دیوناگری ہندی ہی مراد لی جاتی ہے۔

امرت رائے 'ہندی' اور 'ہندوی' کو متبادل (Interchangeable) الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں یعنی ہندی اور ہندوی کو وہ ایک سمجھتے ہیں، دوسری طرف وہ ہندی اور اردو کو بھی ایک ہی زبان تسلیم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ابتدائی زمانے میں ہندی اور اُردو ایک ہی زبان تھی'' (ص 56)۔

امرت رائے سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ابتدائی زمانے میں ہندی تھی ہی کہاں؟ امرت رائے اپنے تمام تر مباحث کی بنیاد امیر خسرو کی شاعری، صوفیہ کے ملفوظات و اقوال، دکن کی قدیم اردو تصانیف اور شمالی ہند کے اردو متون، نیز اردو کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا کے کلام پر رکھی ہے اور ان سے جا بجا مثالیں پیش کی ہیں، لیکن کہیں بھی یہ بات کھل کر نہیں کہی ہے کہ یہ تمام تر لسانی سرمایہ اردو رسم الخط میں دستیاب ہوا ہے۔ اس تمام تر اردو سرمایے کی مثالیں انھوں نے دیوناگری رسم خط میں منتقل کر کے پیش کی ہیں۔ (بعض نہایت غلط قرأت کے ساتھ) جس سے ایک عام قاری کے ذہن میں یہ غلط تاثر قائم ہوسکتا

ہے کہ یہ تمام تر سرمایہ ہندی زبان (دیوناگری ہندی) کا ہے اور اردو زبان و رسم خط سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

امرت رائے نے زبان کے ناموں کی بحث کو بہت طولانی بنا کر پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس ہندی/ ہندوی کی تاریخ وہ اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کر رہے ہیں وہ درحقیقت اردو کی تاریخ نہیں ہے، کیونکہ اُردو کا لفظ تو ان کے خیال میں پہلی بار زبان کے مفہوم میں مصحفی کے ہاں اٹھارھویں صدی کے اختتام پر استعمال ہوا ہے۔ میر کے تذکرہ 'نکات الشعراء' میں اور ولی کے ہم عصر سعد اللہ گلشن کے ہاں 'اردوے معلٰی' کے ترکیبی استعمال سے بھی امرت رائے واقف ہیں۔ ان کے خیال میں اُردو کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے اس کا نام اُردو پڑتا ہے اور جب سے اس میں ہندی عناصر کی جگہ عربی فارسی عناصر شامل ہونا شروع ہوتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں تقریباً ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ امرت رائے زبان کی تاریخ کو اس کے نام کی تاریخ کے ساتھ نتھی کرتے ہیں اور اردو کی تاریخ کو اس کے ناموں کے الجھاؤ میں مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ بدیہی حقیقت ہے کہ زبانوں کی تاریخ میں ان کے ناموں کی غیر معمولی اہمیت نہیں ہوتی۔ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ زبان پہلے وجود میں آجاتی ہے، پھر اس کا نام رکھا جاتا ہے یا پڑتا ہے۔ سنسکرت زبان اور اس کے نام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سنسکرت زبان کا ارتقا آریوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد 1500 ق م سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے تقریباً ایک ہزار سال بعد اس زبان کا سب سے بڑا قواعد نویس پانِنی پیدا ہوتا ہے اور 'اشٹا دھیائی' کے نام سے سنسکرت زبان کی قواعد ترتیب دیتا ہے۔ سنسکرت کے عالموں کا اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ اس زبان کا نام 'سنسکرت' پانِنی کے گذر جانے کے بعد رکھا جاتا ہے۔ قدیم ہند آریائی کی پوری ایک ہزار سالہ تاریخ (1500 ق م تا 500 ق م) میں کہیں بھی سنسکرت کا لفظ استعمال زبان کے طور پر نہیں ہوا ہے۔ پانِنی اس زبان کو جس میں اس نے اپنی 'اشٹا دھیائی' لکھی ہے ''بھاشا'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ پانِنی کے بعد پتنجلی گذرا ہے۔ اس نے بھی زبان کے

لیے سنسکرت کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ سنسکرت کا لفظ زبان کے مفہوم میں بہت بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا ہے جب کہ سنسکرت کی ابتدا اور ارتقا کا پورا دور ختم ہو چکا تھا اور ویدک سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ سنسکرت اسکالرز کا خیال ہے کہ پہلے پہل والمیک اور کالیداس نے ''سمسکرت'' کا لفظ صفت کے طور پر 'واچ' (یعنی بولی) کے لیے استعمال کیا ہے مثلاً برہموں کی بولی کو 'سمسکرتا واچم' کہا گیا۔ سنسکرت کا لفظ 'شستہ اور شائستہ' زبان کے مفہوم میں بعد میں استعمال ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ سنسکرت زبان کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے اس کا نام 'سنسکرت' رکھا جاتا ہے۔ پالی کے بارے میں بھی خیال ہے کہ اگرچہ اس کا وجود 500 ق م میں ہوا لیکن اس کا نام 'پالی' انیسویں صدی میں رکھا گیا۔ لہٰذا امرت رائے کا یہ کہنا کہ اردو کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے اس کا نام 'اردو' پڑتا ہے (یا رکھا جاتا ہے) سخت لسانی فریب ہے۔

(3)

ذیل میں امرت رائے کی متذکرہ کتاب سے چند لسانی مباحث پیش کیے جاتے ہیں جن پر اردو اسکالرز کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے:

(1) امرت رائے کا قول ہے کہ امیر خسرو اور دیگر ابتدائی مصنفین (دکنی مصنفین) نے 'ہندی' اور 'ہندوی' کو متبادل ناموں کے طور پر استعمال کیا ہے اور کہیں بھی 'اردو' کا نام نہیں لیا ہے (ص 177)، لیکن میر تقی میر، سعداللہ گلشن، مصحفی اور ان کے بعد کے تمام ادیبوں نے حتیٰ کہ غالب تک نے جب 'ہندی' اور 'اردو' کو متبادل ناموں کے طور پر استعمال کیا تو اس کا کوئی ذکر امرت رائے نے نہیں کیا کیوں کہ یہ تمام مصنفین ہندی سے اردو ہی مراد لیتے تھے اور ہندی اور اردو کو متبادل (Interchangeable) الفاظ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ امیر خسرو اور ابتدائی مصنفین کے یہاں بھی ہندی رہندوی کا استعمال قدیم اردو کے لیے ہی ہوا ہے نہ کہ ہندی (جدید مفہوم میں) کے لیے۔

(2) دکنی زبان کو 'ہندی' کے ساتھ (Identify) کیا گیا ہے، کیونکہ بقول امرت رائے اس زبان کے استعمال کرنے والوں نے خود اس زبان کو 'ہندی' / 'ہندوی' کہا ہے (179)۔ یہاں 'ہندی' سے دوسرا مطلب اخذ کیا گیا ہے اور تمام تر دکنی ادب کو 'جدید ہندی' کا لازمی تسلسل قرار دیا گیا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تمام تر دکنی ادب جو اردو رسم الخط میں تخلیق کیا گیا ہے، قدیم اردو کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اسی ادب کو مختلف ناموں — دکنی، ہندی، گجری (خال خال) سے یاد کیا گیا ہے۔

(3) امرت رائے لکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی کے آخر میں اور چودھویں صدی کی ابتدا میں ہندی سفر کر کے جنوب پہنچی (ص 180)۔ یہاں بھی ہندی کا وہی مطلب لیا گیا ہے یعنی کہ دیوناگری ہندی۔ اس سے نئے ذہنوں میں خلطِ مبحث پیدا ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امرت رائے لفظ 'ہندی' سے موقع بہ موقع غلط اور ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور اردو کے تاریخی وجود کا سرے سے ہی انکار کرتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متذکرہ صدیوں کے دوران میں دہلی سے جو زبان دکن پہنچی وہ معاصر اردو کی قدیم شکل تھی، نہ کہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی۔

(4) دکنی زبان اور ہندی (جدید ہندی) میں صوتیاتی مماثلت دکھائی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں (ص 179 تا 180)۔ دکنی اردو کے اپنے لسانی امتیازات ہیں جن کی وجہ سے وہ شمالی ہند کی اردو سے قدرے مختلف ہو جاتی ہے۔ امرت رائے دکنی کے امتیازات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

(5) دکنی زبان کو ہندی کی بولی (Dialect) بنا کر پیش کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ دکنی بھی ہندی کی دوسری اور بہت سی بولیوں کی طرح ہے جس میں مقامی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں (ص 180)۔ دکنی زبان اردو کی ایک بولی ہے، نہ کہ ہندی کی۔

(6) اردو کو امرت رائے ہندی/ ہندوی (قدیم مفہوم میں) تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اس کے بعد کا ارتقا بتاتے ہیں اور اٹھارھویں صدی کا پہلا ربع اس کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں (ص 181)۔ اس طرح اردو کی تاریخ کو وہ کئی سو سال کم کر دیتے ہیں۔ 'دکنی' کو بھی

وہ اردو تسلیم نہیں کرتے اور جا بہ جا ہندی کی قدامت پر زور دیتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو، ہندی سے چھے سو سال قدیم زبان ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قدیم زبان ہی سے جدید زبان کا ارتقا ہوتا ہے نہ کہ جدید زبان سے قدیم زبان کا۔

(7) دکنی ادب میں ہندی نژاد الفاظ کے استعمال کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے اور اُسے ہندی (جدید ہندی) کا قرب کہا گیا ہے۔ (ص 181 تا 182)

(8) مسعود حسین خاں کے حوالے سے امرت رائے نے لکھا ہے کہ سترھویں صدی کے عشرۂ اوّل تک دکنی اردو زبان اور اسلوب پر ہندی کا گہرا اثر تھا۔ ص 183)۔ اس سے انھوں نے نہایت غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ اثر اردو زبان پر اٹھارھویں صدی کے عشرۂ اوّل تک رہتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں ولی کے دَور تک جب کہ شمالی ہند میں لسانی سرگرمی کا آغاز ہوتا ہے (ص 183)۔ پھر بقول ان کے اردو میں علاحدگی پسندی کے عناصر پیدا ہونے لگتے ہیں اور یہی عناصر جدید اردو کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

(9) امرت رائے نے مسعود حسین خاں کے اس نظریے بلکہ تحقیق کو بھی چیلنج کیا ہے کہ قدیم اردو پر ''جمنا پار کی ہریانی بولی'' کے اثرات ہیں (ص 186)۔ امرت رائے خسرو اور 'بکٹ کہانی' کی زبان کو ایک بتاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں 'بکٹ کہانی' کی زبان خسرو کی زبان کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس زبان سے مختلف ہے۔ اُن کے خیال میں نہ صرف خسرو بلکہ گورکھ پنتھیوں اور ابتدائی زمانے کے صوفیوں کی زبان سے بھی مختلف نہیں ہے۔ ملے جلے لسانی اثرات کے باوجود یہ زبان 'ہندوی' ہی ہے (ص 187)۔ ''چنداین'' اور ''پدماوت'' کی زبان اگرچہ اودھی ہے لیکن وہ اسے بھی ہندوی میں شامل کرنا چاہتے ہیں (ص 187)۔ 'ہندوی' سے ان کی مراد دیوناگری ہندی کی قدیم شکل سے ہے، نہ کہ قدیم اردو سے۔ امرت رائے کا خیال ہے کہ اس ترقی پذیر اور (Composite) زبان کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹنا اور اس پر بولیوں کا

لیبل چسپاں کرنا ایک نہایت من مانا اور غیر سائنسی اقدام ہوگا (ص 188)۔

(10) امیر خسرو (وفات 1325ء) اور محمد افضل (وفات 1625ء) کے درمیان پورے تین سو سال کا زمانی فصل موجود ہے۔ امرت رائے لکھتے ہیں کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس تین سو سال کا سرمایہ شمالی ہند میں صرف یہی چالیس صفحے کی پتلی سی کتاب (' بکٹ کہانی ') ہے جسے اردو والے پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو والوں نے اس دوران (تین سو سال) کے کثیر ہندی/ ہندوی ادبی سرمایے کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھا جو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے نہایت مقتدر ہے (ص 191)۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ اردو والے ہندی [مراد دیوناگری، ہندی] کی لسانی اور ادبی روایات سے آنکھیں چرا جاتے ہیں، اگرچہ ایسے وقت میں جب کہ دونوں زبانوں [ہندی اور اردو] میں افتراق ابھی پیدا نہیں ہوا تھا (ص 188)۔ لیکن امرت رائے نے یہ نہیں بتایا کہ خسرو اور افضل کے درمیان جو تین سو سال کا خلا موجود ہے اس میں 'ہندی (کھڑی بولی ہندی ادب) ادب' کی کون کون سی تصانیف شمالی ہند میں انھیں ہاتھ لگی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا، کیوں کہ کھڑی بولی ہندی کا ارتقا تو اردو کی طرز پر انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور فورٹ ولیم کالج کے للو لال جی کی 'پریم ساگر' (1803ء) اس کھڑی بولی ہندی کا اولین نقش قرار پاتی ہے۔

(11) امرت رائے کے خیال میں افضل کی زبان اُردو والوں کے لیے، اردو کی حیثیت سے اس لیے قابلِ قبول ہے کہ اس میں فارسی ملی ہوئی ہے۔ فارسی سے اردو والوں کی مراد شاید خالص فارسی سے ہے، فارسی نژاد الفاظ سے نہیں، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو نام دیو، کبیر، نانک، دادو، ایکناتھ اور بہت سے دوسرے مصنّفین اردو والوں کے لیے قابلِ قبول ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے (ص 191)۔

(12) ہندی/ ہندوی (قدیم اردو اور قدیم ہندی) کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش سے ہوا ہے لیکن امرت رائے کے خیال میں اردو اسکالرز اردو کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش سے

نہایت مبہم اور غیر واضح انداز میں دکھاتے ہیں۔ ان کے خیال میں اردو والے اس دور کو جب کہ صحیح معنوں میں شورسینی اپ بھرنش جدید ہند آریائی ہندی [دیوناگری ہندی] میں منتقل ہو رہی تھی، بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس سے بعد میں کافی خلطِ مبحث پیدا ہوتا ہے۔

(4)

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امرت رائے نے اردو پر علاحدگی پسندی کا بھی الزام لگایا ہے۔ ان کے خیال میں وہ زبان [ہندی/ ہندوی] جو چھے سو سال تک فروغ پاتی رہی، اس میں دانستہ طور پر 'اصلاح' کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کے سرخیل ولی تھے۔ ولی کا تعلق دکن سے تھا لیکن جب وہ دہلی آئے اور سعد اللہ گلشن سے ملے تو ان کی زبان میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ ولی کے کلام میں دکن کے ہندی عناصر کی جگہ دھیرے دھیرے فارسی عناصر شامل ہونے لگے۔ امرت رائے کے خیال میں زبان کو جان بوجھ کر فارسی آمیز بنایا جا رہا تھا، کیونکہ شمالی ہند میں ایک علاحدہ تہذیبی تشخص کا رجحان پروان چڑھ رہا تھا جس کی تاریخ بہت طویل ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندی/ ہندوی، سماجی سطح پر اور ادبی اظہار کے طور پر عوام کے ایک بہت بڑے طبقے میں رائج تھی، لیکن خواص کو اس زبان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ یہ لوگ شاہی درباروں سے وابستہ تھے اور فارسی ہی ان کے لیے سب کچھ تھی لیکن دکن کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہاں ہندی/ ہندوی کو سلاطین و امراء نے بھی منہ لگایا تھا اور اُسے درباروں کی بھی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ سلسلہ اورنگ زیب کے دکن فتح کرنے تک جاری رہا، لیکن جیسے ہی دکن کی خود مختار سلطنتیں سلطنتِ مغلیہ میں ضم ہوئیں، زبان کو فارسی آمیز بنانے کا رجحان وہاں بھی پیدا ہو گیا۔ جو قوتیں شمالی ہند میں ہندی/ ہندوی کی 'اصلاح' کا کام کر رہی تھیں انھیں قوتوں نے دکن میں بھی اپنا کام شروع کر دیا (ص ۲۳۹)۔ ان کے خیال میں ولی کی آمد کے بعد شمالی ہند میں زبان کی اصلاح کے نام پر سنسکرت سے ماخوذ ہندی الفاظ کو متروک قرار دیا جانے لگا جس نے دھیرے دھیرے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ابتدا میں اصلاحِ زبان

کی تحریک صرف اس طبقے تک محدود تھی جو دربار سے قرب رکھتا تھا۔ یہ زمانہ سترھویں صدی کا آخری اور اٹھارھویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہیں سے مغلیہ سلطنت کے زوال کی تاریخ بھی شروع ہوئی (ص 226 تا 264)۔

مسعود حسین خاں کے خیال میں فتحِ دکن سے 'زبانِ دہلوی' کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے کہ جب دہلی کی عوامی زبان، 'زبانِ اردو'، 'اردوئے شاہی' یا 'زبانِ اردوئے معلیٰ' کہلانے لگتی ہے۔ امرت رائے کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے خیال میں دہلی کے عوام کی زبان میں اور شاہی اردو میں نمایاں فرق موجود تھا اور فارسی آمیز شاہی اردو اس وقت یا کسی اور زمانے میں دہلی کے عوام کی زبان نہیں رہی تھی۔ عوام کی زبان ہندی/ ہندوی (اپنی بہت سی بولیوں کے ساتھ) تھی اور خواص کی زبان فارسی تھی۔ امرت رائے 'زبانِ دہلوی، اس اردو کو کہتے ہیں جس میں فارسیت کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں ایسی زبان کبھی عوام کی زبان ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ خسروؔ کی زبان کو 'زبانِ دہلوی' کہنے سے انھیں انکار ہے۔ وہ اسے ہندی/ ہندوی کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خسروؔ نے دہلی کی زبان کا ذکر اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں کیا ہے لیکن امرت رائے کے خیال میں زبانِ دہلوی بعد میں حد درجہ فارسی آمیز بن جاتی ہے اور جو دہلی کے عوام کی زبان نہیں کہی جا سکتی۔ یہی زبان 'شاہی اردو' کہلائی، جس کا فروغ شاہ جہاں کے زمانے سے شروع ہوا اور اورنگ زیب کے زمانے میں اس کی مزید ترقی ہوئی (ص 240)۔

امرت رائے نے ایک اور انوکھی بات کہی ہے۔ ان کے خیال میں زبانِ دہلوی یا زبانِ شاہی میں فارسی کی آمیزش غیر فطری طور پر ہو رہی تھی۔ لہٰذا 'ہندی/ ہندوی یا قدیم اردو کی جدید اردو' میں تبدیلی زبان کے فطری ارتقا کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ علاحدگی پسندی کا نتیجہ تھی جو برسرِ اقتدار طبقۂ اشراف کی طرف سے اپنی ایک طبقاتی بولی (Class-dialect) پیدا کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ بقول امرت رائے خان آرزوؔ، شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے ہاتھوں اصلاحِ زبان کی تحریک پروان چڑھتی ہے اور یہ زبان (جدید اردو) قطعی طور پر ہندی/ ہندوی روایات سے کٹ کر الگ ہو جاتی ہے جب کہ 'جدید ہندی، ہندی/ ہندوی'

روایت کا جزو بنی رہتی ہے۔ امرت رائے نے 'جدید ہندی' کو ہندوی روایت کا تسلسل اور بنیادی دھارے (Main stream) میں شامل بتایا ہے جب کہ 'جدید اردو' کو اس بنیادی دھارے سے ایک الگ تھلگ چیز تصور کیا ہے۔ (ص 246 تا 248)

فورٹ ولیم کالج کا ذکر کرتے ہوئے امرت رائے لکھتے ہیں:

''ایسٹ انڈیا کمپنی یا فورٹ ولیم کالج کے خلاف جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ہند کی فطری طور پر ارتقا پذیر زبان ہندوی کو دو جدید شکلوں اردو اور ہندی میں تقسیم کر دیا وہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ پھوٹ تو انگریزوں کے یہاں آنے سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے صرف وہی پالیسی اختیار کی جو بہتر نتائج پر مبنی ایک عملی پالیسی تھی۔'' (ص 17)

فورٹ ولیم کالج کے بارے میں امرت رائے کی یہ رائے حقیقت پر مبنی نہیں ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ صرف فورٹ ولیم کالج بلکہ انگریزی حکومت نے بھی اردو کے خلاف معاندانہ روش اختیار کر رکھی تھی جس سے اردو کے مفاد کو آگے چل کر سخت نقصان پہنچا اور جدید ہندی (دیوناگری ہندی) نے انگریزوں کی لسانی پالیسی سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا۔ یہاں گارساں دتاسی کا یہ اقتباس پیش کرنا بے جا نہ ہوگا جس سے اردو کے ساتھ حکومت کے معاندانہ رویے پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''بہر حال اردو والوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ان کی منجھی ہوئی زبان میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے... حکومت کی معاندانہ روش کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔'' ('مقالاتِ گارساں دتاسی'، حصہ اول، ص 360)۔

امرت رائے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اردو زبان کو دیوناگری میں منتقل کرنے کا سلسلہ فورٹ ولیم کالج ہی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دراصل ہندو احیاء پرستی کا نتیجہ تھا جو اس زمانے میں زور پکڑ رہی تھی۔ انگریزی حکومت نے بھی اکثریت کا ہی ساتھ دیا اور دیوناگری رسم خط کی حمایت کی جس سے اردو زبان کی ایک نئی شکل دیوناگری کے روپ میں پیدا ہو گئی۔ یہ دراصل اردو سے ہندی کی علاحدگی تھی جس سے امرت رائے چشم پوشی

کرتے ہیں۔ اگر حقیقی معنوں میں دیکھا جائے تو علاحدگی پسندی کے عناصر دراصل فورٹ ولیم کالج سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ زبان ہندی (جدید دیوناگری ہندی) ہے جو علاحدگی اختیار کرتی ہے۔ ہندو احیا پرستی سے اس لسانی علاحدگی پسندی کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اس کی ذمہ داری فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے سربراہ جان گلکرسٹ اور للولال جی دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں برج موہن دتاتریہ کیفی کا یہ قول نقل کرنا بے جا نہ ہوگا جس سے جدید ہندی کی اصلیت کا پورا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جسے آپ اردو کہتے ہیں، یہ دیوناگری حروف میں لکھی گئی تو ہندی کہلانے لگی۔'' (خمسۂ کیفی، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء، ص 11)

جدید ہندی کی اصلیت پر ششی کنٹھ مشر کی کتاب 'کھڑی بولی آندولن' کے اس اقتباس سے بھی بخوبی روشنی پڑتی ہے:

> ''للولال جی جو جدید ہندی کی پہلی کتاب کے مصنف ہیں، برہمن تھے۔ انھوں نے ایک مصنوعی اسلوب ایجاد کیا جس میں عربی و فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت اور برج بھاشا کے الفاظ قصداً رکھے گئے اور اسی ''پریم ساگر'' کے اسلوب کی لوگ تقلید کرنے لگے اور اسی اسلوب کو جدید ہندی سمجھنے لگے۔'' (بحوالہ عبدالودود، 'اردو سے ہندی تک'، مطبوعہ نسیم بک ڈپو، 1986ء، ص25)

اس لسانی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام (1800ء) بلکہ انقلابِ غدر (1857ء) تک اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان کے طور پر پورے شمالی ہندوستان میں جاری و ساری تھی۔ ادبی و تہذیبی زبان ہونے کے علاوہ خواندگی (Literacy) کی بھی واحد زبان اردو ہی تھی، نیز ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کا کثیر مذہبی لٹریچر بھی اسی زبان میں پایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں دفتری اور کاروباری نیز تخلیقی اور صحافتی امور کے لیے اس زبان کا استعمال بیسویں صدی کے آغاز تک بکثرت ہوتا رہا ہے۔

لیکن فورٹ ولیم کالج کے اردو مخالف رجحانات، ایسٹ انڈیا کمپنی کی اردو کے سلسلے

میں معاندانہ پالیسیوں نیز اکثریتی طبقے کی احیا پرستی (ان تمام باتوں کو امرت رائے اپنی مذکورہ کتاب میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظر انداز کر گئے ہیں) کی شہ پا کر ایک نئے رسم الخط میں اور ایک نئے ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ کھڑی بولی کا سہارا لے کر اردو کی طرز پر جو زبان بنائی گئی تھی اور جس کو بھارتیندو ہریش چندر (1850-1885ء) نے اپنی ادبی کاوشوں کے ذریعے فروغ دینے کی کوشش کی تھی اس کی ترقی کا سو سال بعد بھی کیا حال تھا، یہ پنڈت سندر لال کی زبان سے سنیے۔ ذیل کے تمام اقتباسات پنڈت سندر لال کے اس خط سے لیے گئے ہیں جو انھوں نے گاندھی جی کو ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد سے لکھا تھا:

1) ''شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندی، ہندوستان کے کسی بھی ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال نہیں ہے۔''

2) ''اگر اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچ ہے کہ ہندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ یہاں میرا مطلب کھڑی بولی ہندی سے ہے۔ برج بھاشا یا اودھی تو ویاکرن (قواعد) کے خیال سے ہندی اردو سے بہت دور ہیں۔''

3) ''یہ بھی بالکل سچ ہے کہ آج کل کی ہندی زیادہ تر کتابی اور بناوٹی زبان ہے۔ کچھ تو فرقہ وارانہ جذبات اور زمانہ قدیم کی طرف لے جانے کی خواہش، کچھ ایک قومی زبان تعمیر کرنے کا خیال۔ اور کم سے کم شروع میں ایک حد درجہ تک حکام کے خود غرضانہ اشارے اور ان کی مدد۔ اس کے مقابلے میں اردو ایک زیادہ قدرتی اور زندہ زبان ہے، ہیں دونوں اسی ملک کی پیدائش۔''

4) ''آج کل کی ہندی کو اپنا ویاکرن (قواعد) اور ڈھانچا ظاہر ہے اردو ہی سے لینا پڑا۔''

(بحوالہ ماہنامہ 'جامعہ' (دہلی)، جلد 27، شمارہ 4، بابت اکتوبر 1926ء، ص879 تا 887)

امرت رائے نے اپنی متذکرہ کتاب میں اس لسانی مناقشے (Controversy) کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے جو ہندوؤں کے دو طبقوں میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کے استعمال کے سلسلے میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں پیدا ہو گیا تھا جس نے آگے چل کر معرکہ آرائی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بھارتیندو ہریش چندر جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، کھڑی بولی کے حامیوں میں تھے۔ انھوں نے کھڑی بولی کو ادبی و شعری اظہار کے لیے بھی استعمال کیا تھا، لیکن ان کے نئے تجربوں سے لوگ خوش نہیں تھے۔ کھڑی بولی کے ہندی 'روپ' کے حامیوں میں شری دھر پاٹھک اور ایودھیا پرساد کھتری بھی تھے۔ یہ لوگ کھڑی بولی کی قوت کو سمجھتے تھے اور اردو کے روپ میں اس کی ہمہ گیری اور مقبولیت سے واقف تھے۔ لیکن ہندوؤں کا ایک طبقہ کھڑی بولی کو مسلمانوں سے منسوب کرتا تھا اور اسے اختیار کرنا کسرِ شان سمجھتا تھا۔ اس طبقے کا خیال تھا کہ اگر کھڑی بولی میں شاعری کی گئی اور ہندی کے روپ میں اسے اختیار کر لیا گیا تو وہ ایک طرح کی اردو ہی ہو کر رہ جائے گی۔ اس طبقے کے روحِ رواں پرتاپ نرائن مشر اور رادھا چرن گوسوامی تھے۔ یہ لوگ کھڑی بولی پر برج بھاشا کو فوقیت دیتے تھے اور اس کی شاعری کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ برج بھاشا کا شعری سرمایۂ ادب کافی وسیع تھا جب کہ کھڑی بولی کے اردو روپ کی شاعری سے قطع نظر اس کا (کھڑی بولی ہندی کا) شعری سرمایہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

اہم بات یہ ہے کہ جب انیسویں صدی کے وسط تک ہندی والوں میں یہ بات طے نہیں ہو پائی تھی کہ ہندی کی 'روپ ریکھا' کیا ہو اور کن خطوط پر ہندی آگے بڑھے، آیا کھڑی بولی کی نہج پر یا برج بھاشا کے اسلوب میں، تو امرت رائے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کھڑی بولی کا وہ تمام تر سرمایہ جو قدیم اردو کی شکل میں شمالی ہند اور دکن میں معرضِ وجود میں آیا ہے، وہ ہندی (دیوناگری ہندی) کا ہے اور اردو کی چھے سو سالہ تاریخ ہندی کی تاریخ ہے۔ ایسا سوچنا بھی سراسر ناانصافی اور حقیقت کے پرے ہے۔

(5)

امرت رائے نے اردو پر علاحدگی پسندی کا الزام تو عائد کیا ہی ہے، حد تو یہ ہے کہ وہ اردو کو ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈیول میں جگہ دیے جانے پر بھی معترض ہیں۔ ان کے خیال میں اردو کو (اس کے رسم الخط کے ساتھ) آئین میں ہندی کے علاوہ ایک علاحدہ قومی زبان کی حیثیت دینے میں عجلت سے کام لیا گیا اور اس پر اچھی طرح غور نہیں کیا گیا۔ یہ فیصلہ مسئلے کی پیچیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہیں کیا گیا تھا، بلکہ سیاسی مصلحت اور سہل انگاری پر مبنی تھا۔ (صفحہ 287)۔ اپنے اس خیال کی تائید میں امرت رائے نے گیان چند جین کا یہ قول نقل کیا ہے:

''ہندوستان کے آئین میں اردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے، لسانی حقیقت نہیں۔''

گیان چند جین کا یہ قول ان کے ایک مضمون ''اردو، ہندی یا ہندوستان''، مشمولہ مجلّہ 'ہندوستانی زبان'، (سال 5، نمبر 1، بابت اکتوبر 1973، ص 16) سے لیا گیا ہے۔

گیان چند جین نے یہ بات کھل کر نہیں کہی ہے کہ اردو کو ہندوستان کے آئین میں جگہ نہیں ملنی چاہیے تھی، لیکن اقتباس کے بین السطور سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ جب ہندی کو آئین میں جگہ دے دی گئی تو اردو کو جو اسی زبان کا دوسرا نام ہے، آئین میں جگہ دینے کا کیا جواز؟ ان کے خیال میں ایسا کرنا محض ''سیاسی مصلحت'' ہی ہو سکتی ہے، ''لسانی حقیقت'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

امرت رائے نے اپنی مذکورہ کتاب میں گیان چند جین کے اس قول کو بنیاد بنا کر یہ بات نہایت کھل کر کہی ہے کہ ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈیول میں اردو کی شمولیت غیر ضروری ہے اور ایسا اقدام محض ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے سیاسی مصلحت کی بنا پر کیا گیا ہے۔

یہی نہیں، بلکہ امرت رائے اردو کو آئندہ علاقائی حیثیت دیے جانے پر بھی اپنی ناگواری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''چونکہ سیاسی قوت کا کھیل ووٹوں کی بنیاد پر کھیلا جاتا ہے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ کسی دن اردو کو علاقائی حیثیت دے دی جائے گی۔''

پھر وہ مزید لکھتے ہیں:

''لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر ایسا ہوا تو یہ ملک کے قومی مفاد کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا، کیونکہ اپنے غیر سیکولر کردار اور شدید مذہبی جذبے کے تحت یہ زبان سیکولر یکجہتی کے خلاف کام کرے گی۔'' (ص289)

امرت رائے کی کتاب *A House Divided* کی اصل عبارت یہ ہے:

"It is not together unlikely that, in the context of the cynical, vote-oriented power game of politics, Urdu will some day even have recognition as a regional language; but we think that it would be harmful in the national interest of the country to grant this, because as a non-secular element with a strong religious connotation it would work against secular integration." (P.289)

کتابیات

-1 ابو محمد سحر، 'ہندی/ ہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین' طبعِ اوّل (بھوپال: مکتبۂ ادب، 1999ء)۔

-2 امرت رائے، *A House Divided: The Origin and Development of Hindi-Urdu.* ری پرنٹ (دہلی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1991ء)۔

-3 محمد صادق، *A History of Urdu Literature* (اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1964ء)

-4 مرزا خلیل احمد بیگ، 'اردو کی لسانی تشکیل'، چوتھا ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2008ء)۔

-5 مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو'، ساتواں ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک

ہاؤس، 1987ء)۔

6- سنیتی کمار چٹرجی، *Indo-Aryan and Hindi*، دوسرا ایڈیشن (کلکتہ: فرما کے. ایل. مکھوپا، دھیائے، 1960ء)۔

7- گیان چند جین 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005ء)

ترقیمہ (Colophon)

(1) مسعود حسین خاں نے امرت رائے کی متنازع فیہ کتاب *A House Divided* کے بارے میں خلیق انجم کو (جو اس وقت انجمن ترقیِ اردو [ہند] کے جنرل سکریٹری اور انجمن کے ترجمان ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے مدیر تھے) 4 اپریل 1987ء کو خط لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور میرے اس مضمون کا بھی ذکر کیا جو میں نے امرت رائے کی متذکرہ کتاب پر لکھا تھا۔ مسعود حسین خاں نے لکھا:

> ''معلوم نہیں، آپ کے علم میں ہے کہ نہیں پریم چند کے سپوت امرت رائے نے اردو کے گیانی پروفیسر گیان چند جین کے ایک اقتباس کا سہارا لے کر اردو بے چاری کے خلاف اپنی تازہ تصنیف *A House Divided* میں زہر اگلا ہے۔ یہ تصنیف دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہے... میں نے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ صاحب کی توجہ اس طرف منعطف کرائی تو انھوں نے ایک مفصل تبصرہ اس پر اردو میں لکھ ڈالا۔ اب چاہتا ہوں کہ آپ اسے نمایاں طور پر 'ہماری زبان' میں جلد شائع کر دیں..... ضروری ہے۔ اس لیے کہ اردو والے اردو کے 'کفن' میں لپٹے رہتے ہیں اور انھیں پتا بھی نہیں چلتا کہ انگریزی کے وسیلے سے ہمارے خلاف بات سات سمندر پار پہنچ رہی ہے۔'' (بحوالہ 'نذرِ مسعود'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ [ملتان: بیکن بکس، 1990ء]، ص 16-415)۔

(2) معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی راقم السطور کے متذکرہ مضمون کا ذکر اپنی فاضلانہ تصنیف 'اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو' (کراچی: آج کی کتابیں، 1999ء)، ص 12-11 [حاشیہ] میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''امرت رائے کا نظریہ تضادات سے پر ہے، اور اس کی بنیاد متعصبانہ ظن و تخمین پر ہے، نہ کہ ٹھوس حقائق پر۔ لیکن اردو والوں نے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب تا حال نہیں دیا ہے۔ اس دوران اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1991ء میں شائع ہوا... میرے علم و اطلاع کے مطابق اہل اردو میں صرف مرزا خلیل احمد بیگ نے امرت رائے کا رَد لکھا... ملاحظہ ہو مرزا خلیل احمد بیگ کا مضمون ''امرت رائے اور ہندی اردو کا مسئلہ''، مشمولہ مرزا خلیل احمد بیگ: 'لسانی تناظر'، نئی دہلی، باہری پبلی کیشنز، 1997ء۔''

رسالہ 'آج' (کراچی) کے مدیر اجمل کمال نے بھی اپنے مضمون ''اردو، بابایانِ اردو اور برِ صغیر کا مسلم معاشرہ' میں شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے راقم السطور کے متذکرہ مضمون کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے رسالہ 'امروز'، علی گڑھ [کتابی سلسلہ 6]، بابت اپریل- جون 2018ء)۔

(3) بھوپال (مدھیہ پردیش) کے معروف اردو نقاد، محقق اور زبان شناس ڈاکٹر ابو محمد سحر بھی امرت رائے کی متذکرہ کتاب پر اپنے ایک مضمون ''ہندی/ ہندوی پر ایک نظر'' میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب کا اردو سے متعلق حصّہ بڑی حد تک ان کے [گیان چند جین کے] تعاون سے لکھا گیا ہے۔ انھوں نے [گیان چند جین نے] بڑی فراخ حوصلگی سے امرت رائے کو اس موضوع پر کتابیں، رسالے، خیالات اور ہر طرح کی ایسی معلومات فراہم کیں جن پر انحصار کیا جا سکتا تھا۔''

ابو محمد سحر نے امرت رائے کی متذکرہ کتاب کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ ہے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ لکھنا تھا، اس کا ایک نمونہ انھوں نے پہلے ہی اپنے ذہن میں بنا لیا تھا اور اس کے مطابق وہ تمام شواہد و دلائل کو ڈھالتے

چلے گئے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی مواد یا تو انھوں نے سنجیدگی سے پیش نہیں
کیا یا پیش کیا ہے تو اس کی تردید کردی ہے... یوں تو ہندی/ ہندوی ایک
لسانی موضوع ہے، لیکن بدقسمتی سے لسانی مطالعوں میں سیاست داخل ہوتی
رہی ہے۔ وقت کے ساتھ اس میں کمی آنا چاہیے تھی، لیکن اس کتاب میں یہ
رنگ اور گہرا ہو گیا ہے۔''

امرت رائے کی کتاب پر اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے ابو محمد سحر لکھتے ہیں:
''افسوس ہے کہ امرت رائے کی کتاب میں جو نہ ہونا چاہیے تھا وہ اپنی انتہا پر
ہے، اس کے گمراہ کن اثرات سے لوگوں کے دل و دماغ کو محفوظ رکھنا ممکن
نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ تاریخ کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں پھول بھی
ہیں اور کانٹے بھی۔ کوئی چاہے تو پھول چن لے یا صرف کانٹے یا اپنے
انتخاب میں توازن سے کام لے۔ امرت رائے نے اس کتاب میں اردو اور
اہلِ اردو کے لیے تاریخ کے دامن سے صرف کانٹے چنے ہیں۔'' (بہ حوالہ
'ہندی/ ہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین'، طبعِ اوّل (بھوپال: مکتبۂ
ادب، 1999ء)، ص 7 تا 72)

●●●

اردو اور پنجابی کا لسانی اشتراک و افتراق

اردو اور پنجابی دونوں جدید ہند آریائی زبانیں ہیں۔ لسانیاتی اعتبار سے دونوں کا ارتقاء شورسینی اپ بھرنش سے ہوا ہے اور دونوں کے طلوع کا زمانہ 1000 سنہ عیسوی کے بعد کا ہے۔ اپ بھرنشیں جن کا ارتقا 600 تک کے لگ بھگ پراکرتوں سے ہوا تھا، 1000 تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ چکی تھیں جس کے نتیجے میں پورے شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق جدید ہند آریائی زبانوں کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ہند آریائی زبانوں کے ماہرین نے چھے قسم کی اپ بھرنشوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے شورسینی اپ بھرنش 'مدھیہ دیش' (Midland) کے علاقے میں رائج تھی۔ یہاں وسطی ہند آریائی دور میں شورسینی پراکرت رائج تھی اور قدیم ہند آریائی دور میں یہیں کلاسیکی سنسکرت کا ارتقا ہوا تھا۔ اس کا 'شورسینی' نام عہدِ قدیم کے شورسین کے علاقے کے نام پر پڑا جس کا مرکز موجودہ اتر پردیش کا تاریخی شہر متھرا تھا۔ شورسینی اپ بھرنش سے ارتقا پانے والی زبانوں میں اردو اور پنجابی خاص ہیں۔

لسانیاتی اعتبار سے پنجابی کی دو قسمیں ہیں: مشرقی پنجابی اور مغربی پنجابی۔ مغربی پنجابی کو 'لہندا' (Lahnda) کہتے ہیں جو پاکستان کے صوبۂ پنجاب کے مغربی اضلاع اور ان کے نواح میں بولی جاتی ہے۔ مشرقی پنجابی ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں بولی جاتی ہے جو 'پنجاب' کہلاتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ مشرقی پنجاب ہے۔ اس کے علاوہ یہی پنجابی

پاکستان کے صوبۂ پنجاب میں بھی بولی جاتی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے مغربی پنجاب ہے۔

پنجابی زبان دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے: گرمکھی اور شہ مکھی (یا شاہ مکھی)۔ ہندوستان کے پنجابی بولنے والے جن میں زیادہ تر سکھ ہیں گرمکھی کا استعمال کرتے ہیں، اور پاکستان کے پنجاب کی پنجابی شہ مکھی رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ شہ مکھی رسم خط عربی فارسی رسم خط (Perso-Arabic script) کی توسیع شدہ شکل ہے جس کا اردو رسم خط سے گہرا تعلق ہے۔ شہ مکھی رسم خط میں لکھی جانے والی پنجابی زبان میں اردو الفاظ و تراکیب، محاورات و ضرب الامثال اور علمی اصطلاحات کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے، جب کہ گرمکھی رسم خط میں لکھی جانے والی پنجابی میں سنسکرت اور ہندی نژاد الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ پاکستان کی پنجابی جتنی قریب اردو سے ہے، ہندوستان کی پنجابی اتنی ہی قریب ہندی (معاصر دیوناگری ہندی) سے ہے۔ لیکن لسانیاتی اعتبار سے دونوں ایک ہی زبانیں ہیں۔

پنجابی زبان کی کئی علاقائی بولیاں (Regional dialects) ہیں۔ مشرقی پنجابی کی معیاری بولی 'ماجھی' (Majhi) کہلاتی ہے، جو امرت سر میں بولی جاتی ہے۔ یہی بولی مغربی پنجاب کے مرکزی شہر لاہور اور اس کے نواحی علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ یہ پنجابی زبان کی معیاری بولی ہے۔ ماجھی کی اصطلاح ہندوستان ہی میں رائج ہے۔ پاکستان کے ماجھی بولنے والے اپنی زبان کو 'معیاری پنجابی' بتاتے ہیں۔

آج اردو اور پنجابی دو مختلف زبانیں ہیں، لیکن قدیم الایام میں ان دونوں زبانوں میں لسانی ارتباط و اشتراک کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ محمود خاں شیرانی (1880-1946ء) جیسے عالم کو ان دونوں زبانوں کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے یہ دہلی پہنچی، پھر اس نے دکن کا رخ کیا۔ اس لسانی بحث کو شیرانی نے اپنی عالمانہ تصنیف 'پنجاب میں اردو' (1928ء) کا موضوع بنایا ہے اور ثبوت میں بے شمار دلیلیں اور مثالیں پیش کی ہیں۔ محمود شیرانی پنجاب کو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی ''ولادت گاہ'' مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اس ایک نتیجے کی

طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک
ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی، اور جب سیانی ہو گئی ہیں
تب ان میں جدائی واقع ہوئی۔"(1)

شیرانی کے نظریے کی رو سے اردو پنجاب میں تشکیل پذیر ہونے کے بعد دہلی جاتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور
چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ
وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔"(2)

محمود شیرانی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اردو اور پنجابی کے صرف ونحو کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

"اردو اپنی صرف ونحو سے پنجابی و ملتانی زبان کے بہت قریب ہے۔ دونوں
میں اسما و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ
مشترک ہے... دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع
میں متحد ہیں۔"(3)

شیرانی کا یہ کہنا ہے کہ:

"پنجابی و اردو میں ساٹھ فی صد سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔"(4)

محمود شیرانی کے بعد سید محی الدین قادری زور (1904-1962ء) دوسرے ماہرِ لسانیات گذرے ہیں جنھوں نے ارد اور پنجابی کے لسانی رشتے پر مفصل انداز میں غور و خوض کیا ہے اور شیرانی کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ وہ اپنے ایک مضمون "اردو کی ابتدا" میں لکھتے ہیں:

"یہ بات عجیب ہے کہ اردو اور پنجابی کے اصل تعلق کی نسبت کسی یورپی ماہر
لسانیات کا ذہن اب تک منتقل نہیں ہوا۔ اس کی طرف سب سے پہلے
ہندوستانیوں ہی کی توجہ منعطف ہوئی اور ہندوستانی اہل قلم ہی نے اردو اور

پنجابی کے اس بنیادی تعلق کو سب سے پہلے بے نقاب کیا۔ چنانچہ 1928ء میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں اس خیال کو نہایت واضح انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا۔'' (5)

محی الدین قادری زور نے جن کا تعلق حیدر آباد (دکن) سے تھا، انگلستان اور فرانس کی جامعات میں لسانیاتِ جدید کی اعلیٰ تربیت حاصل کی تھی اور لسانیات کے موضوع پر دو کتابیں شائع کی تھیں۔ انھوں نے اپنی پہلی کتاب انگریزی میں Hindustani Phonetics کے نام سے تصنیف کی جو 1930ء میں پیرس (فرانس) سے شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے اس موضوع پر کئی اہم مضامین بھی لکھے جن میں ''اردو اور پنجابی'' اور ''اردو کی ابتدا'' خاص ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون ''اردو کی ابتدا'' میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ''اردو پنجاب میں بنی۔'' وہ لکھتے ہیں:

اس کتاب [شیرانی کی 'پنجاب میں اردو'] کی اشاعت سے ایک سال قبل راقم الحروف اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق لندن یونیورسٹی میں لسانی تحقیق میں مصروف تھا۔ میرے مطالعے اور تلاش و جستجو میں بھی یہی حقیقت [کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی] بے نقاب ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے واضح کیا کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبۂ گنگ و جمن میں بہت کم فرق پایا جاتا تھا۔'' (6)

محمود شیرانی کی طرح محی الدین قادری زور بھی اس خیال سے متفق ہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہاں سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ یہ دہلی پہنچی۔ محی الدین زور نے اپنی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' (1932ء) میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتحِ دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا۔ اگرچہ یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارھویں صدی میں بولی جاتی تھی۔'' (7)

ہند آریائی لسانیات کے ماہر سنیتی کمار چٹر جی (1880-1977ء) نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب *Indo-Aryan and Hindi* میں جو 1942ء میں شائع ہوئی، لکھتے ہیں:

"The language that they (Muslims) first adopted was naturally that current in the Punjab."(8)

چٹر جی نے یہ بھی لکھا ہے:

"It is likely that Punjab Muhammadans who came to Delhi as followers of the Turkic and Persians conquerers had ... brought their dialect to Delhi.(9)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ محی الدین قادری زور کے لندن یونیورسٹی میں استاد اور اردو اور پنجابی کے معروف اسکالرٹی. گریہم بیلی (T. Grahame Bailey) نے بھی اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کی بات کہی ہے۔ بیلی 1027ء کو اردو کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں اور مغربی پنجاب کے شہر لاہور کو اردو کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب *History of Urdu Literature* میں جو 1932ء میں لندن سے شائع ہوئی، لکھتے ہیں:

"The formation of Urdu began as soon as the Ghaznavi forces settled in Lahore in 1027."(10)

محی الدین قادری زور لندن یونیورسٹی میں گریہم بیلی کے شاگرد تھے۔ ان کی نظر سے بیلی کی متذکرہ کتاب کا مسودہ نہ صرف گذرا تھا، بلکہ بیلی کے قول کے مطابق اس کی پروف خوانی بھی محی الدین قادری زور نے ہی کی تھی۔ اس بات کا ذکر بیلی نے اپنی متذکرہ کتاب کے 'Preface' (دیباچہ) میں کیا ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ محی الدین زور نے اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ گریہم بیلی ہی سے لیا ہوگا۔ اس میں اپنے استاد کی اتباع کا پہلو بھی شامل ہے۔ بیلی کی کتاب اگرچہ 1932ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے، لیکن اس کا مسودہ اس سے دو سال قبل 1930ء میں تیار ہو چکا تھا، اور محی الدین زور اس وقت لندن میں موجود تھے۔

اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کا نظریہ بالعموم محمود خاں شیرانی سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے یہ نظریہ پیش کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیرانی کی تصنیف 'پنجاب میں اردو' (1928ء) کی اشاعت سے پانچ سال قبل شیر علی خاں سرخوش اس نظریے کو اپنے تذکرے 'اعجازِ سخن' (1932ء) میں پیش کر چکے تھے۔ شیرانی کو سرخوش کے اسی تذکرے سے تحریک ملی، چنانچہ انھوں نے اس نظریے کو دلائل و براہین کے ساتھ مفصل انداز میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا جو 'پنجاب میں اردو' کی شکل میں معرضِ وجود میں آیا۔ شیرانی نے اس کا ذکر اپنی متذکرہ کتاب کی ابتدا میں ''عرضِ حال'' کے عنوان سے کیا ہے۔

اردو کے آغاز کے سلسلے میں جو بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو کھڑی بولی سے پیدا ہوئی ہے، کیونکہ 1000 سنہ عیسوی کے بعد شمالی ہندوستان کا لسانی منظر نامہ تیزی سے بدلنے لگا تھا۔ شورسینی اپ بھرنش اپنا چولا بدل چکی تھی۔ شمالی ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں شورسینی اپ بھرنش کا چلن تھا وہاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی تقاضوں کے ماتحت ایک نئی لسانی شکل نمو پذیر ہونے لگی تھی جس کا اس وقت بہ ظاہر کوئی نام نہ تھا، لیکن علاقائی سطح پر ان میں دھیرے دھیرے تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ انھیں تبدیلیوں کے زیر اثر وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی گئیں اور بولیاں کہلانے لگیں۔ شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے پنجاب کے وسیع علاقے میں کئی بولیاں پیدا ہوئیں جنھیں ملا کر پنجابی یا مشرقی پنجابی کہا گیا۔ ادھر دہلی و نواحِ دہلی میں معرضِ وجود میں آنے والی بولیوں کو ''مغربی ہندی'' کے نام سے موسوم کیا گیا جس کی ایک بولی ''کھڑی بولی'' کہلائی۔ یہی کھڑی بولی اردو کی پیدائش کا سبب بنی۔ اردو نہ تو پنجاب میں پیدا ہوئی اور نہ پنجابی سے نکلی، کیوں کہ جس زمانے میں دہلی کے آس پاس مغربی ہندی کی بولیاں (کھڑی بولی، ہریانوی وغیرہ) سر اٹھا رہی تھیں اسی زمانے میں پنجاب میں پنجابی زبان بھی متشکل ہو رہی تھی لہٰذا کھڑی بولی کے پنجابی سے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر کھڑی بولی پنجابی سے پیدا نہیں ہوئی تو اردو بھی پنجابی سے پیدا نہیں ہوئی، لیکن اردو پر پنجابی زبان کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو بعد میں ا س پر مرتسم ہوئے، لیکن اردو جیسے جیسے معیاری شکل اختیار کرتی گئی، پنجابی کے یہ اثرات بھی

زائل ہوتے گئے، لیکن دکنی اردو پر پنجابی کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیقی تصنیف 'مقدمۂ تاریخ زبان اردو' (ساتویں اشاعت 1987ء) میں قدیم اردو (بہ شمول دکنی اردو) پر پنجابی کے اثرات کو ہریانوی کے اثرات سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے، لیکن قدیم اردو پر پنجابی کے اثرات کو وہ ہریانوی کے اثرات بتاتے ہیں۔ جس زمانے میں دہلی کے آس پاس کھڑی بولی بن رہی تھی، اسی زمانے میں دہلی کے نواح میں ہریانوی بھی تشکیل پا رہی تھی۔ (دہلی کے شمال مغربی حصے میں آج بھی ہریانوی کا چلن ہے)۔

اسی زمانے میں پنجاب سے پنجابی بولنے والے مسلمانوں کی دہلی میں آمد کا سلسلہ شروع ہوا، اور 1193ء میں فتحِ دہلی کے بعد تو اس شہر کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ مسعود حسین خاں نے اپنی متذکرہ کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اردو پنجاب میں نہیں، بلکہ دہلی میں پیدا ہوئی اور نواحِ دہلی کی بولیوں نے اردو کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔[11]

(2)

محمود خاں شیرانی نے پنجاب کو اردو کی جائے پیدائش ثابت کرنے کے لیے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' (1928ء) میں، اردو بالخصوص دکنی اردو اور پنجابی میں پائی جانے والی مماثلتوں کا کثرت سے ذکر کیا ہے اور مثالیں پیش کی ہیں، لیکن ان کی توجہ ان لسانی اختلافات کی جانب منعطف نہیں ہوئی جو ان دونوں زبانوں کی ہر سطح پر پائے جاتے ہیں۔ راقم السطور نے اردو اور پنجابی کا از سرِ نو تقابلی مطالعہ کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان دونوں زبانوں میں مماثلتوں سے زیادہ اختلافات موجود ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اردو اور پنجابی دو مختلف زبانیں ہیں اور ان کا ارتقا دو مختلف مقامات پر ہوا ہے، یعنی پنجابی پنجاب میں ارتقا پذیر ہوئی اور اردو دہلی و نواحِ دہلی میں معرضِ وجود میں آئی۔ دونوں ایک دوسرے سے پیدا نہیں ہوئیں، لیکن دونوں کی 'ماں' شورسینی اپ بھرنش ہے۔

پنجابی اور اردو کے لسانی اختلافات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

1- تخفیفِ صوت

اردو کے طویل مصوتے (Long vowels) پنجابی میں مختصر مصوتوں (Short vowels) میں تبدیل ہو جاتے ہیں، چنانچہ تخفیفِ صوت پنجابی زبان کی ایک اہم صوتی خصوصیت تصور کی جاتی ہے۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

پنجابی	اردو
اِک	ایک
اج	آج
اٹھ	آٹھ
تن	تین
نک	ناک
سَت	سات
لکھ	لاکھ
ہتھ	ہاتھ
پچھ	پوچھ

2- ضمائر

پنجابی	اردو
اوہ	وہ/اس
تُسی، تسیں	تم/آپ
اَسی، اَسیں	ہم
تُوں	تم

مینوں	مجھے
ساڈا	ہمارا
اوہدا	اس کا
اوہدی	اس کی
تہاڈا	تمھارا/آپ کا
تہانوں	تمھیں/آپ کو
ایہہ	یہ
اوہنوں	اسے/انھیں

3- افعال

پنجابی افعال کی مندرجہ ذیل شکلیں اردو میں مستعمل نہیں۔ امدادی افعال اور حالیہ نا تمام کی شکلیں جو پنجابی سے مخصوص ہیں، اردو میں نہیں ملتیں۔ البتہ ماضی مطلق کی وہ شکلیں جو پنجابی میں فعلی مادے میں ''یا'' لگا کر بنائی جاتی ہیں، دکنی اردو میں بکثرت پائی جاتی ہیں، مثلاً، چل + یا = چلیا، رہیا، بولیا وغیرہ۔ پنجابی افعال جو اردو میں مفقود ہیں، حسبِ ذیل ہیں:

(لف) امدادی افعال:

پنجابی	اردو
سی (واحد غائب)	تھا/تھی
ساں (جمع متکلم)	تھے
سن (جمع غائب)	تھے/تھیں
اے	ہے
او	ہیں/ ہو
آں (واحد متکلم)	ہوں

(ب) ماضیِ مطلق:

ماضیِ مطلق بنانے کے لیے پنجابی میں فعلی مادے کے بعد ''یا'' کا اضافہ کیا جاتا ہے، اور اردو میں ''ا'' (الف) کا، مثلاً:

پنجابی	اردو
بولیا	بولا
رہیا	رہا
چلیا	چلا
ہویا	ہوا

(ج) حالیہ ناتمام:

پنجابی میں حالیہ ناتمام بنانے کے لیے فعلی مادے کے آخر میں ''دا'' کا اضافہ کیا جاتا ہے، لیکن اردو میں ''تا'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امدادی فعل لائے جاتے ہیں۔ مثلاً 'لکھدا اے' (پنجابی): 'لکھتا ہے' (اردو)۔ مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

پنجابی	اردو
ہوسکدا اے	ہوسکتا ہے
اوہ خط لکھدا اے	وہ خط لکھتا ہے
توں جاسکدے او	تم جاسکتے ہو
کیہ میوزیم اج کھلدا اے؟	کیا میوزیم آج کھلتا ہے؟

(د) فعلِ مستقبل:

پنجابی میں فعلِ مستقبل کی تشکیل کے لیے فعلی مادے کے آخر میں ''واں'' یا ''اں'' کا اضافہ کرتے ہیں، جب کہ اردو میں ''وں'' یا ''ؤں'' لگاتے ہیں، اس کے بعد ''گا'' کا اضافہ کرتے ہیں، مثلاً:

پنجابی	اردو
پیواں گا	پیوں گا
جاواں گا	جاؤں گا
میں اج نہاواں گا	میں آج نہاؤں گا
میں کب سفر کرسکاں گا؟	میں کب سفر کرسکوں گا؟
میں اوہنوں اج ملاں گا	میں اس سے آج ملوں گا

4- حروف

حروف (Particles) کی تعریف مولوی عبدالحق نے اپنی 'قواعدِ اردو' میں یوں بیان کی ہے: ''حروف وہ غیر مستقل الفاظ ہیں جو تنہا بولنے یا لکھنے میں کوئی خاص معنی پیدا نہیں کرتے جب تک کہ کسی دوسرے جملے میں یا دوسرے الفاظ کے ساتھ استعمال نہ ہوں جیسے کو، تک، جب وغیرہ۔'' (12) انھوں نے حروف کی چار قسمیں بیان کی ہیں: (1) ربط، (2) عطف، (3) تخصیص، اور (4) فجائیہ۔

پنجابی اور اردو کے حروف ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

پنجابی	اردو
وِچ	میں
وَل	طرف
نال	ساتھ
کول	پاس
لئی	لیے
فیر	پھر
وی	بھی
ایتھے	یہاں
کیتھے	کہاں
جتھے	جہاں

پنجابی	اردو
تھلّے	نیچے
نیڑے	قریب
تے، اُتے	پر/ اوپر
دا، دی، دے	کا، کی، کے
جدوں	جب
کدوں	کب
ہور	اور
نرا	صرف
آہو	ہاں
ایہہ	یہ
جے	اگر
سبھ	سب
نوں	کو
ہن	اب

5- لغات

پنجابی اور اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا معتد بہ حصہ مشترک ہے، تاہم پنجابی میں ایسے بے شمار الفاظ مستعمل ہیں جو اردو میں نہیں پائے جاتے۔ بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جن کے تلفظ میں ان دونوں زبانوں میں فرق پایا جاتا ہے، چنانچہ لغات کے اعتبار سے بھی اردو پنجابی سے مختلف ہو جاتی ہے۔

لغوی اختلافات کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

پنجابی	اردو
ترہیہ	پیاس
لک	کمر
دھون	گردن
پیڑ	درد
ناں	نام
چنگا	اچھا
چِٹا	سفید
وڈا	بڑا
جَنے	افراد
بندے	افراد
دوجا	دوسرا
چن	چاند
کلّا	اکیلا
لوڑ	ضرورت
بھکھ	بھوک
کِنّا	کتنا
گڈی	گاڑی
باری	کھڑکی
وَجے (سَت وَجے)	بجے (سات بجے)
نیواں	نیچا
ویلا (کھاون دا ویلا)	وقت (کھانے کا وقت)

نون	نمک
پہلاں	پہلا/پہلے
کھنڈ	شکر
سوادی	لذیذ
گل	بات
چھیتی	جلدی
بال	بچے
بھوں	چکّر
ترکھان	بڑھئی
تھاں	جگہ
پُتّر	بیٹا
جوگ (دکھین جوگ)	لائق (دیکھنے کے لائق)
جوائی	داماد
سوہنا	خوبصورت
سوٹی	لاٹھی
کھوہ	کنواں
مُنڈا	لڑکا
کُڑی	لڑکی
چھڑا	کنوارا

6- فقرے اور جملے

پنجابی اور اردو میں ایسے بے شمار فقرے اور جملے پائے جاتے ہیں جن کی نحوی ترکیب وترتیب ایک ہی جیسی ہوتی ہے، یعنی جملہ سازی میں پہلے فاعل، پھر مفعول اور بعد میں

فعل آتا ہے۔ (= فاعل + مفعول + فعل)، لیکن جہاں تک کہ افعال کے مختلف صیغوں کی تشکیل کا طریقہ ہے، پنجابی اور اردو میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، اور یہی چیز پنجابی کو اردو سے بہت زیادہ الگ کرتی ہے۔ دونوں زبانوں کے فقروں اور جملوں کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

پنجابی	اردو
چنگی سویر	صبح بہ خیر
تہاڈا ناں؟	آپ کا نام (کیا ہے)؟
کون اے؟	کون ہے؟
مَیں آں	میں ہوں
کل ملاں گا	کل ملوں گا
رب راکھا	خدا حافظ
کیہ حال اے؟	کیا حال ہے؟
کوئی گل نہیں	کوئی بات نہیں
تسی کون او؟	آپ کون ہیں؟
تسی کیہ آکھیا؟	آپ نے کیا کہا؟
مینوں معاف کرنا	مجھے معاف کیجئے
فیر ملاں گے	پھر ملیں گے
دعا کرداہاں	دعا کرتا ہوں
سوہنا ناں اے	خوبصورت نام ہے
درویش دی صدا	درویش کی صدا
سیر لئی شکریا	سیر کے لیے شکریہ
اوہ کون اے؟	وہ کون ہے؟
مَیں چاہ پیاں گا	مَیں چائے پیوں گا

ایہ سچی گل اے	یہ سچی بات ہے
تہاڈا کیہ حال اے؟	آپ کا کیا حال ہے؟
تسی وڈے مہربان او	آپ بڑے مہربان ہیں
تہانوں ملنا چاہندا آں	آپ سے ملنا چاہتا ہوں
تہاڈی عمر کنّی اے؟	آپ کی عمر کتنی ہے؟
اَج میں ٹھیک آں	آج میں ٹھیک ہوں
اِک چنگا ہوٹل کتھے اے؟	ایک اچھا ہوٹل کہاں ہے؟
اوہ تن سال توں باہر سی	وہ تین سال سے باہر تھا
لہور وِچ تہاڈا اپتا کیہ اے؟	لاہور میں آپ کا پتا کیا ہے؟
گڈی سَت وجے جاندی اے	گاڑی سات بجے جاتی ہے
تسی کتھے جانا چاہندے او؟	آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟
میں اوہنوں کل ہوٹل وِچ ملیا ساں	میں اس سے کل ہوٹل میں ملا تھا

خلاصہ

مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مضمون ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ'' میں محمود خاں شیرانی کے اردو کے پنجاب میں پیدا ہونے کے نظریے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ —

> ''پنجابی اور اردو میں بعض ایسے اہم اختلافات تا حال موجود ہیں جن کی بنیاد پر اردو کا پنجابی سے ماخوذ ہونا کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔''(13)

اپنے اس قول کا اعادہ کرتے ہوئے انھوں نے مزید لکھا:

> ''صوتیاتی اور صرفی ونحوی سطحات پر دونوں زبانوں کے اختلافات اس قدر واضح ہیں کہ دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے مشتق بتانا صریح طور پر غلط ہے۔''(14)

مسعود حسین خاں کے اس نظریے سے راقم السطور کو مکمل طور پر اتفاق ہے، کیوں کہ جب تک کہ پنجابی اور اردو کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر بھی نظر نہ ہو، ان زبانوں کی جزوی مماثلتوں کی بنیاد پر کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں محمود خاں شیرانی کی تحقیق یک طرفہ (Lopsided) ہو کر رہ گئی ہے۔

حواشی

1- محمود خاں شیرانی، 'پنجاب میں اردو' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ایڈیشن 1970ء)، ص 99۔

2- ایضاً، ص 19۔

3- ایضاً، ص 19۔

4- ایضاً، ص 20۔

5- سید محی الدین قادری زور، ''اردو کی ابتدا''، مشمولہ 'اردو لسانیات'، مرتبہ فضل الحق (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، 1981ء)، ص 41۔

6- ایضاً، ص 41۔

7- سید محی الدین قادری زور، 'ہندوستانی لسانیات' (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1960ء)، ص 94۔

8- سنیتی کمار چٹرجی، *Indo-Aryan and Hindi*. Second edn. (Calcutta:Firma KLM, 1960), p. 67.

9- ایضاً، ص 67۔

10- ٹی. گریہم بیلی، T. Grahame Bailey, *A History of Urdu Literature* (London, 1932), p. 3.

11- مسعود حسین خاں، پیش لفظ 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو'، ساتواں ایڈیشن (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء)، پہلا ایڈیشن 1948ء)۔

12- عبدالحق، 'اردو قواعد' (دہلی: ناز پبلشنگ ہاؤس)، ص 165۔

13- مسعود حسین خاں، ''اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ''، مشمولہ 'اردو زبان کی تاریخ'، مرتبہ

مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ری پرنٹ 2007ء)، ص 88۔

14- ایضاً، ص 90۔

کتابیات

اس مقالے کی تسوید و ترتیب کے دوران میں حسب ذیل کتابیں راقم السطور کے زیر مطالعہ رہیں:

1- بیدی، کے. ایس.، 'تین ہندوستانی زبانیں' (پنجابی، اردو اور ہندی)، دوسری اشاعت (دہلی: کتب خانہ انجمن ترقیِ اردو، جامع مسجد، 1966ء)۔

2- خاں، مسعود حسین، 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو'، ساتویں اشاعت (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء)۔

3- زور، سید محی الدین قادری، 'ہندوستانی لسانیات' ری پرنٹ (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1960ء)۔

4- شیرانی، حافظ محمود خاں، 'پنجاب میں اردو'، ری پرنٹ لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، 1970ء)۔

5- عبدالصمد، 'پنجابی اردو بول چال' (دہلی: ایم. آر. پبلی کیشنز، 2004ء)۔

6. Bailey, T. Grahame, *A History of Urdu Literature* (Karachi: Oxford University Press, 2008), First published 1932.

7. Chattarje, Suniti Kumar, *Indo-Aryan and Hindi* (Calcutta: Firma KLM, 1960), First published 1942.

8. Gill, Harjeet Singh, *A Reference Grammar of Punjabi* (Patiala: Punjabi University, 1969).

●●●

اردو اور برج بھاشا کا لسانیاتی رشتہ

1- قدیم اردو اور برج بھاشا

ہند آریائی لسانیات کے ماہر جارج ابراہم گریرسن (George A. Grierson) نے 1000 سنِ عیسوی کے بعد شورسینی اپ بھرنش سے ارتقا پانے والی جدید ہند آریائی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر بیرونی اور اندرونی زبانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اندرونی زبانوں میں اس نے پنجابی (مشرقی)، گجراتی، راجستھانی اور مغربی ہندی کو شامل کیا ہے۔ پنجابی (مشرقی)، پاکستان کے مشرقی صوبۂ پنجاب اور ہندوستان کے مغربی صوبۂ پنجاب کی زبان ہے۔ گجراتی گجرات میں اور راجستھانی راجستھان میں بولی جاتی ہے۔ مغربی ہندی کسی مخصوص زبان کا نام نہیں، بلکہ یہ دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جانے والی پانچ بولیوں (Dialects) کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ بولیاں ہیں: کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی۔ ان بولیوں کو 'مغربی ہندی' کا اجتماعی (Collective) نام گریرسن نے ہی دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ بولیاں لسانیاتی اعتبار سے آپس میں ملتی جلتی ہیں اور 'مشرقی ہندی' کے مغرب میں واقع ہیں۔ 'مشرقی ہندی' کی اصطلاح بھی گریرسن ہی کی وضع کردہ ہے جس سے وہ وسطی علاقے میں بولی جانے والی تین بولیاں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی مراد لیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ برج بھاشا، مغربی ہندی کی ایک بولی ہے، لیکن اس کا تعلق واو [و] پر ختم ہونے والی بولیوں سے ہے، جبکہ مغربی ہندی کی دوسری بولیاں کھڑی بولی اور ہریانوی

الف [ا] پر ختم ہوتی ہیں۔ معروف ماہرِ لسانیات مسعود حسین خاں (1919-2010ء) نے کھڑی بولی اور ہریانوی کی طرح برج بھاشا کو بھی نواحِ دہلی کی بولیوں میں شمار کیا ہے اور اردو پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اپنے ارتقا کے دوران میں نواحِ دہلی کی ان تینوں بولیوں (کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا) سے متاثر ہوئی ہے۔

محلِ وقوع کے اعتبار سے برج بھاشا دہلی کے جنوب مشرق کی بولی ہے جس کا مرکز متھرا (اتر پردیش کا قدیم شہر) ہے، لیکن یہ اپنے چاروں سمت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ متھرا اور اس سے متصل ورنداون کے آس پاس کے علاقے کو وہاں کے لوگ 'برج منڈل' کہتے ہیں۔ برج بھاشا اسی مخصوص علاقے (برج منڈل) کی بولی ہے، لیکن یہ بھرت پور، دھول پور، علی گڑھ، آگرہ، ایٹہ، مین پوری، بلند شہر، گوالیار، بدایوں اور بریلی تک میں بولی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک اس علاقے کو مذہبی تقدس حاصل ہے، کیونکہ کرشن جی کی 'لیلاؤں' کی جولاں گاہ یہی سرزمین تھی۔ ہندو تہذیب و تمدن کا قدیم مرکز ہونے کے علاوہ یہ سرزمین سنسکرت زبان کا بھی گہوارہ رہی ہے۔ اسی لیے برج بھاشا پر سنسکرت زبان کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔

بارھویں صدی عیسوی کے اواخر سے شمالی ہندوستان میں اردو نے کھڑی بولی کا روپ اختیار کر کے پھلنا پھولنا شروع کیا جس کے ابتدائی نام "ہندوی"، "ہندی" اور "زبانِ دہلوی" پڑے۔ ابتداءً اس زبان پر کھڑی بولی کے علاوہ ہریانوی (دہلی کے شمال مغرب کی بولی) کے بھی گہرے اثرات مرتسم ہوئے۔ ہریانوی کے بعد جس بولی نے اردو کو متاثر کیا وہ برج بھاشا تھی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہریانوی اور برج بھاشا دونوں کے اثرات زائل ہو گئے اور اردو کھڑی بولی کا نکھرا ہوا اور معیاری روپ بن کر اُبھری۔ دکنی اردو پر ہریانوی کے بعض اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اردو اور برج بھاشا کے درمیان اتنا گہرا رشتہ سمجھا جاتا تھا کہ خان آرزو (1686-1756ء) جیسے عالم جب میر عبدالواسع ہانسوی کی 'غرائب اللغات' (فارسی میں لکھی ہوئی اردو زبان کی لغت) کی تصحیح کرنے بیٹھے تو انھوں نے اپنی تصنیف 'نوادر الالفاظ' میں

ہریانوی کے مقابلے میں برج بھاشا کو ترجیح دی۔ برج بھاشا کی اہمیت کے پیشِ نظر محمد حسین آزاد (1910-1830ء) کو یہ کہنا پڑا کہ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔''[1] آزاد کا یہ نظریہ جدید لسانیات کی روشنی میں بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اردو نہ تو برج بھاشا سے نکلی ہے اور نہ ہی اس کا انحصار برج بھاشا پر ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو اپنے ارتقا کے دوران میں برج بھاشا سے کسی حد تک متاثر ضرور ہوئی ہے، بالخصوص سکندر لودھی سے لے کر شاہجہاں کے عہد تک جب کہ آگرہ ہندوستان کا پایۂ تخت رہا تھا (1505 تا 1648ء)۔ برج بھاشا اگرچہ متھرا، ورنداون، آگرہ اور اس کے نواحی علاقوں میں بولی جاتی تھی لیکن اس کے اثرات دہلی تک پھیلے ہوئے تھے۔ کیونکہ برج بھاشا کے مشہور شاعر رس خان کا تعلق دہلی ہی سے تھا۔ اس کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو (1325-1253ء) نے کبھی تو خالص برج بھاشا میں اور کبھی ملواں برج میں اشعار کہے۔[2] خسرو کے علاوہ نام دیو (1350-1270ء) اور کبیر داس (1494-1398ء) جیسے شاعروں کے یہاں بھی برج کے اثرات دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

شہنشاہ اکبر (متوفی 1605ء) کے دور میں جب کہ پایۂ تخت آگرہ تھا، اردو کا سابقہ براہِ راست برج بھاشا سے پڑا۔ اس دور میں برج بھاشا کو شمالی ہندوستان کی اعلیٰ ادبی زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ آگرہ نہ صرف برج بھاشا کے شاعروں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، بلکہ اس نے موسیقی اور سنگیت سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ برج بھاشا کے مشہور شاعر عبدالرحیم خانخاناں (1627-1556ء) اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ خود اکبر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے برج بھاشا میں دوہے کہے ہیں۔ چندر بلی پانڈے نے اپنی کتاب 'مغل بادشاہوں کی ہندی' (1940ء) میں اکبر سے منسوب چند دوہے نقل کیے ہیں جن سے اس کی برج بھاشا سے دلچسپی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ شاہجہاں (متوفی 1666ء) کے عہد میں 1648ء میں پایۂ تخت آگرے سے پھر دہلی منتقل ہوا جس کے نتیجے میں مختلف طبقے کے لوگ جن میں شاعر اور ادیب بھی تھے آگرے سے دہلی ہجرت کرنے لگے۔ کچھ دنوں تک

دہلی کے ادبی حلقوں میں برج بھاشا کا چرچا ضرور رہا اور اردو زبان پر اس کے اثرات بھی نمایاں رہے، لیکن رفتہ رفتہ اس کے اثرات کم ہونے لگے اور اٹھارھویں صدی کے وسط میں شاہ حاتم (1783-1699ء) کے زمانے میں تحریکِ اصلاحِ زبان کے تحت اس کے اثرات بالکل زائل ہو گئے۔

اگرچہ ساخت کے اعتبار سے اردو زبان برج بھاشا سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ یہ [و] پر ختم ہونے والی بولی ہے، تاہم اردو کے ارتقا میں برج بھاشا نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو اور برج بھاشا کا لسانی رشتہ صرف قدیم دور تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ مسعود حسین خاں نے لکھا ہے کہ "جدید اردو کا معیاری لہجہ برج بھاشا کا تتبع کرتا ہے۔"(3)

2- قدیم اردو پر برج بھاشا کے اثرات

(الف) صوتی اثرات

(1) برج بھاشا میں /ی/ کو /ج/ سے بدل دیا جاتا ہے۔ قدیم شعری تصنیف 'بکٹ کہانی' (محمد افضل افضلؔ) میں اس کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں، مثلاً جتن (سنسکرت: یتن):

ملن پاچھے بچھڑنا یوں کٹھن ہے
کہو اب زندگی کا کیا جتن ہے

زمانۂ حال کی اردو میں بھی جتن ہی رائج ہے۔ بعض دوسرے الفاظ میں بھی /ی/ کی جگہ /ج/ پائی جاتی ہے، مثلاً جمنا (یمنا)، جوگی (یوگی)، جو (یو)، وغیرہ۔

(2) سنسکرت کی معکوسی انفی آواز برج بھاشا میں /ن/ میں بدل جاتی ہے۔ صوتی تبدیلی کا یہی اصول اردو میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً رن (سنسکرت: रण)، درپن (سنسکرت: दर्पण)، چرن (سنسکرت: चरण)، وغیرہ۔ فائز دہلوی نے اپنے ایک شعر میں بدن کا قافیہ چرن باندھا ہے:

کنک سوں صفا دار ہے وہ بدن
کنول ڈال سے ہاتھ، گل سے چرن

'عاشور نامہ' (روشن علی) میں، جو سترھویں صدی کے نصف دوم کی شعری تصنیف ہے، لفظ 'رن' استعمال ہوا ہے:

لیکن پیاس سے تھے وہ خستہ جگر
گرے ضعف کھا کر وہ رن کے اندر

(3) برج بھاشا میں سنسکرت کی /و/ کی آواز کو /ب/ کی آواز میں بدل دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اردو زبان کی بھی یہی خصوصیت ہے، مثلاً برہ (سنسکرت: ورہ) بچن (سنسکرت: وَچن)، وغیرہ۔ یہاں اردو کی قدیم تصانیف، سے مثالیں پیش ہیں:

گھٹا کاری چہاروں اور چھائی
برہ کی فوج نے کینی چڑھائی
(بکٹ کہانی)

حسین شاہ بولے سنو یہ سخن
نصیب میں اگر جو ہوا ہے بچن
(عاشور نامہ)

(4) برج بھاشا میں /ل/ کی آواز /ر/ کی آواز میں بدل جاتی ہے۔ 'بکٹ کہانی' میں اس قسم کے بیشمار الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں /ل/ کی جگہ /ر/ ہے، مثلاً ڈارنا (ڈالنا)، بادر (بادل)، کاری (کالی)، ہوری (ہولی)، وغیرہ۔ امیر خسرو کے کلام سے ایک مثال ملاحظہ ہو:

گوری سووے سیج پر مکھ پر <u>ڈارے</u> کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چوندیس" (3)

'بکٹ کہانی' سے مثالیں:

سیہ <u>بادر</u> چہاروں اور چھائے
لیا مجھ گھیر پیو اجھوں نہ آئے
زنارِ ہجر سب دیہی برے ری
نہ آئے کنتھ گھر <u>ہوری</u> <u>جرے</u> ری

(5) برج بھاشا میں سنسکرت کی श اور ष کی آوازیں /س/ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اردو میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے، مثلاً دیس (دیش)، سندیسہ (سندیش संदेश)، دوس (دوش=दोष)، وغیرہ 'بکٹ کہانی' سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سندیسہ پیو کا مجھ کوں سناؤ
پیا کا مکھ بچن مکھ کوں لے آؤ

دہل رحلت کا بھادوں نے بجایا
اجھوں لگ سانورا پردیس چھایا
نہ مانا ان، کہوں کیا جتن کیجے
ارے اپنے کرم کو دوس دیجے

(6) سنسکرت کے مصمتی خوشے (Consonant clusters) برج بھاشا میں توڑ دیے جاتے ہیں۔ اردو کا بھی یہی رجحان ہے، مثلاً پیم (پریم प्रेम)، میت (متر मित्र) وغیرہ۔ 'بکٹ کہانی' میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، مثلاً:

مرے گل میں پڑی ہے پیم پھانسی
بھیا مرنا مجھے اور لوک ہانسی

نہیں اس جگ میں کوئی میت میرا
کہ میرا دکھ کہے پیوسوں سویرا

(ب) صرفی ونحوی اثرات

(1) برج بھاشا میں جمع بنانے کے لیے اسم کے آخر میں 'ن' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جمع بنانے کا یہ قاعدہ 'بکٹ کہانی' میں خاص طور سے پایا جاتا ہے، مثلاً پگ+ن=پگن:

سلام از طرفِ ایں غم خوار کیجو
پگن کوں پرس پاتی ہات دیجو

تمہیں ٹک کر پکڑ سمجھائے کہیو
پگن پر سیں دھر کے لائے کہیو

(2) ضمیرِ واحد متکلم ہوں (بمعنی مَیں) جو برج بھاشا کے ساتھ مخصوص ہے، 'بکٹ کہانی' میں بھی پائی جاتی ہے، مثلاً:

سکھی یہ بات سن، شادی بھئی ری
پیا کی باٹ دیکھن ہوں گئی ری

(3) برج بھاشا میں فعلِ حال بنانے کے لیے فعلی مادے کے آخر میں 'ت' جوڑ دیتے ہیں، مثلاً کرت، بھرت، جلت، چلت، وغیرہ۔ ایسے افعال 'بکٹ کہانی' میں متعدد بار استعمال ہوئے ہیں:

سبھی سکھیاں پیا سنگ سکھ کرت ہیں
ہمن سی پاپیاں نت دکھ بھرت ہیں

ہمن ایک آگ غم کی موں جلت ہیں
علاوہ دوسرے لوواں چلت ہیں

اردو نے اپنے ارتقا کے قدیم دور میں نواحِ دہلی کی کئی بولیوں کے اثرات قبول کیے جن میں سے ایک بولی برج بھاشا بھی ہے۔ یہ واو [و] پر ختم ہونے والی بولی ہے، یعنی اس بولی کے بعض اسما، افعال اور ضمائر [و] پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً بیٹو (بیٹا)، آیو (آیا)، میرو (میرا)، وغیرہ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی دور میں [و] پر ختم ہونے والے الفاظ کی شکلیں اختیار نہیں کیں۔

حواشی

1- محمد حسین آزاد، 'آبِ حیات' (کلکتہ: عثمانیہ بک ڈپو، ایڈیشن 1967ء)، ص 13۔

2- معروف ہندی اسکالر مجیب رضوی نے، جو اردو کے بھی عالم ہیں، یہ سوال اٹھایا کہ امیر خسرو (1253-1325ء) کی "ہندوی" سے کیا مراد ہے؟، نیز ان کی زبان کو کس بولی کے پیمانے سے ناپا جائے؟ ان کی زبان کھڑی بولی ہے یا برج؟ مجیب رضوی کے خیال کے مطابق خسرو کی زبان برج بھاشا تھی، لیکن اس کو انھوں نے "ہندوی" کا نام دیا۔ مجیب رضوی کے بقول "یہی زبان انھیں پٹیالی میں اپنی [ہندوستانی نژاد] ماں دولت ناز سے ورثے میں ملی اور اسی کے ذریعہ وہ فنِ موسیقی کے معلّم اور ماہر بنے۔" (ملاحظہ ہو مجیب رضوی کی کتاب 'خسرو نامہ' [نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1987ء])، ص 44 تا 48۔

3- مسعود حسین خاں، 'مقدمۂ تاریخِ زبانِ اردو' (علی گڑھ: سر سید بک ڈپو، ایڈیشن 1970ء)، ص 193۔

●●●

اردو رسم الخط کے بنیادی عناصر

1- زبان اور رسم الخط

ہر ترقی یافتہ زبان کی دو شکلیں ہوتی ہیں: ایک تکلمی یا تقریری اور دوسری تحریری۔ زبان کی تکلمی شکل اس کی قدیم شکل ہے اور تحریری شکل مابعد کا ارتقا۔ دنیا میں آج بھی لاتعداد زبانیں اور بولیاں محض اپنی تکلمی شکلوں ہی میں پائی جاتی ہیں اور تحریری شکلوں سے یکسر محروم ہیں۔ کسی زبان کی تحریری شکل اس زبان کو لکھنے کے طریقے پر مبنی ہوتی ہے جو اس زبان کا رسم الخط کہلاتا ہے۔ رسم الخط تکلمی یا بولی جانے والی زبان (Speech) کی محض نمائندگی یا ترجمانی کرتا ہے۔ اسے اصل زبان کا درجہ حاصل نہیں۔ اصل زبان تو تکلمی زبان ہوتی ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ رسم الخط ایسا ہو جو متعلقہ زبان کی صحیح اور سچی نمائندگی یا ترجمانی کر سکے۔ جو رسم الخط اپنی زبان کی جتنی بہتر اور صحیح نمائندگی کرتا ہے وہ اتنا ہی اچھا اور مکمل سمجھا جاتا ہے۔

کوئی بھی رسم خط ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہوتا۔ اُردو رسم خط میں اگرچہ بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں، لیکن بعض خامیاں بھی ہیں جنھیں وقتاً فوقتاً دور کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ انگریزی جیسی ترقی یافتہ اور بین الاقوامی زبان کا رسم الخط بھی خامیوں سے مبرا نہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی بہ لحاظِ تعداد سب سے بڑی زبان ہندی کے لیے استعمال کیے جانے والے دیوناگری رسم خط (ناگری لپی) میں بھی بہت سی خامیاں اور کمیاں موجود ہیں۔[(1)]

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر رسم خط کی اپنی جداگانہ اور انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسرے رسم خط سے ممیّز کیا جا سکتا ہے، نیز زبان اور رسم خط

میں تاریخی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے اتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

جس طرح زبان صوتی اکائیوں (Phonemic units) کا مجموعہ ہوتی ہے اسی طرح رسم خط تحریری اکائیوں (Graphemic units) کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انہی اکائیوں کو باہم ترتیب دینے سے لفظ بنتے ہیں اور لفظوں سے جملے تشکیل پاتے ہیں۔ کسی زبان کے رسم خط سے کلی واقفیت کے لیے اس کے تشکیلی یا ترکیبی عناصر سے واقفیت ضروری ہے۔ اردو رسم خط کی تشکیل تین طرح کے تحریری عناصر سے مل کر ہوئی ہے جو مفرد حروف، حروف کی ترکیبی شکلوں اور اعراب و علامات پر مشتمل ہیں۔

2- مفرد حروف

اردو کے مفرد حروف یا 'حروفِ تہجی' عربی و فارسی زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔ چند مفرد حروف خود اردو والوں کے وضع کردہ ہیں۔ اردو کے مفرد حروف (حروفِ تہجی) کی کل تعداد کے بارے میں عالموں میں ہمیشہ اختلافِ رائے رہا ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا نے اردو حروفِ تہجی کی تعداد 85 بتائی ہے۔[2] پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے نزدیک اردو حروفِ تہجی کی تعداد 47 ہے۔[3] شیخ چاند، اسمٰعیل میرٹھی، حیات اللہ انصاری[4] رشید حسن خاں[5] اور بعض دوسرے عالموں اور قاعدہ نویسوں کے نزدیک بھی اردو حروفِ تہجی کی تعداد جدا جدا ہے۔ اردو کے بیشتر قاعدہ نویس ہائے مخلوط (دوچشمی ھ) سے تشکیل پانے والی تحریری شکلوں، مثلاً پھ بھ تھ دھ کھ گھ، وغیرہ کو بھی حروف کا درجہ دیتے ہیں اور بعض اہلِ علم ہمزہ (ء) کو بجائے علامت کے حرف تسلیم کرتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں جدید لسانی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور سائنسی انداز پر اردو کے جو قاعدے (Primers) ترتیب دیے گئے ہیں ان میں حروفِ تہجی کی کل تعداد 36 متعین کی گئی ہے۔[6] اور ان میں عربی و فارسی کے وہ ہم صوت حروف بھی شامل ہیں جو بقولِ مسعود حسین خاں ''مردہ لاشیں ہیں، جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔''[7]

ہائیہ آوازوں (Aspirates) والی تحریری شکلوں، مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، کھ، گھ وغیرہ کو مفرد حروف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ یہ حرف کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں۔ لسانیات کی رو سے 'حرف' سب سے چھوٹی تحریری اکائی ہوتی ہے جس کے مزید ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔ اس تحریری اکائی کو لسانیاتی اصطلاح میں 'ترسیمہ' (Grapheme) کہتے ہیں، مثلاً ب، پ، ت، د، ج، گ، وغیرہ۔ مخلوط حروف، مثلاً پھ، بھ، تھ، جھ، دھ، کھ، وغیرہ کو حرف یا سب سے چھوٹی تحریری اکائی (ترسیمہ) کا درجہ اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ ان کی تشکیل دو تحریری عناصر پ+ ھ (= پھ) یا د+ ھ (= دھ) کی ترکیب سے عمل میں آئی ہے۔ اسی لیے انھیں اردو کے حروفِ تہجی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ (8)

اسی طرح ہمزہ (ء) بھی اردو میں حرف نہیں، بلکہ محض ایک تحریری علامت ہے جس کا استعمال مصوتی تسلسل (Vowel sequence) کے لیے کیا جاتا ہے، مثلاً بھائی [bha+i]، فائدہ [fa+ida]، سوئی [su+i]، وغیرہ۔ ان الفاظ میں علی الترتیب الف+ ء، اور و+ ء کی حیثیت مصوتی تسلسل کی ہے جس کی تحریری نمائندگی کے لیے اردو میں ہمزہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

بہ استثنائے ہمزہ اردو کے حروفِ تہجی کی کل تعداد 36 ہے جو یہ ہیں:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز
ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل
م ن و ہ ی ے

ان میں سے 28 حروف اصلاً عربی کے ہیں جو 'ترتیبِ ابجد' کے لحاظ سے اس طرح ہیں:

ا ب ج د	ہ و ز
ابجد	ہوز
ح ط ی	ک ل م ن

حلقی	کلمن
س ع ف ص	ق ر ش ت
سعفص	قرشت
ث خ ذ	ض ظ غ
ثخذ	ضظغ (9)

جب عربی رسم خط ایران پہنچا اور فارسی زبان کے لیے اختیار کیا گیا تو وہاں چار نئے حروف وضع کیے گئے جو یہ ہیں:

پ چ ژ گ

یہ حروف عربی میں موجود نہ تھے، کیوں کہ ان سے ظاہر کی جانے والی اصوات کا وجود عربی میں نہ تھا۔ یہ حروف عربی کے چار موجودہ حروف ب ح ر ک کی بنیاد پر نقطوں اور مرکز کے اضافے سے وضع کیے گئے۔ یعنی ب سے پ، ح سے چ، ر سے ژ اور ک سے گ بنا لیے گئے۔ اس طرح فارسی حروف تہجی کی کل تعداد 32 ہو گئی۔

یہی عربی فارسی (Perso-Arabic) رسم خط جب ہندوستان پہنچا اور اردو کے لیے اختیار کیا گیا تو بعض حروف کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کیونکہ اردو میں تکلمی آوازیں (صوتی اکائیاں) عربی فارسی سے زیادہ تھیں اور ان کی نمائندگی کرنے والے حروف کم تھے، یعنی ان کی تعداد صرف 32 تھی، چنانچہ یہاں مزید چار نئے حروف وضع کیے گئے جو یہ ہیں:

ٹ ڈ ڑ ے

اس طرح اردو حروف تہجی کی کل تعداد 36 ہو گئی۔ ان حروف کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ ان میں کئی کئی حروف بہ اعتبار ہیئت یا صوری لحاظ سے ایک جیسے ہیں۔ ان میں صرف نقطوں اور بعض حروف میں چھوٹی طوئے اور مرکز کا فرق پایا جاتا ہے، مثلاً ب پ ت ٹ ث/ د ڈ ذ/ س ش/ ک گ، وغیرہ۔

خالص صوری یا ہیئتی ترتیب کے لحاظ سے اردو کے 36 حروف کو ذیل کے 18 زمروں یا گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1)	ا	گروپ:	ا م
(2)	ب	گروپ:	ب پ ت ٹ ث
(3)	ح	گروپ:	ج چ ح خ
(4)	د	گروپ:	د ڈ ذ
(5)	ر	گروپ:	ر ڑ ز ژ
(6)	س	گروپ:	س ش
(7)	ص	گروپ:	ص ض
(8)	ط	گروپ:	ط ظ
(9)	ع	گروپ:	ع غ
(10)	ف	گروپ:	ف
(11)	ق	گروپ:	ق
(12)	ک	گروپ:	ک گ
(13)	ل	گروپ:	ل
(14)	ن	گروپ:	ن
(15)	و	گروپ:	و
(16)	ہ	گروپ:	ہ
(17)	ی	گروپ:	ی
(18)	ے	گروپ:	ے

ان میں سے ہر گروپ کی نمائندگی اسی گروپ کے ایک حرف سے ہوتی ہے جسے بنیادی حرف یا 'بنیادی ترسیمہ' (Basic grapheme) کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح اردو کے بنیادی حروف یا بنیادی ترسیموں کی تعداد 18 قرار پاتی ہے۔ ان کی تدریسی نقطۂ نظر سے بے حد اہمیت ہے، کیوں کہ مبتدیوں کو اگر یہ 18 بنیادی حروف پہلے سکھا دیے جائیں تو ان کے لیے بقیہ 18 حروف کا سیکھنا بے حد آسان ہو جائے گا۔ یہ بات اوپر بتائی جا چکی ہے کہ اردو حروفِ تہجی کی کل تعداد 36 ہے۔ ان کا طرزِ تحریر 'نستعلیق' کہلاتا ہے۔[10]

3- حروف کی ترکیبی شکلیں

اردو میں جب ایک حرف دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے تو اس کی شکل قدرے بدل جاتی ہے، لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ حرف پہچانا نہ جاسکے۔ حرف کی اسی بدلی ہوئی شکل کو 'ترکیبی شکل' کہتے ہیں۔ ترکیبی شکلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ متعلقہ مفرد حروف کے مقابلے میں چھوٹی اور مختصر ہوتی ہیں، نیز لکھنے میں جگہ کم گھیرتی ہیں اور وقت بھی کم لیتی ہیں۔ لسانیاتی اصطلاح میں حرف کی بدلی ہوئی یا ترکیبی شکل کو 'ذیلی ترسیمیہ' (Allograph) کہتے ہیں۔ ترکیبی شکل بالعموم متعلقہ حرف کے سرے یا اس کے ابتدائی حصے پر مشتمل ہوتی ہے جس کا پہچاننا آسان ہوتا ہے، مثلاً ج، س یا ک کی ترکیبی شکلیں علی الترتیب جب، سب یا کب کی ابتدائی شکلوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اردو کے تمام 36 حروف ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر لکھے جاسکتے ہیں اور اپنی ترکیبی شکلیں وضع کر سکتے ہیں، لیکن نو حروف، یعنی ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و ایسے حروف ہیں جو اپنے بعد کے کسی بھی حرف کے ساتھ ملا کر نہیں لکھے جاسکتے، مثلاً ادب، دوا، ڈالی، ذکر، روزہ، غور، وغیرہ۔ اردو حروف کی 18 ترکیبی شکلوں (Allographs) سے متعلق حسب ذیل مشاہدات پیش کیے جاتے ہیں:

(1) حروف ا ر ڑ ز ژ و اگرچہ اپنے پہلے واقع ہونے والے حروف کے ساتھ ملا کر لکھے جاسکتے ہیں، لیکن ان میں اور ان کی ترکیبی شکلوں میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوتا، مثلاً نام، گرم، بڑی، بزم، پژمردہ، بولی، وغیرہ۔ البتہ کبھی کبھی 'ر' کو لمبی کشش کے ساتھ بھی لکھ دیا جاتا ہے مثلاً، کمر، نظر، تیر، وغیرہ۔

(2) حروف ط ظ لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ترکیب دیے جانے پر یکساں حالت میں رہتے ہیں اور ان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً طاہر، بطخ، خط/ظفر، نظیر، حفیظ، وغیرہ۔

(3) حروف د ڈ ذ جب اپنے پہلے واقع ہونے والے حروف کے ساتھ ملا کر لکھے

جاتے ہیں تو ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں، مثلاً بعد، کھڈ، عذر، وغیرہ۔ اس طرح ان تینوں حروف کی صرف ایک ترکیبی شکل [ر] قرار پاتی ہے اور اس کے اوپر نقطے اور چھوٹی طوئے [ط] کے استعمال سے ان میں امتیاز کیا جاتا ہے۔

(4) حروف ج چ ح خ لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ترکیب دیے جاسکتے ہیں۔ ابتدائی اور درمیانی حالتوں میں واقع ہونے پر ان کی صرف ایک بنیادی ترکیبی شکل قرار پاتی ہے جو ح کا سرا یا ابتدائی حصہ ہے جسے لفظ 'حب' میں ہم دیکھ سکتے ہیں اور نقطوں کے فرق سے ان میں امتیاز کرسکتے ہیں، مثلاً جمع، چمن، حمد خوش/مجلس، بچپن، قحط، سخت، وغیرہ۔ مذکورہ حروف جب لفظ کے آخر میں آتے ہیں تو ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، مثلاً بیج، بچ، صبح، تاریخ، وغیرہ۔

(5) حروف س ش، ص ض، ف ق، ل، م بھی لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ترکیب دیے جاسکتے ہیں۔ ابتدائی اور درمیانی حالتوں میں واقع ہونے پر ان کی صرف ایک ایک ترکیبی شکل نمودار ہوتی ہے جو ان حروف کا ابتدائی حصہ یا سرا ہوتی ہے، مثلاً سب، شب/مست مشت (س ش)، صفت، ضعف، /مصدر مضبوط (ص ض)، فائدہ قاعدہ/نفل نقل (ف ق)، لوگ/خلق (ل)، مور/نمونہ (م)، وغیرہ۔ س ش کی بنیادی ترکیبی شکل ایک ہے۔ ان میں نقطوں سے امتیاز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ص ض کی بھی ایک ہی ترکیبی شکل ہے اور ان میں بھی نقطہ ہی وجہِ امتیاز قرار پاتا ہے۔ اگرچہ حروف ف ق کی ہیئت میں فرق ہے، لیکن ان کی بھی بنیادی ترکیبی شکل ایک ہے۔ ان میں بھی نقطوں کے فرق سے امتیاز کیا جاتا ہے۔ البتہ درمیانی حالت میں واقع ہونے پر ان کے بیچ کا حصہ تھوڑا کھلا رہتا ہے۔

حروف س ش، ص ض، ف ق، ل، م، جب لفظ کے آخر میں وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، مثلاً عکس نقش (س ش)، حصص فیض (ص ض)، سیف، شفق (ف ق)، مثل (ل)، ختم (م)، وغیرہ۔ ان سہ حرفی الفاظ کی اگر ابتدائی اور درمیانی دونوں ترکیبی شکلیں حذف کردی جائیں تو باقی ماندہ حصے متذکرہ مفرد حروف ہوں گے۔

(6) حروف ک گ لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ترکیب دے جاسکتے ہیں۔ لفظ کی ابتدائی اور درمیانی حالتوں میں ترکیب دیے جانے پر ان کے محض شروع کے حصے ہی استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً کب گز/شکر بیگم، وغیرہ۔ البتہ ک گ جب الف اور لام کے ساتھ ترکیب دیے جاتے ہیں تو ابتدائی اور درمیانی دونوں حالتوں میں ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں مثلاً کام گام/شکل بگل، وغیرہ۔ جب ک گ لفظ کے آخر میں وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، مثلاً نیک، نگ، وغیرہ۔ ک گ میں چوں کہ صرف مرکز کا فرق پایا جاتا ہے اس لیے ان کی صرف دو بنیادی ترکیبی شکلیں قرار دی جاسکتی ہیں، یعنی کب اور کل کی ابتدائی شکلیں۔

(7) حروف ع غ بھی لفظ کی ابتدائی، درمیانی اور آخری حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ترکیب دیے جاسکتے ہیں۔ ان حالتوں میں ان کی تین بنیادی ترکیبی شکلیں رونما ہوتی ہیں اور ان کے نقطے میں فرق سے امتیاز کیا جاتا ہے۔ جب ع غ ابتدائی حالت میں واقع ہوتے ہیں تو ان کا ابتدائی حصہ [ء] ترکیبی شکل قرار پاتا ہے، مثلاً علم، غصہ، وغیرہ۔ درمیانی حالت میں ان کی شکل مختصر اور پُر ہو جاتی ہے، مثلاً نعمت، نغمہ، وغیرہ اور آخری حالت میں ان کی ترکیبی شکل ان کی درمیانی شکل کی مکمل صورت یا ہیئت میں تبدیل ہو جاتی ہے، مثلاً شمع، تیغ، وغیرہ۔

(8) حروف ب پ ت ٹ ث ن ی ے جن کی تعداد آٹھ ہے اپنی ابتدائی، درمیانی اور آخری تینوں حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ترکیب دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی ترکیبی شکلیں صرف تین قرار پاتی ہیں، یعنی بن، بم، بس کی ابتدائی شکلیں۔ ان میں نقطوں کی کمی بیشی یا نقطوں کے اوپر نیچے یعنی فوق النقاط اور تحت النقاط ہونے سے معنی میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ چھوٹی طوئے بھی وجہِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ اگرچہ حروف ن ی ے کی مفرد شکلیں ب گروپ کے حروف سے مختلف ہیں، لیکن ان کی ترکیبی شکلیں ب گروپ کے حروف ہی کی ترکیبی شکلیں ہیں۔ ان میں صرف نقطوں سے فرق کیا جاتا ہے، مثلاً بام نام، پاس تاش،

ثانی پانی، یاد باد، بس پس، ٹوٹی ٹوپی، بج بخ، نم ثم، تم بم، ثواب نواب، یورپ پورب، وغیرہ۔ یہ مثالیں ب گروپ کے حروف کی ترکیبی شکلوں کی لفظ کی ابتدائی حالت کی ہیں۔ درمیانی حالت میں ب گروپ کی صرف اول الذکر ترکیبی شکل [ر] کا ہی استعمال ہوتا ہے، مثلاً لباس، سپارہ ستارہ لٹو/نعیم نیچا، وغیرہ۔

لفظ کے آخر میں واقع ہونے پر مذکورہ حروف کی ترکیبی شکلوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، مثلاً کب، چپ، بچت، نٹ کھٹ، بحث، وطن، کی، سچے، وغیرہ۔

(9) ہائے ہوز (ہ) بھی لفظ کی ابتدائی درمیانی اور آخری حالتوں میں دوسرے حروف کے ساتھ ملا کر لکھی جا سکتی ہے۔ ان حالتوں میں اس کی علی الترتیب چار ترکیبی شکلیں رونما ہوتی ہیں، مثلاً ہاتھ، نہر، گلہ، جگہ اور۔ آخری حالت میں واقع ہونے پر لٹکن لگائی جاتی ہے لیکن اُس حالت میں جب کہ ہائے ہوز ہائے ملفوظی ہو۔ لیکن اگر ہائے ہوز کی حیثیت ہائے مختفی کی ہے، تب لٹکن نہیں لگائی جائے گی، مثلاً گلہ (آخری حرف ہائے مختفی)، اور جگہ (آخری حرف ہائے ملفوظی)۔ ان دونوں مثالوں میں آخری حرف ہائے ہوز (ہ) ہے۔ اب لٹکن لگانے کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ مرکب اضافی بناتے وقت اکثر لٹکن لگا بھی دی جاتی ہے، مثلاً وجہِ امتیاز۔ آخرِ لفظ واقع ہونے والی ہائے ہوز اگر غیر ملفوظی ہے تو لٹکن کا لگانا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے، مثلاً سکینہ، ثمینہ، زینہ، نتیجہ، ہفتہ، وسوسہ، وغیرہ الفاظ بغیر لٹکن کے ہی لکھے جاتے ہیں۔

جدول-1

(حروف کی ترکیبی شکلیں)

حروف	بنیادی ترکیبی شکلیں	مثالیں
ا	×	لا، بات
و	×	سو، بول

ط ظ	×	طائر/ بطخ/ خط
ر ڑ ز ژ	×	تر، جز، بزم (کشش کے ساتھ کمر، نظر، تیز، وغیرہ)
د ڈ ذ	ر	ندی، لڈو، عذر
ج چ ح خ	ح	حب جب چپ خوش/ مجلس مچل محل شخص
س ش	س	سب شب/ مست مشت
ص ض	ص	صدی ضدی/ قصد فضا
ف ق	و	فائدہ قاعدہ/ نفس نقش (درمیانی حالت میں واقع ہونے پر اس ترکیبی شکل کے بیچ کا حصہ تھوڑا کھلا رہتا ہے)
ل	ل	لکیر، لوگ/ صلح
م	م	مبارک، مزدور/ احمد
ک گ	ک ک	کنارہ گناہ/ بکری پگڑی/ کام گام، کل گل/ شکار سگار، شکل، بگل
ع غ	ع ع ع	عالی غالی/ معرب مغرب/ نفع تیغ
ب پ ت ٹ ث ن ی ے	ٮ / ر / ل	بانی پانی ثانی نانی، بم تم نم، بچہ پختہ تخت نحو، بس پس نس یونس/ غبارہ سپارہ، ختم نعیم، گنج مطبخ
ہ	ہا ہر ھر	ہار/ کہاں/ شہ

4- اعراب وعلامات

اردو میں اعراب وعلامات کا باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے، لیکن اس کے بروئے عمل لانے میں ہمیشہ بے اعتدالی برتی جاتی رہی ہے۔ اردو کے مختلف قاعدوں (Primers) میں اعراب وعلامات کے استعمال کا انداز مختلف ہوتا ہے اور مصنف اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرتا ہے۔ اردو کی علمی کتابوں، نیز اعلیٰ سطح کے لیے لکھی گئی درسی کتابوں میں اعراب و علامات کا استعمال شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن اردو رسم خط میں ان کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اعراب وعلامات کے استعمال میں لسانیات سے بہت مدد لی جاسکتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ ان کا استعمال کہاں، کیسے اور کس صوتی مقصد اور اصول کے تحت کیا جانا چاہیے، نیز ان کے ذریعے بولی جانے والی آوازوں کی صحیح نمائندگی کس طرح ممکن ہے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اردو رسم خط میں اعراب وعلامات کی حیثیت محض ثانوی ہے، کیونکہ بنیادی اور اولین حیثیت حروف اور ان کی ترکیبی شکلوں یا ذیلی حروف کو حاصل ہے۔ اعراب وعلامات، حروف و ذیلی حروف کی معاونت کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے بولی جانے والی آوازوں یا صوتیوں (Phonemes) کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی ہوسکے۔ اعراب وعلامات ایک نوع کے مختصر تحریری نشانات (Markers) ہوتے ہیں جنھیں اگرچہ حروف کا درجہ حاصل نہیں، لیکن ان کی اپنی تحریری پہچان ضرور ہے۔ تاہم حروف کے بغیر ان کا وجود بے معنی وبے سود ہے۔

اردو رسم خط میں اعراب وعلامات مصوتی (Vocalic)، مصمتی (Consonantal)، غنائی (Nasalizational)، اور قواعدی (Grammatical) کردار ادا کرتے ہیں۔ انھیں بنیادوں پر ان کی گروہ بندی مصوتی، مصمتی، غنائی اور اضافی علامات کے طور پر کی گئی ہے۔

(الف) مصوتی علامات

مصوتی علامات، مصوتوں (Vowels) یا مصوتی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کا استعمال بالعموم مصوتوں اور بعض مصمتوں/ نیم مصمتوں کی نمائندگی کرنے والے حروف

کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان کی تعداد نو ہے جو درج ذیل ہے:

(1) زبر (ــَـ): یہ مختصر مصوتے [a] کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو میں لفظ کی ابتدائی حالت میں زبر کا استعمال الف کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً اَدب، اَثر، اَشک، وغیرہ۔ ان مثالوں میں زبر الف کے ساتھ مل کر مختصر مصوتے [a] کی نمائندگی کرتا ہے۔ انگریزی میں اس کی مثال about, againوغیرہ ہے۔ لیکن درمیانی حالت میں واقع ہونے پر یہ مصمتوں (Consonants) اور نیم مصوتوں (Semi-vowels) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مثلاً دَم، رَس، وَرق، وغیرہ۔ اول الذکر دو الفاظ میں پہلی آواز [د] اور [ر] مصمتہ ہے اور دوسری آواز مختصر مصوتہ [a]، اسی مختصر مصوتے کی نمائندگی کے لیے زبر کا استعمال ہوا ہے۔ اسے صوتیاتی رسم الخط (Phonetic writing) میں یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے: [dam] اور [ras]۔ آخر الذکر لفظ وَرق میں واو نیم مصوتہ ہے اور اس کے بعد کی آواز مختصر مصوتہ [a] ہے، یعنی [waraq]۔ اسے روایتی قواعد میں 'فتحہ' کہتے ہیں۔

(2) زیر (ــِـ): یہ مختصر مصوتے [i] کی نمائندگی کرتی ہے۔ زبر کی طرح یہ بھی لفظ کی ابتدائی حالت میں الف کے ساتھ استعمال ہوتی ہے، مثلاً اِس، اِسم، اِشارہ، وغیرہ۔ لیکن درمیانی حالت میں یہ مصمتے اور نیم مصوتے کے ساتھ واقع ہوتی ہے، مثلاً نِگاہ، مِثال، وِداع، وغیرہ۔ اول الذکر دو الفاظ میں پہلی آواز مصمتہ ہے اور دوسری آواز مختصر مصوتہ [i]، یعنی niga:h اور misa:l۔ اسی مختصر مصوتے کی نمائندگی کے لیے زیر کا استعمال ہوا ہے۔ آخر الذکر لفظ وِداع میں پہلی آواز نیم مصوتہ ہے اور دوسری آواز مختصر مصوتہ [i]۔ اسے 'کسرہ' کہتے ہیں۔

(3) پیش (ــُـ): یہ مختصر مصوتے [u] کی نمائندگی کرتا ہے۔ لفظ کی ابتدائی حالت میں یہ الف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مثلاً اُس، اُدھر، اُجالا، وغیرہ۔ لیکن درمیانی حالت میں یہ مصمتے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مثلاً دُم، سُن، مُراد، وغیرہ۔ ان الفاظ میں پہلی آواز مصمتہ ہے اور دوسری آواز مختصر مصوتہ [u] یعنی dum, sun, mura:d وغیرہ جس کی نمائندگی کے لیے پیش کا استعمال ہوا ہے۔ اسے 'ضمہ' کہتے ہیں۔

زبر، زیر، پیش کو قواعد نویس 'حرکت' کہتے ہیں اور جس حرف پر حرکت واقع ہوتی ہے وہ حرف 'متحرک' کہلاتا ہے۔ حرکت (زبر، زیر، پیش) کو 'اعراب' بھی کہتے ہیں۔

(4) (ٓ): یہ طویل مصوتے [a:] کی علامت ہے، لیکن اس کا استعمال لفظ کی ابتدائی اور درمیانی دونوں حالتوں میں ہمیشہ الف کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً آدم، مآخذ، وغیرہ۔ جس الف پر مد ہوتا ہے اسے 'الفِ ممدودہ' کہتے ہیں۔

(5) کھڑی زیر (ٖ): یہ طویل مصوتے [i:] یا یائے معروف کی علامت ہے، مثلاً میل، تیر، شیر وغیرہ۔ لفظ کی ابتدائی حالت میں یائے معروف کے ساتھ الف کا استعمال بھی ہوتا ہے، مثلاً ایمان، ایثار، ایکھ، وغیرہ۔ ان الفاظ میں الف اور یائے معروف مل کر طویل مصوتے [i:] کی نمائندگی کرتے ہیں، یعنی i:ma:n, i:sa:r, i:kh، وغیرہ۔

(6) الٹا پیش (ٗ): یہ طویل مصوتے [u:] یا واوِ معروف کی علامت ہے۔ اس کا استعمال اردو میں واو [و] کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نشان و کے اوپر بنایا جاتا ہے، مثلاً دوٗر، روٗح، سوٗکھا، وغیرہ۔

(7) کھڑا زبر (ٰ): یہ طویل مصوتے [a:] کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ متعلقہ حرف کے اوپر استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً رحمٰن، اسمٰعیل، یٰسین، وغیرہ۔ جس حرف کے اوپر یہ واقع ہوتا ہے اس کے بعد کی آواز طویل مصوتہ [a:] کی ہوتی ہے جس کی نمائندگی یہی کھڑا زبر کرتا ہے، یعنی rahma:n, isma: i:l, ya:si:n، وغیرہ۔

(8) الٹا جزم (ۛ): یہ دہرے مصوتے (Diphthongs) اَے [ai] اور اَو [au] کی نمائندگی کرتا ہے، مثلاً پیدا، میدان، دوٗلت، سوٗ، وغیرہ۔ اس کا استعمال ہمیشہ [اے] یا [او] کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن جب لفظ کی ابتدائی حالت میں دہرے مصوتے واقع ہوتے ہیں تو ان کی ابتدا میں الف [ا] کا اضافہ لازمی ہوتا ہے، مثلاً ایسا، اوزار، وغیرہ۔ قواعد نویسوں نے ایسی [ے] اور [و] کو جس پر الٹا جزم استعمال کیا جاتا ہے علی الترتیب یائے لین اور واوِ لین کہا ہے اور الٹا جزم کو 'جزمِ مجہول' کا نام دیا ہے۔

(9) ہمزہ (ء): اردو میں ہمزہ حرف نہیں، محض ایک علامت ہے۔ یہ مصوتی تسلسل (Vowel sequence) کی علامت ہے۔ جب کسی لفظ میں دو مصوتے (Vowels) یکے بعد دیگر واقع ہوتے ہیں تو تحریر میں ان کی نمائندگی کے لیے ہمزہ کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً بھائی، سوئی، آئینہ، وغیرہ۔ ان الفاظ میں علی الترتیب a:+i: (بھائی) اور u:+i: (سوئی)، کا استعمال ہوا ہے جسے صوتیاتی اصطلاح میں مصوتی تسلسل کہتے ہیں۔ اُردو رسم خط میں اسی کی نمائندگی کے لیے ہمزہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو میں صرف 'مسئلہ' ایک ایسا لفظ ہے جس میں ہمزہ تو ہے لیکن یہ مصوتی تسلسل کی نمائندگی نہیں کرتا، بلکہ س کے بعد زبر کے ساتھ مل کر صرف مختصر مصوتے [a] کو ظاہر کرتا ہے، یعنی [masala]۔ اس لفظ کا پہلا صوت رکن (Syllable)، [س=s] پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا صوت رکن [ء=a] سے شروع ہوتا ہے۔ اسے مستثنیات میں رکھا جاسکتا ہے۔

اردو رسمِ خط میں ہمزہ کے استعمال کے تجزیے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اردو میں ہمزہ کا استعمال (بہ استثنائے 'مسئلہ') مصوتی تسلسل کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن ہر مصوتی تسلسل کے لیے ہمزہ کا استعمال نہیں کیا جاتا، مثلاً تعجب (ta+ajjub)، تاسف ta+assuf، ماٰثر (ma+a:sir)، معاون (ma+a:vin)، اور لعین (la+i:n) جیسے الفاظ میں ابتدائی اصوات ت، م، ل، کے بعد مصوتی تسلسل واقع ہوتا ہے، لیکن اردو رسمِ خط میں ان کی نمائندگی ہمزہ سے نہیں ہوتی ہے۔

(ب) مصمتی علامات

مصمتی علامات مصمتوں (Consonants) یا مصمتی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کا استعمال مصمتوں کی نمائندگی کرنے والے حروف کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی تعداد چار ہے:

(1) تشدید (ّ): تشدید وہ تحریری علامت ہے جو کسی مصمتے (یا حرف) کی تکرار کو یا اس کی دو مرتبہ ادائیگی کو ظاہر کرتی ہے، مثلاً مِلّت (مل+لت)، قصّہ (قص+صہ)، لقّو

(لٹ+ٹو)، وغیرہ۔ یہ تینوں الفاظ دوصوت رکنی (Bisyllabic) ہیں۔ ان الفاظ میں پہلا صوت رکن (Syllable) جس مصمتے (یا حرف) پر ختم ہوتا ہے، دوسرا صوت رکن اسی مصمتے سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی مصمتی تکرار کی نمائندگی کے لیے تحریر میں تشدید کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس حرف پر تشدید بنائی جاتی ہے وہ حرف 'مشدّد' کہلاتا ہے۔

(2) دو چشمی (ھ): یہ علامتِ ہائیت (Aspiration) ہے۔ اسے مخلوط ھ یا 'ہائے مخلوط' بھی کہتے ہیں۔ دو چشمی ھ کا شمار اردو کے حروفِ تہجی میں نہیں کیا جا سکتا کہ یہ محض ایک علامت ہے، حرف نہیں۔ اس سے مصمتی آوازوں (Consonants) کی ہائیت (=ہکاریت) ظاہر کی جاتی ہے، مثلاً پھ بھ تھ دھ کھ گھ، وغیرہ۔ ہائیت اردو میں بامعنی (Distinctive) ہے، یعنی اس کی وجہ سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً گہنا (ornament): گھنا (dense)، بہوکا (بچہ): بھوکا (بچہ)، وغیرہ۔ اسی لیے اردو رسم خط میں اس کا برتنا لازمی ہے، ورنہ ابہام (Ambiguity) پیدا ہو سکتا ہے۔

(3) جزم (ْ): جزم مصمتی خوشے (Consonant cluster) کی علامت ہے۔ جب دو مختلف مصمتے ایک ساتھ ادا کیے جائیں اور ان کے درمیان میں کوئی مصوتہ واقع نہ ہو تو ایسی صورتِ حال کو 'مصمتی خوشہ' کہیں گے۔ جزم اسی مصمتی خوشے کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً صدْر، ختْم، وزْن، وغیرہ۔ ان میں علی الترتیب در [-dr]، ت م [-tm]، زن [-zn] مصمتی خوشے ہیں۔ ان سہ حرفی الفاظ کے دوسرے حرف پر جزم کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس حرف پر جزم لگائی جاتی ہے اسے 'مجزوم' کہتے ہیں۔

(4) تنوین (ً): تنوین بھی ایک مصمتی علامت ہے جس کا استعمال بعض عربی نژاد الفاظ میں انفی مصمتے (Nasal consonant) کی تحریری نمائندگی کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ بالعموم آخرِ لفظ الف پر دوزبر لگا کر ظاہر کی جاتی ہے، مثلاً قصداً، مجبوراً، فوراً، عموماً، یقیناً، وغیرہ۔ تنوین کا استعمال بعض عربی الفاظ کے آخر میں واقع ہونے والی گول [ۃ] کے ساتھ بھی ہوتا ہے جو ترکیبی حالت میں [تہ] میں بدل جاتی ہے، مثلاً اشارۃً، ارادۃً، دفعتہً، نسبتہً، وغیرہ۔

(ج) غنائی علامات

یہ وہ علامات ہیں جو غنّہ یا انفیت (Nasalization) کو ظاہر کرتی ہیں۔ مصوتے (Vowel) کی ادائیگی کے وقت نرم تالو (Soft palate) اوپر کی جانب اٹھا ہوتا ہے جس سے ناک کا راستہ یا انفی جوف (Nasal cavity) بند رہتا ہے، لیکن جب یہی نرم تالو نیچے کو جھک جاتا ہے تو انفی جوف (Nasal cavity) کھل جاتا ہے اور پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا مصوتوں کی ادائیگی کے وقت ناک کے راستے (انفی جوف) سے خارج ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں جھنکار (Resonance) پیدا ہو جاتی ہے۔ غنّہ یا انفیت کے معرضِ وجود میں آنے کی یہی وجہ ہے۔ اردو کے تمام مصوتے بشمول دُہرے مصوتوں (Diphthongs) میں غنّہ پیدا کیا جا سکتا ہے یا یہ انفیائے (Nasalized) کیے جا سکتے ہیں۔ اردو رسمِ خط میں غنّہ کو ظاہر کرنے کے لیے دو علامتیں رائج ہیں:

(1)　نونِ غنّہ (ں): یہ بغیر نقطے کا نون ہے جس سے مصوتوں کی انفیت (غنّہ) کو ظاہر کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اسے 'نونِ غیر منقوط' بھی کہتے ہیں۔ یہ منفرد بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ترکیبی حالت میں بھی۔ یہ مفرد حالت میں صرف الف اور واو کے بعد واقع ہوتا ہے، مثلاً ماں، جہاں، کہکشاں، سائنس داں، خوں، گردوں، مجنوں، کہوں، وغیرہ۔ حرف ی/ے کے ساتھ یہ ترکیبی حالت میں آخرِ لفظ واقع ہوتا ہے مثلاً زمیں، کہیں، نہیں، مکیں/دیں، لیں، سنیں، جائیں، وغیرہ۔ اپنی اصلی حالت میں یہ علامت صرف لفظ یا صوت رکن کے آخر میں ہی واقع ہوتی ہے، مثلاً ماں، کہاں، جہاں (مفرد حالت میں)، اور کہیں، نہیں، زمیں (ترکیبی حالت میں)، وغیرہ۔ اس کا شمار اردو کے حروفِ تہجی میں نہیں کیا جاتا، کیوں کہ یہ حرف نہیں ہے محض ایک علامت۔

(2)　الٹا قوس (ں): یہ نونِ غنّہ کی چھوٹی اور مختصر تحریری شکل ہے۔ چوں کہ یہ قوس کے علی الرغم نیچے کی جانب نیم دائرہ بناتی ہے، اس لیے اسے الٹا قوس کہتے ہیں۔ غنّہ جب لفظ کی درمیانی حالت میں واقع ہوتا ہے تو اسے ظاہر کرنے والے نون پر الٹا قوس بنا دیا

جاتا ہے، مثلاً ہنسؔ (بچہ روتے روتے ہنسؔ دیا)، کھانسی، چاںٔد، وغیرہ۔ اردو میں غنہ جب درمیانی حالت میں واقع ہوتا ہے تو اس کی تحریری نمائندگی حرفِ ن کی ترکیبی شکلوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ چنانچہ غنہ کو ظاہر کرنے کے لیے ن کی انھیں ترکیبی شکلوں کے اوپر الٹا قوس بنایا جاتا ہے، ورنہ معنی میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے، مثلاً ہنسؔ (ایک پرندہ): ہنس (ہنسنا)، وغیرہ۔ لفظ کی آخری حالت میں بھی غنہ کی وجہ سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً کہا: کہاں، کہی: کہیں، ہے: ہیں، تھی: تھیں، مے (= شراب): مَیں (ضمیرِ واحد متکلم)، وغیرہ۔

(د) اضافی علامات

اضافی علامات اضافت یعنی نسبت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کے استعمال سے کا/ کی/ کے کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اردو میں فارسی کے اضافی مرکبات (مضاف و مضاف الیہ پر مشتمل مرکبات) کثرت سے استعمال کیے جاتے ہیں جن میں فارسی کی تین اضافی علامات: زیر (کسرہ)، ہمزہ اور یائے مجہول (بڑی ے) کا استعمال ہوتا ہے:

(1)　　زیر (ِ): اسے اضافتِ زیر یا کسرۂ اضافت بھی کہتے ہیں۔ اس کا استعمال مرکبِ اضافی کے جزوِ اول یعنی مضاف کے آخری حرف کے نیچے کیا جاتا ہے جس سے کا/ کی/ کے کے معنی پیدا ہوتے ہیں، مثلاً دردِ دل (دل کا درد)، خاکِ وطن (وطن کی خاک)، بندگانِ خدا (خدا کے بندے)، جزوِ ایمان (ایمان کا حصہ)، وغیرہ۔ اضافتِ زیر کا استعمال صرف اضافی مرکبات کے جزوِ اول پر مشتمل انھی الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے جو مصمتوں (Consonants)، نیم مصوتوں (Semi-vowels) یا یائے معروف پر ختم ہوتے ہیں مثلاً درسِ قرآن، نورِ سحر، چراغِ محفل (ان الفاظ میں جزوِ اول کا آخری حرف مصمتہ ہے)، خوبیِ قسمت، والیِ ریاست (جزوِ اول کا آخری حرف یائے معروف ہے)، جزوِ ایمان، خسروِ ہند، وحیِ الٰہی (جزوِ اول کا آخری حرف نیم مصوتہ ہے)۔ کچھ لوگ بندگیِ خدا، خوبیِ قسمت، والیِ ریاست، ماضیِ قریب وغیرہ میں جزوِ اول کے آخری حرف یائے معروف پر ہمزہ لگاتے ہیں، مثلاً بندگئ خدا، خوبئ قسمت، والئ ریاست، ماضئ قریب وغیرہ جو صحیح نہیں ہے۔ اس کا استعمال

ترک ہونا چاہیے۔

(2) ہمزہ (ء): مصوتی تسلسل (Vowel sequence) کی تحریری نمائندگی کرنے کے علاوہ ہمزہ ایک اضافی علامت بھی ہے۔ اضافتِ ہمزہ کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جب مرکبِ اضافی کا جزوِ اول ہائے مختفی [ہ] پر ختم ہوتا ہے۔ اضافت کے لیے اسی ہائے مختفی پر ہمزہ بنا دیا جاتا ہے، مثلاً خانۂ خدا، نشۂ دولت، نعرۂ آزادی، وعدۂ فردا، وغیرہ۔ اس کے علی الرغم ہائے ملفوظی (جو ایک مصمتہ ہے) پر ختم ہونے والا لفظ جب مرکبِ اضافی کا جزوِ اوّل بنتا ہے تو اضافت کے لیے ہائے ملفوظی کے نیچے زیر (کسرہ) بنا دیتے ہیں، مثلاً آہِ مظلوم، راہِ خدا، وجہِ امتیاز، وغیرہ۔ ان مثالوں میں وعدۂ فردا اور راہِ خدا دونوں مرکبِ اضافی ہیں اور دونوں کے جزوِ اول کا آخری حرف ہائے ہوز [ہ] ہے، لیکن اضافت کے لیے وعدہ کے ساتھ ہمزہ اور راہ کے ساتھ زیر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وعدہ کی ہائے ہوز ہائے مختفی ہے اور راہ کی ہائے ہوز ہائے ملفوظی۔

(3) بڑی [ے]: اردو میں اضافت کی ایک علامت بڑی [ے] بھی ہے۔ جب کسی مرکبِ اضافی کا جزوِ اول طویل مصوتے الف یا واو پر ختم ہوتا ہے تو اضافت کے لیے الف یا واو کے بعد بڑی ے کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، مثلاً صدائے دل، تماشائے دنیا، بوے گل، سوے چمن، وغیرہ۔ لیکن اردو میں یہ صورت اب کم ہی رائج ہے (اگرچہ از روے فارسی یہی طریقہ درست ہے)۔ اردو میں بڑی ے کے اوپر ہمزہ بنانے کا رواج اب عام ہو چکا ہے، مثلاً صدائے دل، تماشائے دنیا، بوئے گل، سوئے چمن، وغیرہ۔ اردو کے بعض عالم دونوں طریقوں کو صحیح مانتے ہیں، لیکن ثقہ لوگ فارسی ہی کے چلن پر اصرار کرتے ہیں۔

غالب کے اس شعر میں اضافت کی تینوں قسموں کا استعمال پایا جاتا ہے:

بوے گل، نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اس شعر کے مصرعۂ اولی کو یوں بھی لکھ سکتے ہیں:

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

جدول-2

1-مصوتی علامات

	علامات	نام	مثالیں
-1	ـَ	زبر	دَم، وَرق، اَدَبی
-2	ـِ	زیر	اِس، دِل، مِثال
-3	ـُ	پیش	اُس، دُم، سُن
-4	ـٓ	مد	آپ، آسان، مآخذ
-5	ـٰ	کھڑا زبر	یٰسین، رحمٰن، موسیٰ
-6	ـٖ	کھڑی زیر	ایمان، پیر، میل
-7	ـٗ	الٹا پیش	اوٗن، دوٗر، مضبوٗط
-8	ـٛ	الٹا جزم	اوٛر، سیٛر، عوٛرت
-9	ـٔ	ہمزہ	آئے، روئی، جاؤ

2- مصمتی علامات

	علامات	نام	مثالیں
-1	ـْ	جزم	درْد، صدْر، وصْف
-2	ـّ	تشدید	اوّل، قصّہ، صیّاد
-3	ـً	تنوین	فوراً، تقریباً، نسبۃً
-4	ھ	ہائے مخلوط	پھل، گھاس، دودھ

3- علاماتِ اضافت			
-1	ِ	اضافتِ زیر	دردِ دل، ماضیِ قریب
-2	ء	اضافتِ ہمزہ	نعرۂ آزادی، نشۂ دولت
-3	ے	یائے مجہول	بوئے گل، تماشائے دنیا
4- علامتِ غنّیت			
-1	ں	نونِ غنّہ	ماں، نہیں، ہنسی
5- علامتِ واوِ معدولہ			
-1	—	ڈیش	خود، خوش، خواب

خلاصہ

اردو رسم الخط کے بنیادی عناصر میں تین چیزیں شامل ہیں: 1) مفرد حروف، 2) حروف کی ترکیبی شکلیں، اور 3) اعراب و علامات۔ ان میں سے اعراب و علامات کو ثانوی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ اعلیٰ سطح کی علمی و ادبی کتب میں اعراب و علامات کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن مبتدیوں کے لیے لکھی جانے والی تدریسی کتابوں میں اعراب و علامات کی پابندی لازمی ہے۔

اردو کے مفرد حروف یا حروفِ تہجی کی کل تعداد 36 ہے، لیکن ان کی ترکیبی یا بدلی ہوئی شکلیں 18 ہیں جنھیں پانچ زمروں میں ان کی تعداد کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے جو یہ ہیں: 1) مصوتی علامات (9)، 2) مصمتی علامات (4)، 3) علاماتِ اضافت (3)، 4) علامتِ غنّیت (1) 5) علامتِ واوِ معدولہ (1) (ملاحظہ ہو جدول-1، اور جدول-2)

حواشی

1- ناگری لپی کو عام طور پر 'سائنٹفک' کہا جاتا ہے، لیکن گیان چند جین کو 'اس کے سائنٹفک ہونے میں شبہ ہے''۔ ملاحظہ ہو ان کا مضمون ''مشترک رسمِ خط''، مشمولہ 'لسانی مطالعے' از گیان چند جین (نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 1973ء)، ص 67-153۔

2- پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، جنھوں نے 'دریائے لطافت' (انشاء اللہ خاں انشا) کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ''سید انشا مرحوم نے نہایت موشگافی سے کام لے کر اردو حروفِ تہجی کی تعداد پچاسی تک پہنچا دی ہے۔'' دیکھیں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، 'کیفیہ' (دہلی: انجمن ترقی اردو [ہند]، 1975ء)، ص 38۔

3- پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، 'کیفیہ' ص 38۔

4- دیکھیں حیات اللہ انصاری، 'دس دن میں اردو'، تیسرا حصہ (لکھنؤ: بی-2/4، ریور بینک کالونی، س ن)، ص 24 - حیات اللہ انصاری نے نونِ غنہ [ں]، دوچشمی 'ہے' [ھ] اور ہمزہ [ء] کو بھی اردو حروف میں شامل کر لیا ہے جن کی تعداد 38 ہو گئی، لیکن حرفِ ژ ان کی 'حروفِ ابجد' کی فہرست سے خارج ہے۔

5- رشید حسن خاں کے نزدیک حروفِ تہجی کی کل تعداد 36 ہے۔ دیکھیں 'اردو کیسے لکھیں'، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، 1975)، ص 19 تا 23۔

6- مثلاً دیکھیں راقم السطور کی کتاب 'آیئے اردو سیکھیں' (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء)۔

7- مسعود حسین خاں: ''اردو صوتیات کا خاکہ''، مشمولہ 'مقدماتِ شعر و زبان' از مسعود حسین خاں (حیدر آباد: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، 1966ء)، ص 252۔

8- جو اہلِ علم مخلوط حروف، مثلاً پھ بھ جھ دھ کھ گھ، وغیرہ کو اردو کے حروفِ تہجی میں شامل کرتے ہیں وہ اہلِ ہندی کا اتباع کرتے ہیں، کیوں کہ ہندی رسم الخط یا ناگری لپی میں پھ (फ)،

بھ (भ)، تھ (थ)، دھ (ध)، کھ (ख)، گھ (घ)، وغیرہ مخلوط حروف کا درجہ نہیں رکھتے۔ بالفاظِ دیگر ان کی تشکیل دو تحریری عناصر سے مل کر نہیں ہوئی ہے۔ یہ سب سے چھوٹی تحریری اکائیاں ہیں، اسی لیے انھیں مفرد حروف یا 'ترسیمیہ' (Grapheme) کہتے ہیں۔ اہلِ ہندی کا انھیں حروفِ تہجی میں شامل کرنا بالکل بجا ہے۔

9- عربی میں پہلے کل 22 حروف تھے اور 'ترتیب ابجد' کے لحاظ سے یہ اس طرح تھے: ا ب ج د ہ و ز ح ط ی ك ل م ن س ع ف ص ق ر ش ت، یعنی ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت۔ بعد ازاں 6 نئے حروف: ث خ ذ ض ظ غ، یعنی ثخذ ضظغ کا اس میں اضافہ کیا گیا۔ ہمزہ [ء] کا اضافہ بھی بعد میں ہوا ہے۔ عربی لام الف (لا، لا) کی ایجاد بھی بعد کی چیز ہے۔

10- خطِ 'نستعلیق' کا ارتقا ایران میں ہوا۔ یہ دورسوم خط 'نسخ' اور 'تعلیق' کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ خواجہ میر علی تبریزی اس کے موجد ہیں۔ عربی رسمِ خط کا اندازِ تحریر اور طرزِ کتابت 'نسخ' کہلاتا ہے۔ یہ 'نبطی' رسمِ خط سے اخذ کیا گیا ہے۔ قدیم زمانے میں عرب میں ایک اور رسم خط رائج تھا جسے خطِ کوفی کہتے ہیں۔ خطِ نسخ کی طرح یہ بھی نبطی رسمِ خط سے ماخوذ ہے۔ خطِ کوفی کوفہ اور بصرہ میں، اور خطِ نسخ مکہ اور مدینہ میں ارتقا پذیر ہوا۔

ایران کے مشہور کاتب حسن بن حسین علی فارسی نے چوتھی صدی ہجری میں خطِ رقاع اور خطِ توقیع کے امتزاج سے ایک نیا خط وضع کیا جو 'تعلیق' کے نام سے مشہور ہوا۔ خطِ رقاع رقعات، اور خطِ توقیع توقیعات (فرامین) لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیں محمد اسحاق صدیقی، 'فنِ تحریر کی تاریخ' (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو [ہند]، 1962ء)۔ خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق کی بعض خصوصیات کے لیے دیکھیں رشید حسن خاں، 'اردو املا' (دہلی: نیشنل اکاڈمی، 1974ء)، ص 99-481۔

●●●

اردو رسم الخط اور املا

(تاریخی ارتقاء کی روشنی میں)

اردو رسم الخط، عربی رسم الخط کی ترقی یافتہ اور توسیع شدہ شکل ہے۔ عربی رسم الخط، نبطی رسم الخط سے ارتقا پذیر ہوا جس کا ماخذ آرامی رسم الخط ہے۔[1] عربی رسم الخط چند ترمیمات اور اضافوں کے بعد پہلے فارسی زبان کے لیے اختیار کیا گیا، پھر مزید تغیر وتبدل اور اضافوں کے بعد یہی رسم الخط اردو کے لیے اختیار کر لیا گیا۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران میں ایران اور ہندوستان میں اس رسم الخط میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کی تفصیلات بیحد دلچسپ ہیں۔

عربی رسم الخط عرب فاتحین کے ساتھ ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں ایران پہنچا۔[2] ایرانیوں نے جب اس رسم الخط کو اپنی زبان کے لیے اختیار کیا تو اس میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ابتداءً عربی حروفِ تہجی میں ذیل کے 28 حروف شامل تھے:

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص

ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ی [3]

ایران کے خواجہ ابوالعالی بک نے فارسی کی چار مصمتی آوازوں (Consonantal sounds) کو ظاہر کرنے والے چار نئے حروف کا اس میں اضافہ کیا جس سے اس کے حروفِ تہجی کی تعداد 32 ہوگئی۔ یہ نئے حروف ہیں:

پ چ ژ گ

ان حروف کو فارسی زبان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں

کہ فارسی کے یہ نئے حروف نقطوں اور مرکز کے اضافے سے وضع کیے گئے ہیں، اور ان کی بنیادی ہیئت یا صورت عربی کے مقررہ حروف کی اصل صورت سے مختلف نہیں تھی۔

عربی رسم الخط کا انداز تحریر اور طرز کتابت 'نسخ' کہلاتا ہے، اور جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے کہ عربی رسم الخط (خطِ نسخ)، نبطی رسم الخط سے اخذ کیا گیا ہے۔ قدیم الایام میں عرب میں ایک اور رسم الخط رائج تھا جسے 'کوفی' خط کہتے ہیں۔ خطِ نسخ کی طرح یہ خط بھی نبطی خط سے ماخوذ ہے۔ کوفی خط کوفہ اور بصرہ میں اور خطِ نسخ مکہ اور مدینہ میں ارتقاء پذیر ہوا۔ [4]

ایران کے ایک اور عالم خواجہ میر علی تبریزی نے بعہد امیر تیمور نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا جو 'نستعلیق' (نس (خ) + تعلیق = نستعلیق) کہلایا۔ [5] آج اردو کے لیے یہی رسم الخط مروج ہے۔ شمالی ہند کے قدیم اردو مخطوطات مثلاً 'بکٹ کہانی' (محمد افضل افضل)، 'عاشور نامہ' (روشن علی)، 'کربل کتھا' (فضلِ علی فضلی)، 'قصۂ مہر افروز و دلبر' (عیسوی خاں بہادر)، وغیرہ اسی رسم الخط میں تحریر شدہ دستیاب ہوئے ہیں۔ دکنی مخطوطات خطِ نستعلیق کے علاوہ خطِ ثلث میں بھی پائے گئے ہیں۔ [6] مسعود حسین خاں (1919-2010ء) کا خیال ہے کہ عربی رسم الخط "پہلی بار اردو کے لیے پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں، دکن میں خطِ ثلث کی شکل میں استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں نستعلیق کا رواج سولھویں صدی کے شروع میں ہوا۔ [7]

(2)

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی عربی-فارسی (Perso-Arabic) رسم الخط بھی یہاں پہنچا۔ مختلف اوقات میں یہاں آنے والے مسلمان اگرچہ تین مختلف زبانیں یعنی عربی، فارسی، اور ترکی بولتے تھے، لیکن ان کا رسم الخط ایک تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شمالی ہندوستان میں اردو اپنے آغاز و ارتقا کے مراحل سے گذر رہی تھی اور دہلی و نواحِ دہلی کی بولیوں، بالخصوص کھڑی بولی میں عربی و فارسی کے عناصر تیزی کے ساتھ نفوذ کر رہے تھے۔ اسی دور میں امیر خسرو (1253-1325ء) پیدا ہوئے جنھوں نے 'ریختہ' کی بنیاد ڈالی، اور عربی فارسی

رسم الخط اختیار کیا۔ شمالی ہندوستان میں 'دہلی سلطنت' کے قیام (1206ء) کے بعد ہی سے فارسی زبان اور عربی فارسی رسم الخط کی اہمیت و افادیت بڑھنے لگی تھی، چنانچہ درس و تدریس ہو کہ نظم و نسق، خط و کتابت ہو کہ تصنیف و تالیف یا شعر و سخن، ہر میدان میں فارسی کا چلن تھا اور اسی کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی مروج تھا۔ ہندوؤں میں بھی فارسی زبان اور اس کا رسم الخط بیحد مقبول تھا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق (1961-1869ء) کا یہ قول ملاحظہ ہو:

> ''ہندوؤں نے تو اس کے حاصل کرنے میں بڑا کمال دکھایا۔ ان میں فارسی کے ایسے فاضل ادیب اور شاعر گذرے ہیں کہ ان کی بعض تصانیف اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں اور مدتوں داخلِ نصاب رہیں۔ متواتر مطالعہ، مشق شعر و سخن، روزمرہ کی نوشت و خواند، صحبت اہلِ علم، نیز اس وقت کے ماحول اور رواج کی وجہ سے فارسی ان کے دل و دماغ میں رچ گئی تھی اور تقریباً ان کی اپنی زبان ہوگئی تھی۔''(8)

اسی ضمن میں راجا شیو پرشاد 'ستارۂ ہند' کے اس خطبے کا اقتباس بھی نقل کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے 1868ء میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں ''کچھ بیاں اپنی زباں کا'' کے عنوان سے پڑھا تھا:

> ''ہندو لوگ نہ صرف آپس کے درمیان فارسی میں خط و کتابت جاری رکھتے تھے اور اپنے گھر کا حساب بھی فارسی میں لکھتے تھے، بلکہ اگر لفظ صحیح ہوتا، میں کہہ سکتا کہ مفرّس بن گئے تھے۔''(9)

اس دور میں فارسی رسم الخط کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ ہندی (یہاں ہندی سے مراد بولیوں سے ہے، مثلاً اودھی وغیرہ) کی کتابیں بھی عام طور پر اسی رسم الخط میں تیار کی جاتی تھیں، چنانچہ اودھی کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی (1542-1477ء) کی 'پدماوت' (1540ء) کے جتنے بھی قدیم نسخے دریافت ہوئے ہیں وہ سب فارسی رسم الخط میں ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب (1975-1893ء) نے اپنی کتاب 'اردو زبان اور اس کا رسم الخط' (1948ء) میں ہندی کی ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی

ہوئی دستیاب ہوئی ہیں۔ (10) ان کتابوں کے مصنفین بہ استثنائے چند بھی ہندو تھے، لیکن انھوں نے اپنی تصانیف کے لیے فارسی رسم الخط اختیار کیا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں جو مقبولیت فارسی رسم الخط کو حاصل تھی اور جتنا زیادہ چلن اس دور کے شمالی ہندوستان میں اس رسم الخط کا تھا، کسی اور رسم الخط کا نہیں تھا۔ فارسی زبان کے ساتھ فارسی رسم ا لخط اس دور کے ہندوستان کی معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا ایک اہم جزو بن چکا تھا جس سے مسلمانوں یا ہندوؤں کا صرفِ نظر کرنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی اس رسم الخط کو اپنایا۔ یہ صورتِ حال فورٹ ولیم کالج کے قیام (1800ء) تک قائم رہی، لیکن نوآبادیاتی آقاؤں (Colonial masters) کی زیر سرپرستی کلکتہ (اب کولکتہ) میں جیسے ہی یہ کالج قائم ہوا، اردو، ہندی کی تفریق سر اٹھانے لگی، اور فارسی رسم الخط پر بھی زد پڑی۔ اِن آقاؤں نے اس کالج کے ایک منشی للولال جی سے دیوناگری رسم الخط میں 'پریم ساگر' (جو لسانی اعتبار سے اردو ہی کا ایک چربہ تھی) لکھوا کر ہندوؤں کے لیے ایک علیٰحدہ زبان کی بنیاد ڈالی۔ اس کی منصوبہ بندی فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے سربراہ جان گلکرسٹ (John Gilchrist) نے کی تھی۔ تاہم 1837ء تک فارسی ہی اپنے رسم الخط کے ساتھ ہندوستان کی سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج رہی۔ کھڑی بولی (جو اردو کی بنیاد ہے) کو دیوناگری خط میں لکھنے کی جدت فورٹ ولیم کالج ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اسی کے بعد سے 'جدید ہندی' (= کھڑی بولی ہندی) کو ایک علیٰحدہ زبان کی حیثیت سے قائم کرنے کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔

اردو آغاز ہی سے فارسی رسم الخط میں لکھی جانے لگی تھی جس کا ثبوت مسعود سعد سلمان (1046-1121ء) کا ہندوی دیوان ہے جس کی شہادت محمد عوفی (1171-1242ء) اور امیر خسرو دونوں ہی نے دی ہے۔ محمد عوفی اپنے تذکرے 'لباب الالباب' (1227/28ء) میں لکھتے ہیں کہ "اس کے [مسعود سعد سلمان کے] تین دیوان ہیں: ایک عربی میں، ایک فارسی میں اور ایک ہندوی میں۔" تذکرے کی اصل عبارت یہ ہے:

"اور اسہ دیوانست: یکی بتازی، یکے بپارسی و یکے بہندوی۔" (11)

امیر خسرو نے بھی مسعود سعد سلمان کے ہندوی دیوان کا ذکر اپنے دیوان 'غرۃ الکمال' (1293/94ء) کے دیباچے میں کیا ہے، لیکن صد افسوس کہ سلمان کا یہ ہندوی دیوان دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر وہ آج موجود ہوتا تو اردو رسم الخط ہی میں ہوتا۔ فارسی رسم الخط جب اردو کے لیے استعمال کیا جانے لگا تو اسے اردو رسم الخط کہا جانے لگا۔

اردو رسم الخط میں خسرو کے عہد سے لے کر اب تک کئی طرح کی تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے ہیں جن کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔

(3)

ابتدائی دور میں اردو لکھنے کے نہ تو اصول مقرر تھے اور نہ اس کے املا کا کوئی معیار قائم ہوا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ اردو اپنے ارتقائی دور میں تحریری زبان سے زیادہ بول چال کی زبان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی قدیم تصانیف میں املا کی بے قاعدگیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ کے لکھنے میں بھی بعض اوقات بڑی بے احتیاطی برتی گئی ہے اور ان الفاظ کے روایتی اور اصل املا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ قدیم اردو تصانیف مثلاً 'بکٹ کہانی' (محمد افضل افضل)، 'عاشور نامہ' (روشن علی)، 'کربل کتھا' (فضل علی فضلی)، 'قصۂ مہر افروز و دلبر' (عیسوی خاں بہادر)، 'قطب مشتری' (ملا وجہی)، اور 'ابراہیم نامہ' (عبدل دہلوی) سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''ثات'' (سات)، ثاتویں (ساتویں)، ''عام'' (آم)، ''بیاح'' (بیاہ)،
''یعقوت'' (یاقوت)، ''باذ'' (بعد)، ''کاگذ'' (کاغذ)، ''نذر'' (نظر)،
''کانون'' (قانون)، ''مزمون'' (مضمون)، ''اخل'' (عقل)، ''وخت'' (وقت)،
''منا'' (منع)، ''نفا'' (نفع)، ''مستید'' (مستعد)، ''ملما'' (ملمع) وغیرہ۔

املا کی بے قاعدگی سے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو کے قدیم مصنفین الفاظ کو جس طرح بولتے تھے اسی طرح لکھتے بھی تھے۔ صوتی املا کو عربی و فارسی کے اصل اور روایتی املا پر ترجیح دینے کی غالباً یہی ایک اہم وجہ ہو سکتی ہے، لیکن بعض اوقات کاتب کی کم سوادی اور جہل

کا بھی اس میں خاصا دخل ہوتا ہے، جیسا کہ 'عاشورنامہ' (1688ء) کے سلسلے میں دیکھا گیا ہے۔ بہ قولِ مسعود حسین خاں، ''عاشورنامہ کا کاتب کم سواد بلکہ کسی حد تک جاہل ہے۔ وہ نہ صرف ہندی الفاظ کے املا میں توڑ مروڑ پیدا کرتا ہے، بلکہ اکثر اوقات عربی فارسی کے معروف اور مستند الفاظ تک ٹھیک سے نہیں لکھتا۔'' (12) مولوی عبدالحق نے 'قطب مشتری' (1609/10ء) کے ''مقدمہ'' میں ایسے بہت سے الفاظ دیے ہیں جنھیں دکنی مصنفین نے ان کے اصل املا کے مطابق نہیں لکھا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں شاہ ظہور الدین حاتم (1791-1699ء) کے ہاتھوں جب اردو میں اصلاحِ زبان کی تحریک کا آغاز ہوا تو الفاظ کو ان کے عربی فارسی املا کے مطابق لکھنے کا رواج عام ہونے لگا، اور ''دوانہ''، ''بگانہ''، ''صحی'' اور ''تسی'' جیسے الفاظ کو ان کے صحیح املا کے مطابق علی الترتیب دیوانہ، بیگانہ، صحیح اور تسبیح لکھا جانے لگا۔

اردو زبان کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں رونما ہونے والی لسانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کے رسم الخط میں بھی ترمیمیں، اضافے اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اردو نے اپنے ارتقا کے دوران میں چودہ (14) خالص ہندی الاصل آوازیں اختیار کیں جو درجِ ذیل ہیں:

ٹ ڈ ڑ پھ بھ تھ دھ ٹھ ڈھ چھ جھ کھ گھ ڑھ

ان کے علاوہ لھ مھ نھ رھ بھی ہیں لیکن ان کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ اردو کی یہ ہندی الاصل آوازیں ہکار (نفسی) اور کوز (معکوسی) ہیں جن کے لیے عربی فارسی رسم الخط میں نہ تو کوئی حرف مقرر تھا اور نہ کوئی علامت، کیونکہ یہ آوازیں خالص ہندی نژاد ہیں اور عربی و فارسی زبانوں میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ فارسی رسم الخط جب اردو کے لیے اختیار کیا گیا تو سب سے بڑی دشواری یہی پیش آئی کہ ان آوازوں کو تحریر میں کیسے ظاہر کیا جائے۔ تین کوز یا معکوسی آوازوں (Retroflex sounds) کے لیے تین نئے حروف ٹ ڈ ڑ وضع کیے گئے۔ ان کے علاوہ بڑی 'ے' (یائے مجہول) کا اضافہ بھی کیا گیا جس سے اردو کے حروفِ تہجی کی کل تعداد 36 ہو گئی۔ اردو کے 36 حروفِ تہجی یہ ہیں:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ

س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے

کچھ لوگ اردو کے حروفِ تہجی میں ہمزہ (ء) کو بھی شامل کرتے ہیں اور اسے ایک حرف تصور کرتے ہیں، لیکن اردو میں ہمزہ حرف نہیں، محض ایک علامت ہے اور وہ بھی ''علامتِ بے صوت''۔ (13)

اردو کی چودہ (14) خالص ہندی الاصل آوازوں میں سے گیارہ آوازیں ہکار یعنی نفسی (Aspirates) ہیں۔ ان آوازوں کو تحریری شکل میں ظاہر کرنے کے لیے 'ہائے مخلوط'، یعنی دو چشمی 'ہے' (ھ) کا سہارا لیا جاتا ہے، مثلاً پھ بھ تھ دھ چھ جھ کھ گھ ٹھ ڈھ ڑھ، وغیرہ۔ ہائے مخلوط کی ترکیب سے وجود میں آنے والے یہ گیارہ حروف اردو حروفِ تہجی کا جز نہیں سمجھے جاتے اور نہ انھیں علیٰحدہ حروف کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ دو حروف کا مجموعہ ہیں، لیکن صوتیاتی نقطۂ نظر سے یہ اردو کی منفرد اور ممیز (Distinctive) آوازیں ہیں جنھیں لسانیاتی اصطلاح میں 'صوتیہ' (Phoneme) کہتے ہیں۔

اردو میں کئی کئی حروف ایک ہی آواز کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً ث س ص یہ تینوں حروف صرف ایک آواز /س/ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ذ ز ض ظ سے بھی صرف ایک آواز /ز/ مراد لی جاتی ہے، نیز ح ہ کے لیے بھی ایک ہی آواز /ہ/ مقرر ہے۔ اسی طرح ط کے لیے ت کی، اور ع کے لیے الف (ا) کی آواز موجود ہے۔ اس تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ اردو کے نظامِ تہجی میں آٹھ حروف محض 'زائد' یا بیکار (Redundant) ہیں۔ یہ آٹھ حروف ہیں: ع ط ث ص ذ ظ ض ح۔ یہ حروف زائد اس لیے ہیں کہ ان کی صوتی نمائندگی کے لیے اردو نظام تہجی میں دوسرے حروف موجود ہیں۔ ان زائد حروف کو اردو کے نظامِ تہجی سے خارج کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ عربی زبان سے ہمارا لسانی اور جذباتی رشتہ قائم ہے اس لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکے گا، اور نہ ہی اردو بولنے والوں کی اکثریت اس اقدام کے لیے تیار ہوگی۔ تقریباً نصف صدی قبل جب مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مضمون ''اردو صوتیات کا خاکہ'' میں ان حروف کو ''مردہ لاشیں'' قرار دیا تھا تو بعض گوشوں سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئی تھیں، لیکن وہ اپنے موقف پر تادمِ آخر قائم رہے۔ مسعود حسین خاں کے متذکرہ مضمون سے یہ

اقتباس ملاحظہ ہو:

"مصمتوں کے سلسلے میں اُن زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں، اور جو ہمارے حروفِ تہجی اور نظامِ درس کے لیے پیرِ تسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد ذ ض ظ ط ث ص ح، وغیرہ سے ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔"(14)

(4)

ہر زبان پہلے تکلمی یا بول چال کی صورت میں متشکل ہوتی ہے، پھر رفتہ رفتہ اسے تحریر کا جامہ پہنایا جاتا ہے، لیکن اس جامے میں کاٹ چھانٹ اور رد و بدل کا سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے، اور صدیوں کی تراش خراش اور ایجاد و اختراع کے بعد اس کی ایک معیاری شکل نکل کر سامنے آتی ہے۔ اردو جب یہاں کے خمیر سے پیدا ہوئی تو اسے عربی فارسی کا جامہ تنگ نظر آیا، چنانچہ اس جامے کو اپنے جسم پر فٹ کرنے کے لیے اس نے صدیاں گذار دیں، تب کہیں جا کر اس کے اصول مرتب ہوئے اور معیار قائم ہوا۔

ابتدا میں اردو کو تحریری شکل دینے کے نہ تو کوئی اصول مرتب ہوئے تھے اور نہ کوئی قاعدہ یا ضابطہ متعین ہوا تھا۔ جو جس طرح چاہتا تھا اسے ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو لکھنے میں مختلف النوع بے قاعدگیاں عام ہو گئیں، جن میں سے محض چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

(1) ک اور گ:

اردو کے نظامِ تہجی میں ک اور گ دو جداگانہ حروف ہیں اور ان سے دو الگ الگ با معنی آوازیں ظاہر کی جاتی ہیں، مثلاً کالی (black): گالی (abuse) یا روک (stop): روگ (disease)۔ لیکن ماضی میں ان کے لکھنے میں بڑی بے قاعدگی برتی جاتی رہی ہے۔ اردو کی

قدیم تصانیف میں بالعموم ک اور گ کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ابتدائی دور میں اور اس کے بعد بھی /گ/ کی آواز کو ک اور گ دونوں حروف سے ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ بعض اوقات ک اور گ دونوں آوازوں کے لیے صرف ک (ایک مرکز کے ساتھ) استعمال کیا گیا ہے۔ ک کی جگہ گ لکھنے کی مثالیں بھی پائی گئی ہیں۔ تحریری اعتبار سے ک اور گ میں فرق صرف مرکز کی کمی اور بیشی کا ہے۔ قدیم اردو کے بعض ایسے مخطوطات دستیاب ہوئے ہیں جن میں ک اور گ پر مقررہ تعداد میں مرکز بنانے کا التزام نہیں پایا جاتا۔ یہ بے قاعدگی غالب (1797-1869ء) تک کے یہاں پائی جاتی ہے۔ خطوطِ غالب کے عکس سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے اپنی تحریروں میں کہیں کہیں گ پر ایک مرکز اور ک پر دو مرکز بنائے ہیں۔ پرتھوی چند نے 'مرقعِ غالب' (1966ء) کے نام سے غالب کے ان خطوط کے عکس شائع کر دیے ہیں جو انھوں نے والیانِ رام پور کے نام لکھے تھے۔[15] چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- نوشتہ 8 دسمبر 1859ء:

''میں بدستور بہوکا اور ننگا رہا، تم سے نگہون تو کس سے کہون۔''

نہ کہوں

- نوشتہ 11 نومبر 1861ء:

''اس مرض مین اوس سے گریز نہین، تپ نے آ کہیرا۔''

گھیرا

یہاں ''نگہون'' (نہ کہوں) میں ک پر دو مرکز بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس ''کہیرا'' (گھیرا) میں گ پر صرف ایک مرکز بنایا گیا ہے، لیکن اس طرح کی بے قاعدگی غالب کے یہاں زیادہ عام نہیں ہے۔

اردو مخطوطوں اور تحریروں کے تاریخ وار مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ک اور گ میں صحیح معنی میں امتیاز کہیں انیسویں صدی کے آخر میں جا کر قائم ہو سکا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ک پر ایک مرکز اور گ پر دو مرکز بنائے جانے کا پورا اہتمام پایا جاتا ہے۔

(2) یائے معروف اور یائے مجہول:

اسی طرح یائے معروف (ی) اور یائے مجہول (ے) کے لکھنے میں بھی بڑی بے قاعدگی برتی گئی ہے۔ اردو میں یہ دو مستقل حروف ہیں اور ان کی جداگانہ حیثیت ہے۔ ان میں جو فرق ہے وہ قواعدی نوعیت کا بھی ہے، یعنی بہ لحاظِ صنف (Gender) اور بہ لحاظ تعداد (Number) ان میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں 'ی' اور 'ے' کے تبادل سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن عربی میں ایسا نہیں ہے، مثلاً علی کو علے بھی لکھ سکتے ہیں، معنی میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوگا اور نہ تلفظ بدلے گا، لیکن اردو میں 'لڑکی' اور 'لڑکے' دو مختلف المعنی الفاظ ہیں، اور تلفظ کے لحاظ سے بھی ان میں فرق ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے، یائے مجہول کا وجود جدید فارسی میں ناپید ہو چکا ہے، لیکن رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ یائے مجہول پہلے فارسی لہجے میں موجود تھی۔ (16)

عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی 'ی' اور 'ے' کے امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنے کا رجحان عام رہا ہے اور اس سلسلے میں کافی حد تک بے قاعدگی برتی جاتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات الفاظ کی تذکیر و تانیث کے تعین میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے الفاظ کے بارے میں یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کسی مصنف نے انھیں مذکر استعمال کیا ہے یا مؤنث۔ اردو کے جن محققین نے قدیم مخطوطات کی تدوین کا کام انجام دیا ہے انھوں نے ایسے مقامات پر بالعموم قیاس آرائی اور سیاق و سباق سے کام لیا ہے، کیونکہ قدیم اردو مخطوطات میں یائے معروف اور یائے مجہول یعنی ی اور ے کی تفریق قطعی نہیں پائی جاتی۔ کہیں ی اور ے دونوں کی جگہ صرف ی سے کام نکالا گیا ہے تو کہیں ان کی جگہ صرف ے ملتی ہے۔ اس قسم کی بے قاعدگی ہر قدیم مخطوطے اور ہر پرانی تحریر میں ضرور پائی جاتی ہے۔ غالب کی تحریروں میں بھی یہ بے قاعدگی اتنی ہی عام ہے جتنی کہ کسی اور قدیم تحریر میں۔

ذیل میں یائے معروف اور یائے مجہول کے استعمال میں بے قاعدگی سے متعلق چند قدیم مخطوطات کے مرتبین کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں:

- مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' میں ''یائے معروف و مجہول میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔'' (جمیل جالبی)(17)
- 'ابراہیم نامہ' میں ''یائے معروف اور یائے مجہول کے اختلاط کی مثالیں تو ہر ہر صفحے پر مل جائیں گی۔'' (مسعود حسین خاں)(18)
- 'عاشور نامہ' کا کاتب ''یائے معروف اور مجہول میں امتیاز نہیں کرتا۔ مثالیں ہر صفحے پر کثرت سے پائی جاتی ہیں۔'' (مسعود حسین خاں)(19)
- مثنوی 'معجزۂ انار' میں ''ی اور ے میں بھی کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے۔ دونوں کو عموماً 'ی' کی کشش سے لکھا ہے جو نیم عربی رسم الخط کہا جا سکتا ہے۔'' (نائب حسین نقوی)(20)
- 'کربل کتھا' میں ''یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز نہیں، تقریباً ہر جگہ ایک کی بجائے دوسری ملتی ہے۔'' (مالک رام ومختار الدین احمد)۔(21)
- 'دیوانِ فائز' میں ''معروف اور مجہول 'ے' میں امتیاز نہیں کیا گیا ہے، مثلاً ''کی'' (کے)، ''ہی'' (ہے)، ''مجی'' (مجھے)۔'' (مسعود حسن رضوی ادیب)۔(22)
- 'قصۂ مہر افروز و دلبر' میں ''کاتب یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز نہیں کرتا۔ عام طور پر یائے معروف کو یائے مجہول لکھا ہے۔ صرف بعض مقامات اس سے مستثنیٰ ہیں۔'' (مسعود حسین خاں)۔(23)

ذیل میں 'کربل کتھا' (فضل علی فضلی) اور 'قصۂ مہر افروز و دلبر' (عیسوی خاں بہادر) کے مخطوطات سے دو عبارتیں یہاں من وعن نقل کی جاتی ہیں جن سے یائے معروف اور یائے مجہول کی بے قاعدگیوں کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

- ''روایت ہی (ہے) کہ اوس ملعون نی (نے) اہلبیت کی (کے) سفر کا اسباب تیار کر...''

('کربل کتھا'، پانچویں فصل)

- ''کوئے ایسا نتہا کہ کے بات سے محتاج ہوی... عیداور شادی نہ معلوم
کوئی　　کسی　　ہوئے

ہوتے تھے، کیونکہ عیداور شادی رات دن رہتے تھے۔''
ہوتی تھی　　رہتی تھی

('قصہ مہرافروز و دلبر' کا پہلا صفحہ)

غالب کی تحریروں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک اردو میں یائے معروف اور یائے مجہول کے درمیان امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ 'مرقعِ غالب'[24] میں شامل خطوطِ غالب کے عکس سے اس قسم کی بے قاعدگی کی بہت واضح تصویر سامنے آجاتی ہے، ملاحظہ ہو مثالیں:

- نوشتہ یکم تمبر 1866ء:

''برسات ایسے ہوئے ہی کہ...''
ایسی ہوئی ہے

- نوشتہ 26 جنوری 1867ء

''اخبار انگریزے دیکھا کرتا ہی اسنے مجھسی بتایا کہ...''
انگریزی　　ہے　　مجھ سے

- نوشتہ 19 اگست 1867ء:

حسین علیخان کے منگنے ہوگئے اور اپنی کنبی مین
کی منگنی ہوگئی اپنے کنبے

ہوئے یعنے نواب احمد
ہوئی یعنی

بخشخان مرحوم کے حقیقی بھائے کے پوتے سے۔''
بھائی کی پوتی

غالب کے یہاں اس بے قاعدگی کے متعلق مولانا امتیاز علی خاں عرشی مقدمۂ 'مکاتیب غالب' میں لکھتے ہیں:

''معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی جگہ معروف 'ی' کا استعمال ان کے یہاں اتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں دقت اور تذکیر و تانیث کے متعین کرنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔''(25)

یائے معروف اور یائے مجہول میں امتیاز غالب کے عہد کے بعد تک قائم نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا ثبوت ایک دستی تحریر 'بیٹی کا خط ماں کے نام' ہے جس کا عکس جارج گریرسن (George A. Grierson) نے اپنے 'لسانیاتی جائزۂ ہند' (1916ء) میں ''لکھنؤ کی بیگماتی اردو'' کے نمونے کے طور پر شامل کیا ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس من و عن یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''وہ تو کہیے بڑی خیریت گذری آدمی ڈیوڑھے پر موجود تھا اس نے روکا تھا،
ڈیوڑھی
نہیں تو سب کا سامنا ہو جاتا... ذرا ذراسی بات پر تو میں میں ہونے لگتے
لگتی
ہے... میاں کو مرے پورے چار مہینہ بھی نہیں ہوے تبے کہ یہ آسمان پھٹ پڑا۔
غریب کے رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔''
کی

(3) ہائے مخلوط اور ہائے ہوز:

ہائے مخلوط جسے دوچشمی 'ہے' (ھ) بھی کہتے ہیں اور ہائے ہوز یعنی سادہ 'ہے' (ہ) یا ہائے غیر مخلوط کے استعمال میں بھی بے قاعدگیاں کچھ کم نہیں رہی ہیں۔ قدیم اردو مخطوطات اور تحریروں میں دوچشمی ھ (ہائے مخلوط) کی جگہ ہائے ہوز (ہ) کا استعمال بہت عام رہا ہے۔ اردو کے نظامِ تہجی میں ہ (ہائے ہوز) کو ایک باقاعدہ اور مستقل حرف (Alphabet) کی حیثیت حاصل ہے، جب کہ دوچشمی ھ اردو کا کوئی حرف نہیں۔ اردو میں اس کی حیثیت محض ایک

علامت کی ہے جس سے آوازوں کی ہکاریت (Aspiration) کو ظاہر کرنے کا کام لیا جاتا ہے، مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، وغیرہ۔ ہکاریت نہ تو عربی میں پائی جاتی ہے اور نہ فارسی میں۔ یہ خالص ہندوستانی زبانوں کی صوتیاتی خصوصیت ہے۔ جس طرح عربی اور فارسی میں 'ی' اور 'ے' میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا اسی طرح ان زبانوں میں 'ہ' اور 'ھ' میں بھی صوتی یا معنیاتی اعتبار سے کوئی فرق موجود نہیں ہے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں کا یکساں طور پر استعمال ہوتا رہا ہے، کیونکہ ہ اور ھ کے تبادل سے ان زبانوں میں معنیاتی امتیاز پیدا نہیں ہوتا، جب کہ اردو میں ہ کو ھ سے یا ھ کو ہ سے بدلنے پر معنی میں بھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً کہا: کھا، پہاڑ: پھاڑ، گہر: گھر، دہان: دھان، پہر: پھر، وغیرہ۔

چونکہ عربی اور فارسی میں ہکار آوازوں (Aspirates) کا یکسر وجود ہی نہیں تھا، اس لیے تحریر میں ان کی نمائندگی کے لیے نہ تو کوئی حرف مقرر تھا اور نہ کوئی علامت موجود تھی۔ اسی لیے ابتدائی دور میں اردو کی ہکار آوازوں کی تحریر میں نمائندگی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جس طرح عربی فارسی میں ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں شکلوں کا یکساں طور پر استعمال ہوتا آیا تھا، اسی طرح اردو میں بھی ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں کا بلا امتیاز استعمال ہوتا رہا۔

فارسی شاعر حافظ کی ایک مشہور غزل کے ذیل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ فارسی میں ہ (ہائے ہوز) اور ھ (دوچشمی ھ) ایک ہی آواز کی دو تحریری شکلیں ہیں، ان میں تلفظ یا معنی کا کوئی فرق نہیں ہے:

الا یا ایھا الساقی ادر کا ساونا ولھا
کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکل ھا
بہ می سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بی خبر نبود ز راہ و رسم منزل ھا

ان اشعار میں نہ صرف یہ کہ ہ اور ھ میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے، بلکہ ن اور نونِ غنہ (ں) اور ی اور ے (بڑی ے) میں بھی کوئی امتیاز نہیں برتا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا

ہے کہ بڑی ے (یائے مجہول) جدید فارسی سے غائب ہو چکی ہے۔ موجودہ اردو املا کی تقلید کرتے ہوئے ان اشعار کو یوں لکھا جا سکتا ہے:

الا یا ایہا الساقی ادر کا ساونا ولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا
بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسمِ منزل ہا

اردو میں ایک طویل عرصے تک /ہ/ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں کا بلا امتیاز یکساں طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ اردو میں یہ بے قاعدگی غالباً عربی فارسی طرزِ کتابت کے اثر سے رائج ہو گئی تھی۔ شمال و دکن کی اردو کے تمام تر قدیم مخطوطات میں اس نوع کی بے قاعدگی حد درجہ عام ہے۔ اس بے قاعدگی یا بے امتیازی کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ چونکہ دکنی مخطوطات زیادہ تر خطِ نسخ (اور بعض خطِ ثلث) میں ہیں، اس لیے ان میں ھ کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ دکنی مخطوطات میں ہ اور ھ دونوں کی جگہ زیادہ تر ھ کا ہی استعمال ہوا ہے۔ مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' (فخر دین نظامی)، 'ابراہیم نامہ' (عبدل دہلوی) اور دیگر مخطوطات میں اس نوع کی مثالیں تقریباً ہر صفحے پر موجود ہیں، مثلاً مثنوی 'کدم راؤ' میں ''ھم'' (ہم)، ''ھمن (ہمن)''، ''ھوا'' (ہوا)، ''بھت'' (بہت)، ''کھیا'' (کہیا)، ''کھے'' (کہے) جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ اسی طرح 'ابراہیم نامہ' میں ''الھی'' (الہی)، ''کھوں'' (کہوں)، ''بھاکر'' (بہا کر) جیسی مثالیں ملتی ہیں۔

دکن کے برخلاف شمالی ہند میں ہ اور ھ کی جگہ ہ کا استعمال زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہاں خطِ نسخ (اور خطِ ثلث) کے بجائے خطِ نستعلیق کا چلن زیادہ تھا، چنانچہ 'کربل کتھا' (فضل علی فضلی)، 'قصۂ مہر افروز و دلبر' (عیسوی خاں بہادر) اور بعض دیگر مخطوطات میں یہی طرزِ کتابت اختیار کی گئی ہے۔ ان مخطوطوں میں دو چشمی ھ کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ 'کربل کتھا' کے مخطوطے کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں: ''کہر'' (گھر)،

''دہوم'' (دھوم)، ''تہیں'' (تھیں)، ''تہی'' (تھی)، ''پہوپہیاں'' (پھوپھیاں)، ''پہر'' (پھر)، وغیرہ۔ اسی طرح 'قصۂ مہر افروز و دلبر'' کے مخطوطے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: ''تہا'' (تھا)، ''تہے'' (تھے)، ''چہوتا'' (چھوٹا)، وغیرہ۔

غالب نے بھی اگر چہ اپنی تحریروں میں ہ اور ھ کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، لیکن ان کی تحریروں میں ہ اور ھ دونوں کی جگہ ہ کا استعمال حد درجہ عام ہے۔ ہ کی جگہ ھ کا استعمال ان کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ صرف چند مقامات پر لفظ کی ابتدائی حالت میں انھوں نے ہ کی جگہ ھ کا استعمال کیا ہے، مثلاً ''ھی'' (ہے)، وغیرہ۔ غالب کے خطوط سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- نوشتہ 17 نومبر 1858ء:

''آ گی تنگدست تہا اب تہید ست ہو گیا ہون۔''
تھا

- نوشتہ 8 نومبر 1864ء:

''گہر میں روتی نہیں پکی ہم سب نے فاقہ کیا۔''
گھر

- نوشتہ 15 فروری 1866ء:

''مین نے حضور کا خط اوسے دکہادیا۔''
دکھا

- نوشتہ 17 اکتوبر 1866ء:

''میری طبیعت کو زبانِ فارسی سی ایک لگاؤ تہا چاہتا تہا کہ فرہنگونسی بڑہ کر کوئی ماخذ محکو ملی۔''
تھا تھا بڑھ

ہائے ہوز (ہ) اور ہائے مخلوط (ھ) میں امتیاز انیسویں صدی کے آخر تک ضروری خیال نہیں کیا گیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ ''بیسویں صدی کے شروع سے اس طرف توجہ مبذول ہونا شروع ہوئی۔''(26)

(4) نون اور نونِ غنہ:

اردو صوتیات میں /ن/ کی آواز ایک انفی مصمتہ (Nasal consonant) ہے۔ اسے 'صوتیہ' (Phoneme) کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ یہ اردو کی ایک ممیز صوتی اکائی (Distinctive sound unit) ہے۔ اس کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے، مثلاً کام (work): نام (name)۔ یہاں معنی میں تبدیلی /ک/ کو /ن/ سے بدلنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی ن کو اردو کے نظامِ تہجی میں ایک مستقل حرف کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اردو کے 36 حروف میں سے ایک حرف ہے۔ جب اس کے شکم میں موجود نقطہ ختم کردیا جاتا ہے تو اس کی حیثیت نونِ غنہ (ں) کی ہوجاتی ہے۔ پھر یہ حرف نہیں رہ جاتا، بلکہ اسے غناتی علامت کہتے ہیں۔ اس کا استعمال مصوتوں (Vowels) کی غنائیت یا انفیت (Nasalization) کے لیے کیا جاتا ہے۔ اردو کے سارے مصوتے انفیائے، یعنی غنائی (Nasalized) بنائے جاسکتے ہیں۔ اردو میں نونِ غنہ (ں) کی حیثیت صوتیے (Phoneme) کی ہے، لیکن یہ /ن/ کی طرح قطعاتی صوتیہ (Segmental phoneme) نہیں ہے۔ انفیت بھی جب ترکیبی حالت میں لفظ کی ابتدائی یا درمیانی حالت میں واقع ہوتی ہے تو تحریر میں اس اس کا اظہار ایک مصوتے اور نقطے کی مدد سے کیا جاتا ہے، مثلاً آنکھ، ہنسی، کھانسی، وغیرہ۔ لیکن غنائیت جب ترکیبی حالت میں آخرِ لفظ واقع ہوتی ہے یا مفرد واقع ہوتی ہے تو اس کے شکم میں نقطہ نہیں رکھا جاتا ہے، مثلاً 'کہیں' (نونِ غنہ آخرِ لفظ ترکیبی حالت میں) اور 'کہاں' (نونِ غنہ آخرِ لفظ بہ طورِ مفرد)۔ ابتدائی حالت میں نونِ غنہ طویل مصوتوں (Vowels) یعنی /آ/ /ا/ /اؤ/ اور /ایں/ کے ساتھ واقع ہوتا ہے، مثلاً آنکھ، اونٹ، اینٹ، وغیرہ۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اردو میں 10 مصوتے (بہ شمول دوہرے مصوتے) پائے جاتے ہیں اور یہ سارے مصوتے انفیائے جاسکتے ہیں، یعنی انھیں نونِ غنہ کے ساتھ بھی (ادا کیا جاسکتا ہے۔ غنائیت یا انفیت درحقیقت مصوتوں کی ادائیگی کے ساتھ ہی پیدا کی جاسکتی

ہے۔ مصوتوں کی ادائیگی کے وقت مُنہ سے خارج ہونے والی ہوا اگر ناک کے راستے (انفی جوف=Nasal cavity) سے بھی خارج ہوتی ہے تب غنائیت پیدا ہوتی ہے۔ اس صورت میں غشا (Velum) جھک جاتا ہے اور ناک کا راستہ (انفی جوف) ہوا کے گذرنے کے لیے کھل جاتا ہے۔

اِن تفصیلات سے میرا مقصود یہ ہے کہ نون اور نونِ غنہ میں فرق کو واضح کیا جا سکے، لسانی وصوتی اعتبار سے بھی اور تحریری لحاظ سے بھی۔ ہمارے اکابرین نے نون اور نونِ غنہ میں فرق نہیں کیا اور دونوں کو ایک ہی طرح سے لکھنے کی عادت ڈال لی، اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اردو کی قدیم تحریروں اور مخطوطوں میں ابتدا ہی سے مفرد نونِ غنہ اور آخرِ لفظ واقع ہونے والے ترکیبی نونِ غنہ میں نقطے کا استعمال پایا جاتا ہے۔ مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اور 'ابراہیم نامہ' سے لے کر 'کربل کتھا' اور 'قصۂ مہر افروز و دلبر' تک کے تمام مخطوطات میں، نیز غالب اور ان کے معاصرین کی تحریروں میں نونِ غنہ میں نقطے کا استعمال پورے طور پر پایا جاتا ہے، مثلاً غالب نے اپنی اردو تحریروں میں جہاں کہیں بھی 'مَیں'، 'ہوں'، 'یہاں'، 'وہاں'، 'نہیں' وغیرہ الفاظ لکھے ہیں، نونِ غنہ میں پابندی کے ساتھ نقطے بنانے کا التزام کیا ہے۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں (نوابینِ رام پور) کے نام اپنے اکثر خطوط کے آخر میں غالب نے ذیل کا شعر درج کیا ہے (27):

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہون دن پچاس ہزار

اس شعر کے مصرعۂ ثانی کے لفظ ہوں میں نونِ غنہ پایا جاتا ہے، لیکن غالب نے اسے نقطے کے ساتھ ہر جگہ ''ہون'' لکھا ہے۔

اسی طرح اپنے بعض خطوط میں غالب نے یہ مصرع درج کیا ہے، ع

نہ کہون آپ سے تو کس سے کہون

یہاں بھی کہوں کے نونِ غنہ میں نقطہ موجود ہے، یعنی ہر جگہ کہوں کے بجائے ''کہون'' لکھا گیا ہے۔ غالب کے ایک خط کا اقتباس یہاں من وعن نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے 27 جولائی

1866ء کو لکھا تھا:

- ''مین ہزار بارہ سو روپئے کا قرض رکھتا ہون چاہتا ہون کہ میری
  میں		ہوں		ہوں

زندگیمین ادا ہو جائے۔''
زندگی میں

اس اقتباس میں ''مین'' (مَیں)، ''ہون'' (ہوں)، جیسے الفاظ میں باقاعدگی کے ساتھ نونِ غنہ میں نقطے لگائے گئے ہیں۔ نونِ غنہ میں نقطے بنانے کا رواج بیسویں صدی کے وسط تک پایا جاتا تھا، چنانچہ رشید حسن خاں 'مضامینِ شبلی' کی چھٹی جلد (1951ء) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس میں کاتب صاحب نے اکثر مقامات پر لفظوں کے آخر میں آنے والے نونِ غنہ میں اہتمام کے ساتھ نقطے لگائے ہیں۔''(28)

خلاصہ

اردو رسمِ خط اور املا میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ املا کے اصول ہمیشہ بدلتے رہے ہیں، اور بعض حروف کی صورتوں میں بھی برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اردو اپنے معرضِ وجود میں آنے کے بعد صدیوں تک محض بول چال کی زبان کی حیثیت سے استعمال ہوتی رہی۔ دکن سے قطع نظر شمالی ہندوستان میں اسے ضبطِ تحریر میں بہت بعد میں لایا گیا۔ اس وقت املا کے معیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ افضل، فضلی، فائز اور دیگر مصنفین کی تحریروں میں املا کی جو بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بول چال کی زبان کو ان بزرگوں نے اچانک تحریر کا جامہ پہنادیا، لیکن تاوقتیکہ کوئی زبان متواتر نہ لکھی جائے تو اس کے معیار کا قائم ہونا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اردو کمپوزنگ کے اصول کافی حد تک متعین ہو چکے ہیں اور املا کا معیار بڑی حد تک قائم ہو چکا ہے، تاہم املا کی بے قاعدگیاں اب بھی بہت عام ہیں اور آج بھی املا کے بیشتر اصولوں کے بارے میں علماء میں اختلافِ رائے موجود ہے۔

حواشی

-1 آرامی رسم الخط (Aramaic script) آرامی قوم کی ایجاد ہے جو قدیم زمانے میں ملکِ شام میں آباد تھی۔ آرامی رسم الخط تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے، کیونکہ اس کے قدیم ترین کتبے 800 ق م کے پائے گئے ہیں۔ نبطی، عبرانی، سریانی، سغدی، پہلوی وغیرہ آرامی رسم الخط ہی کی شاخیں ہیں۔

-2 عربوں اور ایرانیوں کے درمیان ساتویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں چار مشہور جنگیں ہوئیں: 1) جنگِ ذات السلاسل (633ء)، 2) جنگِ قادسیہ (635ء)، 3) جنگِ جلولاء (637ء)، اور 4) جنگِ نہاوند (641ء)۔ اس وقت ایران میں ساسانی حکومت قائم تھی اور پہلوی زبان کا چلن تھا۔ ان جنگوں میں ایرانی فوجوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں ساسانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ایران پر عربوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

-3 عربی میں پہلے کل 22 حروف تھے اور ترتیب ابجد کے لحاظ سے یہ اس طرح تھے:
ابجد هوز حطی کلمن سعفص قرشت — بعدازاں، 6 نئے حروف یعنی ثخذ ضظغ کا اس میں اضافہ کیا گیا، جس سے عربی حروف کی تعداد 28 ہو گئی۔ اسی لیے ان حروف کو ترتیب ابجد کے آخر میں رکھا گیا ہے۔ ہمزہ (ء) کا اضافہ بعد میں ہوا ہے۔ عربی لام الف (لا، لا) کی ایجاد بھی بعد کی چیز ہے۔

-4 بحوالہ محمد اسحٰق صدیقی، 'فنِ تحریر کی تاریخ'، طبعِ اول (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، [ہند]، 1962ء)، ص 209۔

-5 خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق کی بعض خصوصیات کے لیے دیکھیے رشید حسن خاں، 'اردو املا'، طبعِ اول (دہلی: نیشنل اکاڈمی، 1974ء)، ص 99-481۔

-6 دیکھیے دکنی مخطوطات، مثلاً: مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' (نظامی بیدری)، 'قطب مشتری'

(ملا وجہی)، 'ابراہیم نامہ' (عبدل دہلوی)، 'کتابِ نورس' (ابراہیم عادل شاہ ثانی)، 'شمائل الاتقیا' (میراں یعقوب)، وغیرہ۔

7- مسعود حسین خاں، 'اردو کا المیہ'، مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1973ء)، ص 74۔

8- مولوی عبدالحق، 'خطباتِ عبدالحق'، طبع اول (دہلی: انجمن ترقی اردو [ہند] 1944ء)، ص 40۔

9- راجا شیو پرشاد 'ستارۂ ہند'، ''کچھ بیان اپنی زباں کا''، مشمولہ 'اردوئے معلیٰ' (قدیم اردو نمبر)، مرتبہ خواجہ احمد فاروقی (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، س ن)، ص 46۔

10- مسعود حسن رضوی ادیب، 'اردو زبان اور اس کا رسم خط'، بارِ دوم (لکھنؤ: کتاب نگر، 1961ء)، ص 55۔ [طبعِ اول 1948ء]

11- سدید الدین محمد عوفی، 'لباب الالباب' (تہران: کتاب خانۂ ابنِ سینا، 1965ء)، ص 423۔

12- ''مقدمہ''، 'عاشور نامہ'، مرتبہ مسعود حسین خاں اور سفارش حسین رضوی، ص 13-12۔

13- دیکھیے گوپی چند نارنگ، ''ہمزہ کیوں؟''، مشمولہ 'اردو میں لسانیاتی تحقیق'، مرتبہ عبدالستار دلوی (بمبئی: کوکل اینڈ کمپنی، 1971ء)، ص 16 تا 29۔

14- مسعود حسین خاں، ''اردو صوتیات کا خاکہ''، مشمولہ 'شعر و زبان' از مسعود حسین خاں (حیدر آباد: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، 1966ء)، ص 252۔

15- دیکھیے 'مرقعِ غالب'، مرتبہ پرتھوی چند، حصہ دوم (عکسِ خطوط نوشتۂ مرزا غالب بنام والیانِ رام پور نواب یوسف علی خاں و نواب کلب علی خاں)، [مطبوعہ دہلی، 1966ء]

16- رشید حسن خاں، 'اردو املا' (دہلی: نیشنل اکاڈمی، 1974ء)، ص 561۔

17- ''مقدمہ''، مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' (فخر الدین نظامی)، مرتبہ جمیل جالبی (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1973ء)، ص 27۔

18- ''مقدمہ''، 'ابراہیم نامہ' (عبدل دہلوی)، مرتبہ مسعود حسین خاں (علی گڑھ: شعبۂ

لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1969ء)، ص 63۔

19- ''مقدمہ''، 'عاشورنامہ' (روشن علی)، مرتبہ مسعود حسین خاں اور سید سفارش حسین رضوی (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1972ء)، ص 13۔

20- ''دیباچہ''، اردو کی دو قدیم مثنویاں، (اسمٰعیل امروہوی)، مرتبہ نائب حسین نقوی (لکھنؤ: دانش محل، 1970ء)، ص 21-['اردو کی دو قدیم مثنویاں' میں مثنوی ''معجزہ انار'' شامل ہے]۔

21- ''مقدمہ''، 'کربل کتھا' (فضل علی فضلی)، مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد (پٹنہ: ادارۂ تحقیقاتِ اردو، 1965ء)، ص 33۔

22- 'دیوانِ فائز' (فائز دہلوی)، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، طبعِ دوم (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو [ہند]، 1965ء)، ص 147۔ [طبعِ اول 1946ء]۔

23- ''پیش نامہ''، 'قصۂ مہر افروز و دلبر' (عیسوی خاں بہادر)، مرتبہ مسعود حسین خاں (حیدرآباد، 1966ء)۔

24- پرتھوی چند (مرتب)، محولۂ بالا کتاب۔

25- ''مقدمہ''، 'مکاتیب غالب'، مرتبہ امتیاز علی عرشی، ص 220، بہ حوالہ رشید حسن خاں، محولۂ بالا کتاب، ص 637 (حاشیہ)۔

26- رشید حسن خاں، محولۂ بالا کتاب، ص 325۔

27- پرتھوی چند (مرتب)، 'مرقعِ غالب' (دہلی، 1966ء)۔

28- رشید حسن خاں، محولۂ بالا کتاب، ص 189۔

●●●

فنِ تحریر کی تاریخ

ایک مطالعہ

انسان کو 'حیوانِ ناطق' کہا گیا ہے، یعنی ایسا انسان جسے 'بولنا' آتا ہے۔ گویائی کی یہی صفت انسان کو دوسرے حیوانات سے ممیز کرتی ہے۔ 'نطق' یا گویائی کی صلاحیت صرف انسان کو ودیعت کی گئی ہے، حیوانات کو نہیں۔ نوام چومسکی (Noam Chomsky) کے قول کے مطابق ایک بیوقوف انسان بھی بولنا سیکھ جاتا ہے، لیکن بن مانس (Ape) خواہ کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو وہ بولنا نہیں سیکھ سکتا، کیوں کہ وہ اس صلاحیت سے محروم کر دیا گیا ہے جسے 'نطق' کہتے ہیں۔

بنی نوعِ انسان کی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بولنے کی صلاحیت رکھنے کے باوصف انسان نے 'بولنا' بہت دیر سے سیکھا، اور تحریر کا فن تو اس نے اور بھی بعد میں سیکھا۔ بولنا دیر سے سیکھنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انسان پہلے متمدن (Civilized) نہ تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ اپنی تمدنی حالت کو پہنچتا گیا، بولنا سیکھتا گیا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ زبان ایک سماجی مظہر (Social phenomenon) ہے۔ یہ انسانی معاشرے ہی میں پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔ اگر کسی بچے کو اس کے پیدا ہوتے ہی انسانی ماحول سے الگ تھلگ کر دیا جائے جہاں کوئی بھی شخص اس سے بولتا یا بات نہ کرتا ہو تو وہ بچہ کھانا پینا، چلنا پھرنا، بھاگنا دوڑنا، سونا جاگنا سب کچھ سیکھ جائے گا، لیکن بولنا نہیں سیکھ سکے گا، کیوں کہ سماجی گروہ (Social group) سے اس کا رشتہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

(2)

لسانیاتی نقطۂ نظر سے 'تحریر' (Writing) زبان نہیں، یہ زبان (جس سے مراد Speech، یعنی 'تقریر' یا 'تکلم' ہے) کی ترجمان یا قائم مقام ہے۔ 'تحریر' کا ارتقا 'تقریر' (تکلمی زبان) کے ارتقا کے بہت بعد میں ہوا، یعنی انسان نے بولنا پہلے سیکھا اور لکھنا بعد میں۔ پھر جیسے جیسے انسان مہذب و متمدن ہوتا گیا اور انسانی تہذیب و ثقافت کو فروغ حاصل ہوتا گیا، تحریر کا فن بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔

فنِ تحریر کا ارتقا کب اور کہاں ہوا؟ اس ضمن میں محققین کا خیال ہے کہ لکھنے کی روایت تقریباً 3,000 (تین ہزار) سال قبلِ مسیح، سب سے پہلے بابل (Babylon) میں، جو میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) کا ایک قدیم شہر تھا، قائم ہوئی۔ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اسی شہر سے تھا، اور وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

تقریباً اسی زمانے میں مصر (Egypt) میں بھی آزادانہ طور پر تحریر کے ابتدائی نقوش پائے گئے۔ اس کے بعد چین (China) میں بھی لکھنے کا رواج ہوا۔ قدیم وادیِ سندھ کی تہذیب بھی رسم الخط کے ارتقا کے لیے جانی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے اور بھی کئی تہذیبی مراکز میں تحریر کی ابتدا ہوتی گئی۔ یہ بات انتہائی دلچسپ ہے کہ تحریر کا آغاز تصویروں کی شکل میں ہوا۔ ہر خیال کے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی تصویر بنائی جاتی تھی، اور اس کے لیے ایک لفظ مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ تحریر کی بالکل ابتدائی شکل تھی جسے 'لفظی خط' (Logogram) کہتے ہیں۔ اسی سے 'صوت رکنی خط' (Syllabary) کا ارتقا عمل میں آیا جس میں تحریری اکائی ایک 'صوت رکن' (Syllable) کی نمائندگی کرتی ہے۔ پھر مزید ترقی کرنے کے بعد یہی صوت رکنی خط، 'ابجدی خط' (Alphabet Writing) میں تبدیل ہوگیا۔ اس خط میں تحریری اکائی 'حرف' (Alphabet) یا Letter کی نمائندگی کرتی ہے۔ آج دنیا کی بیشتر زبانوں (بشمولِ اردو) کا رسم الخط ابجدی ہے۔

(3)

اردو میں فنِ تحریر کی تاریخ پر مواد کی بیحد کمی ہے۔ اس موضوع پر تحقیقی انداز میں باقاعدگی کے ساتھ سب سے پہلے محمد اسحٰق صدیقی نے لکھنا شروع کیا، اور کچھ چیزیں نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' میں شائع کرائیں، چنانچہ نیاز ہی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے انھیں اس موضوع سے مزید دلچسپی پیدا ہوئی اور تحقیق میں تیزی آئی۔ پھر چند برسوں کی محنت، لگن اور تگ و دو کے بعد انھوں نے 'فنِ تحریر کی تاریخ' کے نام سے ایک ضخیم کتاب تیار کی جو انجمن ترقیِ اردو (ہند)، علی گڑھ کی جانب سے پہلی بار 1962ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت انجمن کے جنرل سکریٹری آل احمد سرور تھے۔ انھوں نے اس کتاب کے مسودے کو بہت پسند کیا تھا اور اس کی طباعت و اشاعت میں کافی دلچسپی لی تھی۔ اس کتاب کا ''تعارف'' ممتاز نقاد سید احتشام حسین نے تحریر کیا تھا جس میں فنِ تحریر کی ایجاد کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے بعد انھوں نے لکھا:

> ''محمد اسحٰق صدیقی نے اسی انسانی ایجاد کی دلکش تاریخ لکھی ہے اور اس شرح و بسط اور دیدہ ریزی سے لکھی ہے کہ انجمن ترقیِ اردو اسے فخر کے ساتھ ہندوستانی زبانوں کے علمی خزانوں میں ایک اضافہ کی حیثیت سے پیش کرسکتی ہے۔ ایک عام پڑھے لکھے شخص کے لیے یہ ایک خشک مبحث ہے، لیکن ذرا سا بھی خیال انگیز اور متجسس ذہن رکھنے والا اس کتاب کو پڑھ کر خود کو ایک طلسمی دنیا میں پائے گا جہاں انسانی ذہن نے اظہارِ خیال کی کوششوں میں نہ جانے کس کس طرح آوازوں کو قید کرنے اور خیالات کو گرفت میں لانے کی جدوجہد کی ہے۔ اسحٰق صدیقی نے غیر معمولی محنت اور بصیرت سے اس داستان کے نقوش ابھارے ہیں اور ابتدا سے اس وقت تک تقریباً ہر قسم کی تحریری کوششوں کی تاریخ بیان کردی ہے۔ ان کے وسیع مطالعے، ذوق جستجو اور انتھک محنت نے ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب پیش کی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ علمی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے۔''

(4)

محمد اسحٰق صدیقی لکھنؤ کے رہنے والے تھے، لیکن ان کے حالاتِ زندگی تحریری شکل میں کہیں دستیاب نہیں۔ راقم السطور نے لکھنؤ کے اپنے دورانِ قیام میں یہاں کے مقتدر حضرات سے ان کے حالات معلوم کیے جن میں ان کے دوست عبدالسلام صدیقی خاص ہیں۔ انھیں سے روایت ہے کہ محمد اسحٰق صدیقی 15 اکتوبر 1929ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شفیع صدیقی تاجر پیشہ تھے۔ ان کا انتقال اسحٰق صدیقی کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ ان کی پرورش و پرداخت ان کے پھوپھا تصدق حسین نے کی جو پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ اسحٰق صدیقی نے 1945ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور آگے بھی تعلیمی سلسلہ جاری رکھا، لیکن گھریلو پریشانیوں اور مالی مشکلات کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ان کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ کم عمری ہی میں تلاشِ معاش کی فکر دامن گیر ہوئی، چنانچہ انھوں نے ہندوستان کی لائف انشورنس کمپنی (LIC) کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کی شادی لکھنؤ ہی کی عالیہ صدیقی سے ہوئی جن سے ان کی تین بیٹیاں تولد ہوئیں۔ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اسحٰق صدیقی لکھنؤ میں پہلے امین آباد میں واقع نعمت اللہ روڈ پر رہائش پذیر تھے، پھر علی گنج منتقل ہو گئے تھے۔ یہیں 25 مئی 2010ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اسحٰق صدیقی کو شروع سے ہی مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ان کی دلچسپی کی کتابیں ہر وقت ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ آگے چل کر علمی مشاغل سے بھی ان کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے دورانِ ملازمت مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے بے شمار دلچسپ اور معلوماتی مضامین لکھے جن کی تعداد سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ بچوں کے لیے بھی انھوں نے بے شمار مفید اور معلوماتی مضامین لکھے جو رسائل میں چھپنے کے علاوہ اردو کی درسی کتب میں بھی شامل کیے گئے۔ آل انڈیا ریڈیو (لکھنؤ) سے بھی ان کی تقریریں پابندی کے ساتھ نشر ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے کئی انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے جن میں سالم علی کی کتاب *The Book of Indian Birds* کا ترجمہ خاص ہے۔ اسحٰق صدیقی 1985ء میں میر

اکادمی (لکھنؤ) کے پروقار 'امتیازِ میر' ایوارڈ سے سرفراز ہوئے۔ علاوہ ازیں حکومتِ اتر پردیش نے انھیں 'فنِ تحریر کی تاریخ' پر 1962ء میں رام پرشاد بسمل ایوارڈ سے نوازا۔

(5)

'فنِ تحریر کی تاریخ' ایک طویل عرصے سے نایاب تھی، چنانچہ اردو کے جواں سال اسکالر اور محقق کلیم الٰہی امجد نے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کا بیڑا اٹھایا، لیکن اشاعت سے قبل اس کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے جس جگر سوزی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اس کتاب کے متن کو لفظ بہ لفظ پڑھا اور اکثر مقامات پر اس کی عبارت درست کی اور ضروری حواشی لکھے جن میں بعض شخصیات، ایجادات، اصطلاحات اور تاریخی واقعات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی گئیں۔ علاوہ ازیں کتاب کی ابواب بندی جدید طرز پر از سرِ نو کی گئی جن میں ہر باب اور ذیلی باب پر نمبر ڈالے گئے تا کہ حوالہ دینے میں آسانی ہو سکے۔ متن کی پیراگرافنگ بھی نئے طریقے سے سائنسی انداز پر کی گئی اور متن کی ضرورت کے مطابق سرخیاں اور ذیلی سرخیاں بھی قائم کی گئیں۔ اصل کتاب میں کچھ شکلیں (Figures) اور تصویریں بھی دی ہوئی تھیں جن میں بہتری لائی گئی۔ یہ سارے کام کلیم الٰہی امجد نے بڑی محنت اور جانفشانی سے انجام دیے، اور اس کتاب پر سیر حاصل مقدمہ بھی لکھا۔

'فنِ تحریر کی تاریخ' کا یہ نیا ایڈیشن اپنی مرتب شدہ شکل میں ایک نئے روپ میں سامنے آیا جو تمام تر کلیم الٰہی امجد کی تدوینی صلاحیتوں کا ثمرہ ہے۔ وہ لائقِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے یہ سارے کام بڑی دیدہ ریزی اور غیر معمولی محنت و کاوش اور حوصلہ مندی سے انجام دیے، اور ایک اعلیٰ پائے کی تصنیف کو معدوم ہونے سے بچا لیا۔

کتابیات

1- سحر، ابو محمد، 'اردو املا اور اس کی اصلاح' (بھوپال: مکتبۂ ادب، 1982ء)۔
2- صدیقی، محمد اسحٰق، 'فن تحریر کی تاریخ' (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو [ہند] 1962ء)۔
3- صدیقی، محمد اسحٰق، 'فن تحریر کی تاریخ' مرتبہ کلیم الٰہی امجد۔
4- Robinson, Andrew, *The Story of Writing* (Thames & Hudson, 1995).

●●●

نظریہ عروضی صوتیات

(A Phonetic and Phonological Study
of the Word in Urdu پر ایک نظر)

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں چیکوسلوواکیہ کے شہر پراگ میں Prague Linguistic Circle (= پراگ لسانیاتی حلقہ) کا قیام عمل میں آیا۔ اس حلقے سے تعلق رکھنے والے ماہرینِ لسانیات زبان وادب کے مطالعے میں ہیئتی لسانیاتی طریق کار کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس حلقے کے ایک معروف رکن این. ایس. تروبتز کوائے (N.S. Trubetzkoy) کی دلچسپی کا خاص میدان 'تجز صوتیات' (Phonology) تھا جو لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے۔ تروبتز کوائے نے اپنی کتاب *Principles of Phonology* (= تجز صوتیات کے اصول) میں 'عروض' (Prosody) کے تصور کو پیش کیا۔ اسی تصور کو بنیاد بنا کر لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے ماہرِ لسانیات جے. آر. فرتھ (J.R.Firth) نے 'نظریہ عروضی صوتیات' (Theory of Prosodic Phonology) پیش کیا۔ مسعود حسین خاں (1919-2010ء) لسانیات کی اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کی غرض سے جب 1950ء میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز (لندن) پہنچے تو جے. آر. فرتھ کے اسی نظریے پر اردو کے حوالے سے اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا جو دو سال بعد "A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu" کے نام سے فرانس میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس تحقیقی کام کے لیے مسعود

حسین خاں کو پیرس یونیورسٹی سے 1953ء میں لسانیات میں ڈی. لٹ (.D. Lit) کی ڈگری تفویض ہوئی۔

(2)

مسعود حسین خاں کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں پہلی بار 1954ء میں شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی جانب سے شائع ہوا۔ دوسری بار اسے کرپا شنکر سنگھ نے ہندی-اردو لسانیات پر اپنی مرتب کردہ کتاب *Readings in Hindi-Urdu Linguistics* میں شامل کر کے 1978ء میں دہلی سے شائع کیا۔ چونکہ یہ مقالہ انگریزی میں تھا، اس لیے اردو اہلِ علم کے ایک بڑے طبقے کو اس کتاب کی اہمیت اور علمی قدر و قیمت کا علم نہ ہو سکا تھا۔ اردو میں اس مقالے کے ترجمے کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی، نیز مسعود حسین صاحب کی بھی یہ خواہش تھی کہ یہ مقالہ اردو میں بھی شائع ہو جائے تو اچھا ہے، چنانچہ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اس مقالے کے اردو میں ترجمے کی سعادت راقم السطور کو حاصل ہوئی، اور یہ ترجمہ ''اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے 1986ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ جب میں نے مسعود حسین خاں کی خدمت میں اس کتاب کے ترجمے کا مسودہ پیش کیا تو انھیں بیحد خوشی ہوئی۔ انھوں نے اسے نہایت توجہ کے ساتھ ملاحظہ فرمایا، اور چند روز بعد جب انھوں نے مسودہ مجھے واپس بھیجا تو اس کے ساتھ ان کا ایک رقعہ بھی منسلک تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا:

> ''آپ نے ترجمہ بڑی محنت سے اور عمدہ کیا ہے۔ دراصل اس پمفلٹ کا ترجمہ آپ ہی کر سکتے تھے۔''

مسعود صاحب کے ان دو مختصر جملوں نے نہ صرف میرا حوصلہ بڑھایا، بلکہ مجھ میں خود اعتمادی بھی پیدا کی۔

(3)

مسعود حسین خاں کی یہ تصنیف اردو الفاظ کا 'صوتیاتی' (Phonetic) اور 'تجز صوتیاتی' (Phonological) مطالعہ و تجزیہ 'عروضی' (Prosodic) نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہے۔ اردو الفاظ کے اس قسم کے مطالعے اور تجزیے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ 'عروض' کو انگریزی کی صوتیاتی اصطلاح میں 'Prosody' کہتے ہیں۔ اس عروض کا شاعری کے علمِ عروض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ایک 'صوتیاتی قوس' ہے جو 'صوت رکن' (Syllable) یا جملے (Sentence) کے اوپر پھیلی ہوتی ہے۔

'عروضی صوتیات' (Prosodic phonology) دو قسم کے بنیادی عناصر پر مشتمل ہوتی ہے:

1- صوتیاتی اکائیاں (Phonetic units)

2- عروضیات (Prosodies)

صوتیاتی اکائیوں میں 'مصمتے' (Consonants) اور 'مصوتے' (Vowels) شامل ہوتے ہیں جنھیں 'قطعات' (Segments) بھی کہتے ہیں۔ یہ صوتیاتی اکائیاں یا قطعات سلسلہ وار ترتیب دیے جاتے ہیں۔

عروضیات میں صوتیاتی اکائیاں شامل نہیں ہوتیں اور نہ انھیں سلسلہ وار ترتیب دیا جاسکتا ہے، بلکہ ان کا تعلق چند صوتیاتی خصوصیات سے ہوتا ہے۔ عروضی خصوصیات (Prosodic features) دراصل وہ صوتیاتی خصوصیات ہیں جو صوتیاتی اکائیوں (مصمتوں اور مصوتوں) یا قطعات پر بہ صورتِ 'قوس' پھیلی ہوتی ہیں۔ صوتیاتی اکائیوں سے 'صوت رکن' (Syllable) اور 'لفظ' (Word) ترتیب پاتے ہیں جنھیں تجز صوتیاتی ساخت (Phonological structure) کہتے ہیں۔ کوئی بھی تجز صوتیاتی ساخت ایک یا ایک سے زائد عروضیات یا عروضی خصوصیات پر مشتمل ہوسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

کسی بھی نوع کی صوتیاتی خصوصیت جس کا تعلق باعتبارِ افقی ترتیب (Syntagmatically) ایک سے زیادہ صوتیاتی اکائی سے ہے، عروضی خصوصیت کی حامل ہوسکتی ہے۔ عروضی خصوصیات میں ان صوتیاتی خصوصیات کو بھی شامل کیا جاتا ہے جو مصمتی یا مصوتی صوتیوں (Phonemes) کا جزو سمجھی جاتی ہیں۔ معکوسیت یا مسموعیت اور غیر مسموعیت جو مصمتی صوتیے کی خصوصیت ہے، عروضی خصوصیت بھی قرار پاسکتی ہے۔ عروضی خصوصیت صوتیاتی مواد ہی سے تجرید کی جاتی ہے جو بہ اعتبارِ طول ایک سے زائد صوتیاتی اکائیوں پر پھیلی ہوتی ہے۔ عروض کا حلقۂ اثر صوت رکن کا کوئی جزو، صوت رکن یا لفظ بھی ہوسکتا ہے اور فقرہ یا جملہ بھی، مثلاً سُر لہر (Intonation) کا تعلق فقرے یا جملے کی عروضیات سے ہے۔ اسی طرح تان (Tone)، طول (Length) اور زور (Stress) کا تعلق صوت رکن کی عروضیات سے ہے۔

فرتھ کی عروضی خصوصیات کو امریکی اصطلاح میں 'فوق قطعاتی خصوصیات' (Suprasegmental features) کہا جاسکتا ہے۔ یہ خصوصیات صوتیوں کا درجہ رکھتی ہیں، جنھیں اجزا میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ان صوتیوں کے حدودِ اثر میں ایک سے زائد مصمتی اور مصوتی اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر زور، طول اور تان کو ہی فوق قطعاتی صوتیوں (Suprasegmental phonemes) میں شامل کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات سُر لہر کو بھی جو کئی صوت ارکان (Syllables) پر پھیلا ہوتا ہے، فوق قطعاتی صوتیے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ فوق قطعاتی صوتیے کی ایک اور قسم اتصال (Juncture) بھی ہے جس میں قطعاتی صوتیوں کا تسلسل تو وہی رہتا ہے لیکن الفاظ میں ان کی مختلف ترتیب اور اتصال سے معنی میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ عروضی خصوصیات اور فوق قطعاتی خصوصیات میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، لیکن چند امور میں اختلاف بھی ملتا ہے۔ مثلاً ہر فوق قطعاتی خصوصیت عروضی خصوصیت تو کہلا سکتی ہے، لیکن ہر عروضی خصوصیت کو فوق قطعاتی صوتیے کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ بہت سی عروضی خصوصیات فوق قطعاتی صوتیوں کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فوق قطعاتی صوتیوں کے مقابلے میں فرتھ کی عروضیات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔

(4)

زیرِ نظر تصنیف میں مسعود حسین خاں نے ''لفظ'' کی تعریف اور حد بندی کے بعد لفظ اور صوت رکن کی صوتیاتی اور تجز صوتیاتی ساخت کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اُردو لفظوں میں انفیت (Nasalization) اور معکوسیت (Retroflexion) کے مسائل سے بحث کی ہے۔ کمیت کی عروضیات (Posodies of quantity) اور مربوطیے کی عروضیات (Prosodies of juncture) سے متعلق مسعود صاحب کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ صوتی امتیاز (Prominence) پر بھی انھوں نے اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مربوطیے کی عروضیات کے ضمن میں مصوتی تسلسل (Vowel sequence)، بین مصوتی تداخل (Anaptyxis)، تشدید (Gemination)، ہائیت (Aspiration) اور مسموعیت اور غیر مسموعیت (Voicing and unvoicing) کی عروضیات سے بھی کافی تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ بحث کی ہے۔

جہاں تک کہ مصوتوں کی انفیت کا تعلق ہے، مسعود صاحب کے تجزیے کے مطابق اردو میں یہ ممیز (Distinctive) ہے۔ اس کی قواعدی اہمیت بھی ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے فعل کی شکلیں بہ لحاظِ تعداد متاثر ہوتی ہیں۔ بعض اوقات مصوتے کی انفیت قریب کی انفی آواز کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے جو غیر ممیز ہوتی ہے اور جسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

مصوتوں کی انفیت سے قطع نظر، مسعود حسین خاں نے اردو میں دو انفی مصمتے (Consonantal nasals) /ن/ اور /م/ متعین کیے ہیں جو تمام حالتوں (ابتدائی، درمیانی اور آخری) میں پائے جاتے ہیں، لیکن /ن/ جب غشائی (Velar)، حنکی (Palatal)، معکوسی (Retroflex)، دندانی (Dental) اور دولبی (Bilabial) آوازوں سے قبل واقع ہوتا ہے تو ہم مخرج (Homorganic) ہوجاتا ہے۔ اس کی صوتیاتی وجہ صاف ظاہر ہے۔ لیکن /ق/ کے ساتھ یہ ہم مخرج نہیں ہوتا۔ اسی طرح چند دیگر الفاظ میں بھی یہ غشائی اور دولبی آوازوں کے ساتھ ہم مخرج نہیں ہوتا۔

صوتی امتیاز سے متعلق مسعود صاحب نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی رو سے اردو میں یہ ممیّز نہیں ہے، تاہم ان کا خیال ہے کہ ایک سے زیادہ صوت ارکان پر مشتمل الفاظ میں کوئی صوت رکن ایسا ضرور ہوتا ہے جو اس لفظ کے باقی تمام صوت ارکان سے زیادہ صوتی امتیاز رکھتا ہے۔ اردو لفظوں میں پائی جانے والی اس عروضی خصوصیت کا مطالعہ اردو کے دو صوت رکنی، تین صوت رکنی اور کثیر صوت رکنی الفاظ کے حوالے سے کیا گیا ہے اور ہر ایک کے تحت صوتی امتیاز کے کئی اصول پیش کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں کو وضع کرنے میں مسعود صاحب نے کافی صوتیاتی بصیرت سے کام لیا ہے۔

اردو میں ہائیت سے متعلق بھی مسعود صاحب کے نظریات ٹھوس صوتیاتی اور تجزیہ صوتیاتی بنیادوں پر مبنی ہیں۔ ان کے نزدیک بندشی ہائیہ آوازیں (Plosive aspirates) ''واحد ممیّز آوازیں'' ہیں۔ ان آوازوں کا کسی اور طرح سے تجزیہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ نھ، مھ، لھ، رھ وغیرہ میں ہائیت کا جو عنصر شامل ہے وہ ان کے نزدیک ممیّز نہیں ہے۔ اس لیے ان آوازوں کو دوسری بندشی ہائیہ آوازوں کی طرح صوتیوں کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی ہائیت کو مسعود صاحب نے چند ٹھوس دلائل کی بنیاد پر عروضی خصوصیت قرار دیا ہے۔

الفاظ کے صوتیاتی مطالعے کا ایک اہم پہلو مصمتوں کے دُہرے پن یا ان کی تشدید کا مطالعہ بھی ہے۔ بہ استثنائے چند اردو کے تمام مصمتے بین مصوتی حالت میں مشدد واقع ہوتے ہیں۔ مشدد مصمتوں سے قبل واقع ہونے والے مصوتے بالعموم مختصر ہوتے ہیں۔ مسعود صاحب کا خیال ہے کہ تشدید برج بھاشا، اودھی اور فارسی کے زیرِ اثر اردو میں آئی ہے، لیکن ''یہ نہ تو اتنی شدید ہے اور نہ اتنی وسیع جتنی کہ پنجابی اور راجستھانی بولیوں میں پائی جاتی ہے۔''

انفیت، ہائیت اور تشدید کی طرح معکوسیت بھی اردو زبان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اردو کی چھے معکوسی آوازوں (تین غیر ہائیہ اور تین ہائیہ) کی الفاظ میں تقسیم اور ان کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے عروض کا مسعود صاحب نے نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔

مسموعیت اور غیر مسموعیت سے متعلق بھی مسعود صاحب نے اردو الفاظ کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ ان کے گہرے صوتیاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ صوتیاتی تسلسل میں واقع ہونے پر غیر

مسموع آواز مسموع آواز سے اور مسموع آواز غیر مسموع آواز سے کس طرح متاثر ہوتی ہے اور لہجے اور تکلم پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، یہ تمام باتیں مسعود صاحب نے نہایت علمی اور سائنسی انداز میں بیان کی ہیں۔ اسی طرح مسعود صاحب نے چند دیگر عروضی خصوصیات کا مطالعہ بھی نہایت ژرف بینی اور صوتیاتی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

(5)

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'عروض' کا تصور اگرچہ مسعود حسین خاں نے فرتھ سے لیا ہے، لیکن اردو کے تعلق سے اس نظریے میں انھوں نے جو جامعیت اور وسعت پیدا کی ہے وہ ان کا اپنا کارنامہ ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اردو لفظوں کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ اور اس اعلیٰ معیار کا تجزیہ آج تک کسی عالم نے پیش نہیں کیا۔ اردو زبان میں اس قسم کے علمی مطالعات کا جو فقدان پایا جاتا ہے وہ راقم السطور کے اس ترجمے سے کافی حد تک دور ہوگا، اور ایک علمی خزانہ جو کافی عرصے سے انگریزی زبان میں دفن تھا، اس سے اردو داں طبقے کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملے گا۔

زیرِ نظر ترجمے میں اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ تجزیے کے دوران مصنف نے جو الفاظ صوتیاتی رسم خط میں پیش کیے ہیں، انھیں اردو رسم خط میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ صوتیاتی رسم خط میں بھی پیش کیا جائے، کیوں کہ صوتیاتی اور تجز صوتیاتی تجزیے کے بہت سے نکات الفاظ کو صوتیاتی رسم خط میں پیش کرنے ہی پر واضح ہوتے ہیں۔ غالباً اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ صوتیاتی رسم خط کے لیے بین الاقوامی صوتیاتی حروف (International Phonetic Alphabet) کا استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمے کے دوران اس امر کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ لسانیات کی زیادہ تر وہی اصطلاحات استعمال کی جائیں جو اردو میں رائج ہو چکی ہیں۔ اس ضمن میں ترقیِ اردو بیورو (اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان)، نئی دہلی کی وضع کردہ لسانیاتی اصطلاحات سے بھی کافی مدد لی گئی ہے۔ ایسی تمام اصطلاحات کو ان کے انگریزی مترادفات کے ساتھ کتاب کے آخر میں جمع کر دیا گیا ہے۔

کتابیات

1- بیگ، مرزا خلیل احمد، 'اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ' (ترجمہ)، Original title: *A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu* by Masud Husain Khan (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1986ء)۔

2- تروبتز کوائے، این. ایس. *Principles of Phonology* (انگریزی ترجمہ، 1969ء)۔

3- حسنین، سید امتیاز، "Firthian Linguistics and Masud Husain Khan's *A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu*" مشمولہ 'مسعود حسین خاں: نقاد اور دانشور'، مرتبہ شاہد ماہلی (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، 2010ء)۔

4- مسعود حسین خاں، *A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu* (علی گڑھ: شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1954ء)۔

●●●

مصنف کی مطبوعہ کتابیں

تصانیف

1- 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات'، طبعِ اول (علی گڑھ، 1983ء)۔
- طبعِ دوم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2011ء)۔

2- 'اردو کی لسانی تشکیل'، طبعِ اول (علی گڑھ، 1985ء)۔
- طبعِ دوم (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1990ء)۔
- طبعِ سوم (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2000ء)۔
- طبعِ چہارم (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2008ء)۔

3- 'آیئے اردو سیکھیں'، طبعِ اول (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1987ء)۔

4- *Urdu Grammar : History and Structure*. First edition (New Delhi: Bahri Publications, 1988).

5- 'پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی'، طبعِ اول (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، 1989ء)۔

6- 'تاریخِ جامعۂ اردو' (بہ اشتراک)، طبعِ اول (علی گڑھ: جامعۂ اردو، 1990ء)۔

7- *Psycholinguistics and Language Acquisition*. First edition (New Delhi: Bahri Publications, 1991).

8- *Sociolinguistic Perspectives of Hindi and Urdu in India*. First edition (New Delhi: Bahri Publications, 1996).

9- 'لسانی تناظر'، طبعِ اول (نئی دہلی: باہری پبلی کیشنز، 1997ء)۔

10- 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید'، طبعِ اول (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2005ء)۔

11- 'ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی'، طبعِ اول (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2007ء)

12- 'ادبی تنقید کے لسانی مضمرات'، طبعِ اول (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2012ء)۔

13- 'اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے'، طبع اول (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2014ء)۔

14- 'مسعود حسین خاں: احوال و آثار'، طبع اول (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2015ء)۔

- طبع دوم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2018ء)

15- 'لسانی مسائل و مباحث'، طبع اول (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2016ء)۔

- طبع دوم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2017ء)۔

مرتب شدہ نگارشات

1- 'اردو کا المیہ' (ہفت روزہ 'ہماری زبان' میں مسعود حسین خاں کے تحریر کردہ اداریے اور انشائیے)، طبع اول (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1973ء)۔

2- 'نذرِ مسعود' (مجموعۂ نگارشات جو پروفیسر مسعود حسین خاں کی خدمت میں ان کی ۷۰ ویں سالگرہ پر پیش کیا گیا)، طبع اول (علی گڑھ: تعلیمی مرکز، 1989ء)۔

3- 'مرقعِ جامعۂ اردو' (بہ یادگار جشنِ زریں)، طبع اول (علی گڑھ: جامعۂ اردو، 1991ء)۔

4- 'اردو زبان کی تاریخ'، طبع اول (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1995ء)۔

- طبع دوم (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2000ء)۔

5- 'پریم چند: شخصیت اور فن'، طبع اول (علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، جامعۂ اردو، 1997ء)۔

6- 'مکاتیبِ مسعود'، (پروفیسر مسعود حسین خاں کے خطوط پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے نام)، طبع اول (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2017ء)۔

7- 'لسانیاتی اسلوبیات'، طبع اول (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2019ء)۔

ترجمہ

1- 'اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ'، طبع اول (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1986ء)۔

Original Title: *A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu* (1954) by Masud Husain Khan.

LISANI TANAZUR

by

Prof. Mirza Khalil Ahmad Beg
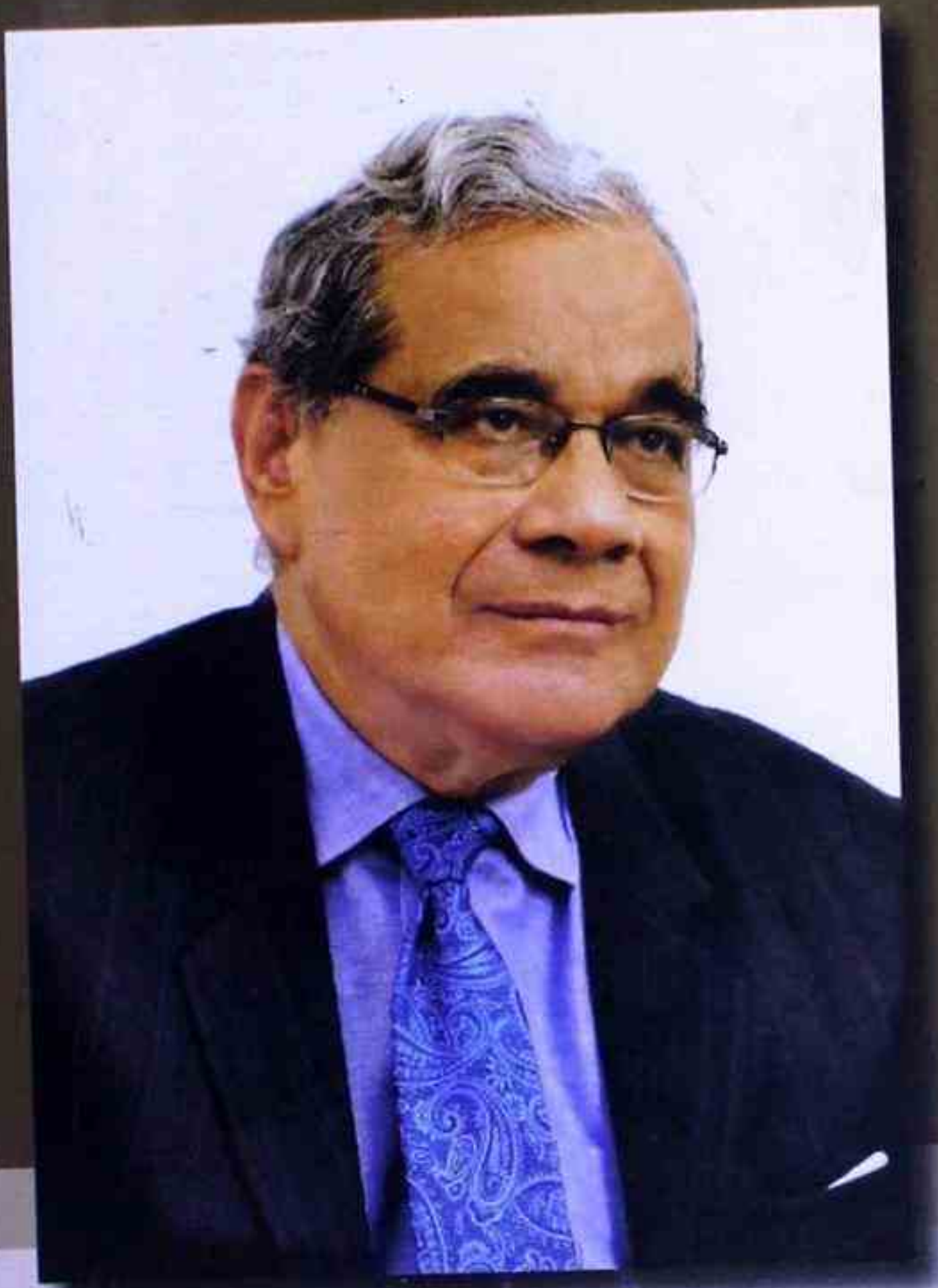
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi . INDIA